ضربِ کلیم

(علامہ اقبال)

مع شرح

مؤلفہ

(پروفیسر) یوسف سلیم چشتی

ناشر

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۵۶۱ء سوئیوالان نئی دہلی ۲

باهتمام اعتقاد حسین صدیقی

پہلی بار	مئی سنہ ۱۹۹۱ء
مرتبہ	اعتقاد حسین صدیقی
تعداد	پانچ سو
کتابت	محمد زبیر مبارکپوری
قیمت	ساٹھ روپے

ہماری اقبالیات پر فارسی کلام کی شرح
بہت جلد آفسیٹ پر چھپ کر آنیوالی ہیں

			قیمت
مثنوی پس چہ باید کرد۔	مع شرح	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۱۵۰/-
پیام مشرق	〃	〃 〃	۱۲۵/-
جاوید نامہ	〃	دو جلدیں 〃 〃	۱۷۵/-
اسرار خودی	〃	〃 〃	۹۰/-
رموز بے خودی	〃	〃 〃	۵۰/-

(مطبوعہ لاہوتی فائن آرٹ پریس دہلی)

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	مقدمہ	۹
۲	ضرب کلیم	۱۰
۳	اعلیحضرت نواب سر حمید اللہ	۲۱
۴	ناظرین سے	۲۴
۵	تمہید	۳۱
۶	صبح	۳۷
۷	لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ	۳۹
۸	تن بہ تقدیر	۵۱
۹	معراج	۵۳
۱۰	ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام	۵۵
۱۱	زمین و آسمان	۶۲
۱۲	مسلمان کا زوال	۶۳
۱۳	علم و عشق	۶۹
۱۴	اجتہاد	۷۶
۱۵	شکر و شکایت	۷۸
۱۶	ذکر و فکر	۸۰
۱۷	ملّائے حرم	۸۳
۱۸	تقدیر	۸۴
۱۹	توحید	۸۷
۲۰	علم اور دین	۹۱
۲۱	ہندی مسلمان	۹۳
۲۲	آزادیٔ شمشیر کے اعلان پر	۹۶
۲۳	جہاد	۹۸
۲۴	قوت اور دین	۱۰۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۵	فقر و ملوکیت	۱۰۴
۲۶	اسلام	۱۰۶
۲۷	حیات ابدی	۱۱۰
۲۸	سلطانی	۱۱۲
۲۹	صوفی سے	۱۱۶
۳۰	افرنگ زدہ	۱۱۸
۳۱	تصوّف	۱۲۳
۳۲	ہندی اسلام	۱۳۱
۳۳	غزل	۱۳۴
۳۴	دنیا	۱۳۶
۳۵	نماز	۱۳۹
۳۶	وحی	۱۴۰
۳۷	شکست	۱۴۳
۳۸	عقل و دل	۱۴۵
۳۹	مستی کردار	۱۴۶
۴۰	قبر	۱۴۸
۴۱	قلندر کی پہچان	۱۴۹
۴۲	فلسفہ	۱۵۳
۴۳	مردانِ خدا	۱۵۶
۴۴	کافر و مومن	۱۵۸
۴۵	مہدیٔ برحق	۱۶۱
۴۶	مومن	۱۶۳
۴۷	محمد علی باب	۱۶۶
۴۸	تقدیر	۱۶۹
۴۹	اے روحِ محمدؐ	۱۷۳
۵۰	مدنیتِ اسلام	۱۷۵
۵۱	امامت	۱۸۰
۵۲	فقر و راہبی	۱۸۳
۵۳	غزل	۱۹۰
۵۴	تسلیم و رضا	۱۹۲
۵۵	نکتۂ توحید	۱۹۴
۵۶	الہام اور آزادی	۱۹۶
۵۷	جان و تن	۱۹۸
۵۸	لاہور و کراچی	۲۰۰
۵۹	نبوّت	۲۰۷
۶۰	آدم	۲۱۰

نمبر	مضمون	صفحہ
۶۱	مکہ اور جنیوا	۲۱۵
۶۲	اے پیرِ حرم	۲۱۸
۶۳	مہدی	۲۲۰
۶۴	مردِ مسلمان	۲۲۳
۶۵	پنجابی مسلمان	۲۲۷
۶۶	آزادی	۲۲۹
۶۷	اشاعتِ اسلام فرنگستان میں	۲۳۱
۶۸	لَا اِلٰہَ اِلَّا	۲۳۲
۶۹	امرائے عرب سے	۲۳۴
۷۰	احکامِ الٰہی	۲۳۶
۷۱	موت	۲۳۹
۷۲	قم باذن اللہ	۲۴۱
	تعلیم و تربیت	
۷۳	مقصود	۲۴۵
۷۴	زمانہ حاضر کا انسان	۲۴۹
۷۵	اقوامِ مشرق	۲۵۱
۷۶	آگاہی	۲۵۲
۷۷	مصلحینِ مشرق	۲۵۳
۷۸	مغربی تہذیب	۲۵۴
۷۹	اسرارِ پیدا	۲۵۵
۸۰	سلطان ٹیپو کی وصیت	۲۵۸
۸۱	غزل	۲۶۲
۸۲	بیداری	۲۶۵
۸۳	خودی کی تربیت	۲۶۸
۸۴	آزادیٔ فکر	۲۷۰
۸۵	خودی کی زندگی	۲۷۱
۸۶	حکومت	۲۷۳
۸۷	ہندی مکتب	۲۷۹
۸۸	تربیت	۲۸۳
۸۹	خوب و زشت	۲۸۵
۹۰	مرگِ خودی	۲۸۷
۹۱	مہمانِ عزیز	۲۸۹
۹۲	عصرِ حاضر	۲۹۰
۹۳	طالب علم	۲۹۵
۹۴	امتحان	۲۹۷
۹۵	مدرسہ	۲۹۹

نمبر	مضمون	صفحہ
۹۶	حکیم نطشہ	۳۰۴
۹۷	اساتذہ	۳۰۶
۹۸	غزل	۳۰۷
۹۹	دین و تعلیم	۳۱۰
۱۰۰	جاوید سے	۳۱۲
	عورت	
۱۰۱	مردِ فرنگ	۳۲۴
۱۰۲	ایک سوال	۳۲۷
۱۰۳	پردہ	۳۲۸
۱۰۴	خلوت	۳۲۹
۱۰۵	عورت	۳۳۱
۱۰۶	آزادیٔ نسواں	۳۳۴
۱۰۷	عورت کی حفاظت	۳۳۵
۱۰۸	عورت اور تعلیم	۳۳۷
۱۰۹	عورت	۳۳۹
	ادبیات فنونِ لطیفہ	
۱۱۰	دین و ہنر	۳۴۱
۱۱۱	تخلیق	۳۴۵
۱۱۲	جنوں	۳۴۸
۱۱۳	اپنے شعر سے	۳۵۰
۱۱۴	پیرس کی مسجد	۳۵۲
۱۱۵	ادبیات	۳۵۳
۱۱۶	نگاہ	۳۵۴
۱۱۷	مسجد قوت الاسلام	۳۵۶
۱۱۸	تیاتر	۳۵۸
۱۱۹	شعاعِ امید	۳۶۰
۱۲۰	امید	۳۶۴
۱۲۱	نگاہِ شوق	۳۷۰
۱۲۲	اہلِ ہنر سے	۳۷۳
۱۲۳	غزل	۳۷۶
۱۲۴	وجود	۳۷۹
۱۲۵	سرود	۳۸۱
۱۲۶	نسیم و شبنم	۳۸۳
۱۲۷	اہرامِ مصر	۳۸۶
۱۲۸	مخلوقاتِ ہنر	۳۸۷
۱۲۹	اقبال	۳۸۹

شمار	مضمون	صفحہ
۱۳۰	فنونِ لطیفہ	۳۹۲
۱۳۱	صبحِ چمن	۳۹۵
۱۳۲	خاقانی	۳۹۷
۱۳۳	رومی	۴۰۰
۱۳۴	جدّت	۴۰۲
۱۳۵	مرزا بیدل	۴۰۴
۱۳۶	جلال و جمال	۴۰۷
۱۳۷	مصوّر	۴۱۰
۱۳۸	سرودِ جلال	۴۱۲
۱۳۹	سرودِ حرام	۴۱۵
۱۴۰	فوّارہ	۴۱۶
۱۴۱	شاعر	۴۱۷
۱۴۲	شعرِ عجم	۴۱۹
۱۴۳	ہنرورانِ ہند	۴۲۱
۱۴۴	مردِ بزرگ	۴۲۴
۱۴۵	عالمِ نو	۴۲۷
۱۴۶	ایجادِ معانی	۴۳۰
۱۴۷	موسیقی	۴۳۲
۱۴۸	ذوقِ نظر	۴۳۳
۱۴۹	شعر	۴۳۵
۱۵۰	رقص و موسیقی	۴۳۶
۱۵۱	ضبط	۴۳۷
۱۵۲	رقص	۴۳۹
	سیاسیات مشرق و مغرب	
۱۵۳	اشتراکیت	۴۴۴
۱۵۴	کارل مارکس کی آواز	۴۵۰
۱۵۵	انقلاب	۴۵۲
۱۵۶	خوشامد	۴۵۴
۱۵۷	مناسب	۴۵۶
۱۵۸	یورپ اور یہود	۴۵۸
۱۵۹	نفسیاتِ غلامی	۴۵۹
۱۶۰	بلشویک روس	۴۶۰
۱۶۱	آج اور کل	۴۶۱
۱۶۲	مشرق	۴۶۲
۱۶۳	سیاسیاتِ افرنگ	۴۶۵
۱۶۴	خواجگی	۴۶۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۶۵	غلاموں کے لئے	۴۶۸
۱۶۶	اہلِ مصر سے	۴۷۰
۱۶۷	ابی سینیا	۴۷۲
۱۶۸	ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام	۴۷۵
۱۶۹	جمعیتِ اقوام اور مشرق	۴۸۰
۱۷۰	سلطانی جادید	۴۸۱
۱۷۱	جمہوریت	۴۸۳
۱۷۲	یورپ اور سوریا	۴۹۶
۱۷۳	مسولینی	۴۹۷
۱۷۴	گلہ	۴۹۰
۱۷۵	انتداب	۴۹۳
۱۷۶	لادین سیاست	۴۹۵
۱۷۷	دامِ تہذیب	۴۹۷
۱۷۸	نصیحت	۴۹۹
۱۷۹	ایک بحری قزاق اور سکندر	۵۰۱
۱۸۰	جمعیتِ اقوام	۵۰۳
۱۸۱	شام و فلسطین	۵۰۶
۱۸۲	سیاسی پیشوا	۵۰۷
۱۸۳	نفسیاتِ غلامی	۵۱۳
۱۸۴	غلاموں کی نماز	۵۱۵
۱۸۵	فلسطینی عرب	۵۱۷
۱۸۶	مشرق و مغرب	۵۲۰
۱۸۷	نفسیاتِ حاکمی	۵۲۲
۱۸۸	محرابِ گل افغان کے افکار	
۱۸۹	محرابِ گل افغان کے افکار	۵۲۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

علامہ کے قلم سے اردو میں چار کتابیں شائع ہوئیں جن کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔ (۱) بانگ درا۔ (۲) بال جبریل (۳) ضرب کلیم اور ارمغان حجاز حصہ اردو۔

بانگ درا میں ابتدائی زمانہ کا کلام شامل ہے۔ زیادہ تر آسان نظمیں اور غزلیں ہیں لیکن بعض نظمیں بہت اعلیٰ پایہ کی ہیں۔ مثلاً خضر راہ۔ اور طلوع اسلام اور شمع اور شاعر وغیرہ۔

بال جبریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی اور تمام نقادانِ فن کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس میں شعریت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ فلسفہ نسبتاً بہت کم ہے اور غزلوں میں بڑی روانی اور دلکشی ہے۔

ضرب کلیم ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی اس میں شعریت یا تغزل کم ہے اور فلسفہ زیادہ ہے۔ بعض نظمیں اس مجموعہ میں اس قدر بلند پایہ ہیں کہ ان کی سرحد الہام سے ملی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مختصر طور پر یوں سمجھ سکتے ہیں۔ کہ ضرب کلیم چونکہ بہت پختہ عمر کا کلام ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر اس میں خیالات

کی گہرائی اور سنجیدگی نظر آتی ہے اور اس اعتبار سے کہ اس کتاب میں علامہ نے دنیا کے تمام مسائل پر اسلامی زاویۂ نگاہ سے تنقید کی ہے۔ کم از کم اردو یا فارسی میں تو کوئی کتاب اس کے پایہ کی نہیں ہے۔

ضربِ کلیم

یعنی

اعلانِ جنگ، دورِ حاضر کے خلاف

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

اقبال

ضربِ کلیم۔ بقول علامہ مرحوم دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب پر اتنے مختصر لفظوں میں اس سے بہتر تبصرہ ممکن نہیں ہے جس کو شک ہو اسے لازم ہے کہ کتاب کا اول سے آخر تک مطالعہ کرے۔ یقیناً اس تبصرہ کی صداقت آشکارا ہو جائے گی۔

دورِ حاضر۔ علامہ کی خاص اصطلاح ہے اس کے لفظی معنی تو بالکل واضح ہے یعنی موجودہ زمانہ یا وہ دَور جو ہمارے سامنے ہے یا بیسویں صدی لیکن اس سے مراد ہے وہ الحاد۔ تشکیک اور بے دینی جو۔ تہذیبِ مغرب، کا ثمر نو رس ہے جس نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کر دیا ہے جس کی وجہ سے مسلمان۔ اسلام اور قرآن دونوں سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ تہذیبِ مغرب۔ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ خدا پرستی کی جگہ بت پرستی کو فروغ ہو رہا ہے۔ اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

خود علامہ نے ایک جگہ صاف لفظوں میں بیان کیا ہے۔

دورِ حاضر بت فروش و بت گر است

علامہ نے اس مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے۔ تہذیبِ مغرب، تہذیبِ حاضر اور عصرِ حاضر کی اصطلاحیں بھی استعمال کی ہیں چنانچہ بالِ جبریل میں لکھتے ہیں۔

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلّا

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

علامہ ارمغان حجاز میں لکھتے ہیں۔

ولیکن الاماں از عصرِ حاضر
کہ شیطانی بسلطانی بہم کرد

خود ضرب کلیم میں صہ ۸۱ پر علامہ نے عصر حاضر کے عنوان سے تین شعر لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے دور حاضر کی اصطلاح کا مفہوم اور بھی واضح ہو سکتا ہے۔

الغرض، دور حاضر، سے اقبال کی مراد الحاد اور بے دینی کا موجودہ دور ہے جس میں قدم قدم پر نئے نئے بت نظر آتے ہیں اور دنیا ان بتوں کی پرستش کر رہی ہے۔

اس کتاب کا، ضرب کلیم، نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ علامہ مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کتاب میں جو اشعار ہیں یا بالفاظ صحیح تر ان اشعار میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ وہ عصر حاضر کے بتوں کو پاش پاش کرنے میں ضرب کلیم کا اثر رکھتے ہیں اور علامہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ان خیالات پر عامل ہو کر اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس کی بدولت وہ دور حاضر کے بتوں کو پاش پاش کر سکیں۔

اقبال نے ابتدائی زمانہ میں وطنیت کے خلاف ایک نظم لکھی تھی اور اس میں مسلمانوں سے اس طرح خطاب کیا تھا۔

نظّارۂ دیرینہ زمانہ کو دکھا دے
اے مصطفویؐ! خاک میں اس بت کو ملا دے

اس وقت انہوں نے صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کیا تھا کہ اے مسلمان! اس بت کو توڑ دے لیکن اس کتاب میں انہوں نے پوری تفصیل کے ساتھ بت شکنی کا طریقہ بتایا ہے اور اس کا خلاصہ ان دو شعروں میں بیان کر دیا ہے جو ٹائیٹل پیج پر مرقوم ہیں ان اشعار کا سلیس مطلب یہ ہے۔

مسلمان کی طبیعت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ جامد پتھر کی طرح کسی ایک جگہ یا مقام کی پابند نہیں ہو سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمان قید وطن سے آزاد ہے۔

ع مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

لہٰذا مسلمانوں کو غیر قوموں کی طرح کسی خاص ملک سے ایسی وابستگی پیدا کرنی نہیں چاہئے کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس کے غلام ہو کر رہ جائیں اور کسی وقت بھی وہاں سے ہجرت نہ کر سکیں۔ بلکہ اپنے اندر نسیم کی طرح سیر و سفر یا نقل مکانی کی خواہش پیدا کرنی چاہئے۔ کیونکہ ان کا فرض منصبی ساری دنیا کو اسلام کا پیغام سنانا ہے اسی لئے اقبال یہ کہتے ہیں۔

ع رہ بحر میں آزادِ وطن۔ صورتِ ماہی

مسلمان کی زندگی کا مقصد تو اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور مثلاً اگر مصر میں یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تو اپنے ہم خیالوں اور دوستوں کو ساتھ لے کر شام کی طرف چلے جاؤ۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا۔

راستہ میں صعوبات بھی درپیش ہوں گی اور ممکن ہے پانی بھی نہ ملے پس

اگر مردِ مومن خودی میں ڈوب کر اپنی خداداد مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لے آئے تو اس کے اندر وہ رنگ کلیمی پیدا ہو جائے گا کہ وہ راستہ میں جس پتھر پر اپنا عصا مارے گا اس سے ایک نہیں بلکہ ہزاروں چشمے پھوٹ نکلیں گے۔ یہ مطلب ہے ان دو شعروں کا۔

اقبال کا کمالِ فن یہ ہے کہ ان کے یہاں تفصیل بھی ہے اور اجمال بھی ہے یعنی جس بات کو پوری کتاب میں کہتے ہیں اسی کو وہ دو شعروں میں بیان کر دیتے ہیں اور میری رائے میں انہوں نے یہ فن قرآن حکیم کی روح سے شدید ارتباط کی بدولت سیکھا۔

یہ ساری کتاب دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ ہے انہوں نے مسلمانوں کو دورِ حاضر سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب دی ہے اور کامیابی اور فتح مندی کا طریقہ بھی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے اور اس کو ایک مصرع میں بیان کر دیا ہے کہ بت شکنی کے لئے ضربِ کلیمی کی ضرورت ہے اور یہ طاقت خودی میں ڈوبنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ "خودی میں ڈوبنے" کا مفہوم کیا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ یہ شرح کالج کے طلبہ کے لئے لکھ رہا ہوں لیکن سوال کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کا جواب دیئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

اس معرکۃ الآرا شعر کو پھر پڑھ لیا جائے تو مناسب ہوگا۔

ہزار چشمے ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

۱ ۔ کیا خودی کوئی دریا یا سمندر ہے۔ ؟
۲ ۔ کیا اس دریا میں ڈوب سکتے ہیں۔؟
۳ ۔ کیا یہ ڈوبنا حقیقی ہے یا مجازی۔ ؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اقبالؔ نے خودی کو واقعی بحر سے تشبیہ دی ہے ان کی نظر میں۔ خودی، بہت بڑی چیز ہے۔ حتیٰ کہ

ع خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

بال جبریل میں لکھتے ہیں۔

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آ بجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

دوسرے سوال کا جواب بھی اثبات میں ہے۔

خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ "ڈوبنا" حقیقی نہیں مجازی ہے۔ اقبالؔ نے خودی کو بحر سے تشبیہ دی ہے اور وجہ شبہ دونوں میں یکساں ہے یعنی وسعتِ بے پایاں۔

اقبالؔ نے یہ بھی لکھا ہے کہ بحرِ خودی میں ڈوب کر پھر اُبھر سکتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

لیکن یہ خودی یا من میں ڈوبنا مجاز ہے حقیقت نہیں ہے۔ ڈوبنے سے مراد ہے۔

۱۔ مطالعۂ باطنی (UHTROSPECTION)

ب۔ مراقبہ (MEDITATION)

ج۔ گیان دھیان (GON TEMPLATION)

د۔ معرفت نفس حاصل کرنا (SELF KNOWLEDGE)

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے گویا اپنے رب کو پہچان لیا۔

۴۔ نفس ناطقہ یا روح یا خودی کی مخفی قوتوں کو دریافت کرنا پھر ان کی صحیح خطوط پر تربیت کرنا اور ان قوتوں کو درجۂ کمال تک پہنچانا۔

یہی ہے دراصل خودی میں ڈوبنے کا حقیقی مفہوم۔ اب ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اقبالؔ نے یہ تو کہہ دیا کہ خودی میں ڈوب جاؤ۔ لیکن اس ڈوبنے کا طریقہ نہیں بتایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں نے علامہ کے کلام کا غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ انہوں نے جاوید نامہ اور مثنوی پس چہ باید کرد۔ میں اس سوال کا جواب بھی دیدیا ہے۔ چنانچہ جاوید نامہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

گر نیابی صحبتِ مردِ خبیر — از اَب و جَد آنچہ من دارم بگیر
پیرِ رومی رارفیقِ راہ ساز — تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

یعنی خودی میں ڈوبنے کا طریقہ کسی "مرد خبیر" سے سیکھو اور اگر کسی مرد خبیر کی یعنی مرشد کامل کی صحبت میسر نہ آسکے تو پھر میرا مشورہ یہ ہے کہ مثنوی مولانا روم کا مطالعہ کرو۔

مثنوی "پس چہ باید کرد" میں تو انہوں نے اس مسئلہ کو بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ صرف ایک شعر لکھتا ہوں۔

اے سرت گردم گریزِ انہ ما چو تیر
صحبتِ او گیر دے تا با نہ گیر

یعنی اے مخاطب! میں تیرے واری جاؤں تو ہم جیسے ناقص کتابی علم رکھنے والوں سے کنارہ کش ہو کر کسی مرشد کامل کا دامن تھام لے اور بڑی مضبوطی سے تھام لے۔ کیونکہ

صحبت از علمِ کتابی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است

بزرگوں کی صحبت علمِ کتابی سے بدرجہا زیادہ نافع ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان صرف مردانِ حُر (اہل اللہ) کی صحبت کی بدولت انسان بن سکتا ہے

واضح ہو کہ خودی میں ڈوبنا ایک فن ہے اور جتنے فنون ہیں ان سب کے حصول کا طریقہ ایک ہی ہے یعنی صحبتِ اہل فن۔

محض طب کی کتابوں کے مطالعہ سے کوئی طبیب نہیں بن سکتا موسیقی کی کتابوں سے گانا نہیں آسکتا جب تک استاد رہنمائی نہ کرے کوئی شخص خوشنویس نہیں بن سکتا محض کتاب میں ترکیب پڑھ لینے سے کوئی شخص زردہ یا پلاؤ دم

نہیں کرسکتا۔ غرض دنیا کا کوئی فن ایسا نہیں ہے جو استاد کی رہنمائی اور اس کی صحبت کے بغیر آسکے تو خودی میں ڈوبنا کسی ماہرِ فن کی صحبت کے بغیر کیسے آسکتا ہے؟

اسلامی دنیا میں جس قدر نامور برگزیدہ رگ گذرے ہیں یعنی ایسے لوگ جنہوں نے اپنے من میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پایا ہے مثلاً حضرت صدیق اکبرؓ مولانا رومیؒ حضرت خواجہ اجمیریؒ۔ خواجہ بہاؤ الدین ملتانی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ۔ حضرت سید احمد صاحب رائے بریلویؒ۔ حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ۔ حضرت مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ۔ حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ۔ حضرت مرشدی حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی۔ حضرت مرشدی شیخ الہندؒ حضرت حکیم الامت مجدد تھانویؒ کثر اللہ تعالیٰ امثالہم۔ ان سبھوں نے اپنے اپنے مرشدوں کی صحبت میں رہ کر یہ فن سیکھا۔ اور ان بزرگوں کو جو یہ مرتبہ حاصل ہوا تو محض صحبت مرشد کی بدولت۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا رومیؒ یہ فرماتے ہیں۔

یک زمانے صحبتے با اولیاء

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریاء

میں نے اس سوال کا جواب جو اس قدر وضاحت کے ساتھ لکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ جہالت میں مسلمانوں میں جو بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ صحبتِ مرشد کی اہمیت اور ضرورت سے ناآشنا ہوگئے ہیں چنانچہ ہمارے زمانہ میں بعض مسلمان محض کتابی علم کی بنا پر رہبری۔ ہدایت بلکہ تجدید و اجتہاد تک کے لئے کمر [illegible] ہیں اس قدر جرأت اسی ہوتی ہے کہ جو لوگ خود اپنے نفس کی اصلاح

کے محتاج ہیں وہ دوسروں کی اصلاح کر رہے ہیں اور بیعت لے کر صالحین کی جماعت تیار کر رہے ہیں۔

اہل اللہ کی صحبت کی حاجت۔ ضرورت اور اہمیت کی سب سے بڑی دلیل صحابیت ہے یعنی صحابہ کرامؓ میں بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو حضرت صدیق اکبرؓ کے مقابلہ میں بہت ادنیٰ درجہ رکھتے ہیں لیکن ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی بھی تمام دنیائے اسلام کے اعلیٰ سے اعلیٰ محدثین اور فقہا بلکہ اماموں اور اولیاء کرام اور بڑے سے بڑے اقطاب سے زیادہ معزز اور محترم ہے۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ صحابہؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہے۔ اسی لئے حضرت مجدد تھانویؒ فرماتے ہیں۔

"بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل و مکمل ہوا ہے؟ ارے بھائی! موٹی سی بات ہے کہ بلا پڑھی کے پاس بیٹھے کوئی شخص پڑھی نہیں بن سکتا۔ حتیٰ کہ بسولا بھی بطور خود ہاتھ میں لے کر اٹھائے گا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اٹھایا جا سکے گا۔ بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی پکڑنے کا طریقہ نہیں آتا خوش نویس کے پاس بیٹھے اور بلا قلم کی گرفت اور کشش دیکھے کوئی شخص خوشنویس نہیں ہو سکتا۔ غرض بدون کامل کی صحبت کے کوئی کامل نہیں بن سکتا لہٰذا پیر کامل کی صحبت لازم ہے۔" (تجدید تصوف و سلوک ص۲)

باز آمدم بر سر مطلب۔ اقبالؔ نے اس شعر میں مسلمانوں کو اپنے اندر ضربِ کلیم پیدا کرنے کی ترکیب بتادی ہے۔

ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

اب یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ اس کتاب کے مطالب پر غور کر کے مصنف مرحوم کے منشأ اور آرزو کی تکمیل کریں یا اس کی غزلوی کو قوّالی اور ریڈیو کے رنگا رنگ پروگراموں کے لئے استعمال کریں۔

من انچہ شرط بلاغ است باتو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

آئندہ کا علم تو اللہ ہی کو ہے لیکن گذشتہ چودہ سال سے جو سلوک کلامِ اقبال کے ساتھ کیا جا رہا ہے اس کو دیکھ کر تو مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک قوم نے اقبال کو سمجھا ہی نہیں اور اقبال کو تو اپنی زندگی ہی میں اس تلخ حقیقت کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ ارمغانِ حجاز میں سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم سے یوں فریاد کرتے ہیں۔

من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

یعنی اے میرے اور ساری کائنات کے آقا! میں آپ کی خدمت میں یہ فریاد لے کر حاضر ہوا ہوں کہ میں نے تو اپنی قوم کو آپ کا پیغام سنایا لیکن اس نے مجھے محض ایک شاعر سمجھا۔

(٭)

اعلیحضرت نواب سر حمید اللہ خاں فرمانروائے بھوپال
کی خدمت میں

زمانہ با اُمم ایشیا چہ کرد و کند
کسے نہ بود کہ ایں داستاں فرو خواند
تو صاحبِ نظری آنچہ در ضمیرِ من است
دلِ تو بیند و اندیشۂ تو مے داند
بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

(٭)

علامہ اقبالؔ نے یہ کتاب نواب صاحب بھوپال کے نام پر معنون کی تھی اور ان کی ذات سے کچھ توقعات بھی وابستہ کی تھیں جن کا اظہار انہوں نے ان فارسی اشعار میں کیا ہے جو زیبِ عنوان ہیں۔

میں نے اس انتساب کی علت پر بارہا غور کیا لیکن اس کے علاوہ اور

کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ مرحوم فطرتاً بہت احسان شناس واقع ہوئے تھے چنانچہ مجھے ان کی خدمت میں ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک حاضری کا موقع ملا اور میں ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ان کے ساتھ کوئی سلوک کرتا تھا تو وہ ہمیشہ اس کا تذکرہ شکر گذاری اور ممنونیت کے رنگ میں کیا کرتے تھے چونکہ نواب صاحب بھوپال نے ان کی آخری علالت میں ان کے ساتھ بہت حسن سلوک روا رکھا تھا اور علمی وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا اس لئے انہوں نے اس کا بدل اس رنگ میں کیا کہ ضربِ کلیم کے ساتھ ان کے نام کو بھی زندۂ جاوید بنا دیا اور میری ایمان دارانہ رائے یہ ہے کہ انہوں نے نواب صاحب موصوف کے احسانات کا نعم البدل کر دیا۔

اس وجہ کے علاوہ اور کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ جہاں تک اس کتاب کے نفس مضامین کا تعلق ہے یعنی دورِ حاضر کے خلاف اعلان جنگ، میری رائے میں نواب صاحب کو ان سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ان کی نوابانہ شخصیت اور ان کی ریاست دونوں چیزیں انگریزوں کے رحم و کرم پر منحصر تھیں نہ وہ خود مغربی تہذیب کے خلاف اعلان جنگ کر سکتے تھے اور نہ مسلمانوں کو اس کے خلاف بغاوت کا سبق دے سکتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان سے اس تہذیب کے علمبرداروں کے چلے جانے کے بعد آج نہ کسی رئیس کا وجود نظر آتا ہے نہ کسی ریاست کا نشان باقی ہے۔

بیک گردشِ چرخ نیلوفری
نہ تا در بجا ماندنے نادری

اب میں آسان لفظوں میں ان تین شعروں کا مطلب بیان کئے دیتا ہوں۔

ع زمانہ با امم ایشیا چہ کرد و کند

فرماتے ہیں کہ اقوام مغرب نے اقوام ایشیا پر جو مظالم کئے ہیں ان کی داستان بہت طویل اور بہت دردناک ہے اب تک کسی شخص کی توجہ اس داستان کو قلمبند کرنے کی طرف مبذول نہ ہوئی انجام کار میں نے اس اہم فریضہ کو انجام دیا۔

اے ممدوح! تو صاحب نظر ہے اور تیری فراست اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ تو میرے جذبات اور خیالاتِ قلبی سے اچھی طرح واقف ہے۔ پس میں اپنے افکار اور احساسات تیری خدمت میں پیش کرتا ہوں کیونکہ تیرے اندر وہ خوبیاں جمع ہیں کہ پھولوں کو شاخ سے وہ تر و تازگی نصیب نہیں ہو سکتی جو تیرے ہاتھ میں آکر نصیب ہو سکتی ہے۔

ع کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

یہ مشہور شاعر طالب آملی کا مصرع ہے جس پر اقبالؔ نے تضمین کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنے محبوب کی شانِ مسیحائی کا اظہار کرتا ہے کہ پھول اس کے ہاتھ میں آکر مرجھا نہیں سکتا بلکہ اور بھی تر و تازہ ہو جائے گا اسی طرح (اقبال کہتے ہیں) اے ممدوح میرے پاس مسلمان قوم کو تر و تازہ کرنے اور اس کے باغ کو شگفتہ بنانے کا جو کچھ سرمایہ ہے وہ میں تیرے حوالے کرتا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تیرے دل میں قوم کی محبت ہے۔ میرا تبصرہ اس تہنیت اور انتساب پر صرف یہ ہے کہ

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ناظرین سے

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ

(❁)

انتساب کے بعد علامہ اقبالؔ نے ناظرین سے خطاب کیا ہے اور تین شعروں میں ان کو بعض ان حقائق سے آگاہ کیا ہے جن کے بغیر کوئی قوم دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اقبالؔ نے اسرارِ خودی۔ پیامِ مشرق۔ زبورِ عجم۔ جاوید نامہ اور "پس چہ باید کرد" ان سب کتابوں میں ناظرین سے خطاب کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ قوم نے اس قلندر کے خطاب کو در خود اعتنا ہی نہیں سمجھا اس لئے اس کو گویّوں اور قوالوں کے حوالہ کر دیا تاکہ وہ اچھی طرح اس کا پوسٹ مارٹم کریں) اور وہ نکتے بیان کر دیئے ہیں جن پر غور کرنے سے کتاب کے مطالب بآسانی

ذہن نشین ہو سکیں اور کتاب لکھنے سے جو مقصد ہے وہ بدرجہ اتم حاصل ہو سکے چنانچہ ضرب کلیم میں بھی ناظرین سے خطاب کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

اے مسلمان! جب تک تو زندگی کے حقائق کو پیش
نظر نہیں رکھے گا تیری ذات یا شخصیت جو باعتبار تخلیق شیشہ
کی طرح کمزور[1] ہے حوادثِ روزگار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

واضح ہو کہ اس شعر میں زندگی کے حقائق کی جو ترکیب واقع ہوئی ہے یہ اس خطاب یا اس کتاب ہی کی جان نہیں ہے بلکہ سارے فلسفۂ اقبال کی کلید ہے مرحوم ساری عمر اسی کوشش میں مصروف رہے کہ قوم (۱) حقائق سے آگاہی حاصل کرے یعنی ان اٹل صداقتوں کا علم حاصل کرے جن پر بنی آدم کی حیات موقوف ہے۔ اور (۲) اس آگاہی کے بعد ان صداقتوں کو ہمیشہ زندگی کے ہر شعبہ میں مدِ نظر رکھے۔

علامہ نے ۱۹۳۲ء میں ایک صحبت میں مجھ سے ارشاد فرمایا تھا کہ مسلمان قوم۔ ایک عرصہ دراز سے حقائق حیات سے بیگانہ ہو چکی ہے اور اب تو فرار کی یہ کیفیت ہے کہ قوم ہر حقیقت اور ہر صداقت سے روگرداں ہے جس طرح شتر مرغ صیاد کو دیکھ کر اپنا سر ریت میں چھپا لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں اس کی نگاہوں سے محفوظ ہو گیا اسی طرح مسلمان مصائب کا مقابلہ کرنے کے بجائے خانقاہوں اور درگاہوں اور حجروں میں اپنا سر چھپائے پھرتے ہیں لیکن یہ

---

[1] قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا۔ یعنی انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

کوشش بالکل بے سود ہے۔ اب تو مصائبِ حیات صرف مقابلہ کرنے سے دور ہو سکتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ مصائب اس لئے ہیں کہ قوم پر تن آسانی مسلط ہو چکی ہے وہ جد و جہد سے نفور ہے اس لئے زندگی سے دور ہے جس طرح ایک فضول خرچ اور عیّاش مقروض مستقبل کے تصوّر سے گھبرا کر شراب اور موسیقی کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ اسی طرح میری قوم درگاہوں۔ خانقاہوں صاحب قبور سے التجاؤں اور گنڈے تعویذوں میں سکون اور عافیت تلاش کرتی ہے۔[1]

پھر فرمایا سنو! میں تمہیں ایک نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر تم دنیا میں مشکلات پر غالب آنا چاہتے ہو تو (یہ جملہ علامہ نے انگریزی میں ادا کیا تھا اس لئے میں نے بھی اسی طرح نقل کر دیا ہے) اس کی تشریح میں علامہ نے فرمایا تھا کہ مسلمان ایسے بزدل ہو گئے ہیں کہ اب حقائق کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور ان سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح قصائی سے گائے پس تم حقائق کی اہمیت کا مردانہ وار اعتراف کرو اور ان کے وجود کو تسلیم کرو (HALF FACTS LIKE A MAN) کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً فضول خرچی سے انسان تباہ ہو جاتا ہے۔ اب یہ ایک حقیقت ہے لیکن مسلمان چونکہ جانتا ہے کہ اس حقیقت پر غور کرنے سے یا اس کا اعتراف کرنے سے موجودہ عیش

---

[1] میرا یہ اصول تھا کہ میں جب علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو ان کے ارشادات حتی الوسع انہیں کے لفظوں میں قلم بند کرتا جاتا تھا یہ عبارت انہی ملفوظات سے ماخوذ ہے۔

میں خلل پڑے گا اس کا مسلک تو یہ ہے۔

اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

اس لئے وہ کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اس کو اس طرف متوجہ کرتا ہے تو وہ فوراً موضوع سخن بدل دیتا ہے۔

اب میں چند سطور میں زندگی کے حقائق کی تشریح بھی کر دوں مناسب ہے کہ ان کو چند مثالوں سے واضح کر دیا جائے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ منجملہ حقائق حیات۔ ایک حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اسی بات کا ثمرہ ملے گا جس بات کے لئے وہ کوشش کرے۔

۲۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ زید کو دوا پلانے سے بکر کا مرض دور نہیں ہو سکتا۔

۳۔ تیسری حقیقت یہ ہے کہ یہاں تنازع للبقا اور بقائے اصلح کا قانون کارفرما ہے۔

۴۔ چوتھی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی مثلاً اللہ نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ نیم کے بیج سے انار کا پودا نہیں اُگ سکتا۔

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

۵۔ پانچویں حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنی حالت بدلنے کے لئے جدوجہد نہ کرے۔ اللہ بھی اس کی حالت نہیں بدلتا۔

۶۔ چھٹی حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

۷۔ ساتویں حقیقت یہ ہے کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔
۸۔ آٹھویں حقیقت یہ ہے کہ محنت کے بغیر راحت حاصل نہیں ہو سکتی۔
۹۔ نویں حقیقت یہ ہے کہ جد وجہد سے حکومت ملتی ہے حکومت سے دولت حاصل ہوتی ہے۔ دولت سے عیش وعشرت کا دروازہ کھلتا ہے۔ عیش وعشرت کا نتیجہ تن آسانی ہے۔ تن آسانی کا نتیجہ محکومی اور غلامی ہے۔
۱۰۔ دسویں حقیقت یہ ہے کہ جاہل آدمی اور حیوان (گھوڑا۔ گدھا۔ گائے بیل۔ بکری میں مقصد حیات کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے یعنی جس طرح گھوڑے کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں سوائے اس کے کہ وہ دوسروں کی گاڑی کھینچے اسی طرح جاہل فرد۔ یا قوم کی زندگی کا بھی کوئی مقصد نہیں۔ جز اینکہ وہ دیگر اقوام کی غلامی کرے اور ان کی آسائش کے سامان مہیا کرتا رہے تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔

اب میں اس کتاب کے ناظرین سے دریافت کرتا ہوں کہ وہ ایک طرف ان حقائق کو مدنظر رکھیں۔ دوسری طرف مسلمان قوم کی زندگی پر تنقیدی نگاہ ڈالیں کیا یہ ایک ناقابل تردید حقیقت نہیں ہے کہ مسلمان قوم صدیوں سے حقائقِ حیات سے بے گانہ ہو چکی ہے؟

اقبالؔ کی پہلی اور سب سے بڑی نصیحت یہ ہے کہ زندگی کے حقائق کو ہر وقت پیش نظر رکھو یہ طریقہ بالکل تباہ کن ہے کہ تم گھروں میں فضول خرچی کر کے مقروض ہو جاؤ اور مسجدوں میں خدا سے دعا کرو کہ اے اللہ ہماری پریشانی کو دور فرما۔ یاد رکھو تمہاری دعا کبھی مقبول نہیں ہو گی کیونکہ اللہ

اپنا قانون تمہارے لئے کیوں توڑ دے۔

انسان بہت کمزور ہے اگر وہ زندگی (فطرت) کے اٹل قوانین کو مدّ نظر نہیں رکھے گا۔ تو کشمکشِ حیات میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اے مسلمان! یہ دنیا عیش و آرام کی جگہ نہیں ہے بلکہ زور دست اور ضربت کاری کا مقام ہے یہ دنیا بساطِ رقص و سرود اور محفلِ خورد و نوش نہیں بلکہ میدان جنگ ہے اور جدل و پیکار کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو قومیں سکون کی متلاشی ہیں وہ فنا ہو جائیں گی کیونکہ سکون کا لفظ فطرت کی لغت میں کہیں مذکور نہیں ہے۔ بقول اقبالؔ

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانہ میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانہ میں

سکون تو صرف قبر میں مل سکتا ہے، یہ دنیا سکون کے لئے نہیں بنائی گئی یہاں تو ہر وقت جد و جہد درکار ہے[1]۔

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

دنیا کا قانون یا اصل اصول سکون نہیں بلکہ تغیر اور انقلاب ہے یعنی حرکت اور حرکت کے تسلسل کا نام جد و جہد ہے اور یہی مسلمان کی زندگی کی

---

[1] چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی اس حقیقت پر شاہد ہے کہ حضور تادمِ وصال باطل کے خلاف شمشیر بکف رہے۔

شناخت ہے۔

نشاں یہی ہے زمانہ میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

القصہ جب یہ ثابت ہو چکا کہ دنیا میدان جنگ ہے تو اے مسلمان! تو میدانِ جنگ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کر۔ ضرب پیہم کا نمونہ دکھا۔ نوائے چنگ و رباب کی تمنا مت کر۔

اس دنیا میں وہی قومیں عزت کی زندگی بسر کر سکتی ہیں (سرمایۂ حیات انہیں کو مل سکتا ہے) جو رات و دن خونِ دل و جگر پیتی رہتی ہیں یعنی جد و جہد کرتی رہتی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ فطرت لہو ترنگ ہے۔ جل ترنگ نہیں ہے۔

یہاں اقبالؔ نے لفظ "ترنگ" سے شاعرانہ نکتہ پیدا کیا ہے۔ "جل ترنگ" ایک باجہ کا نام ہے جس کی صورت یہ ہے کہ سات یا بارہ[۱۲] پیالیوں میں مختلف مقدار میں پانی بھر کر نیم دائرہ کی شکل میں سامنے رکھ لیتے ہیں اور لکڑی کے ٹکڑے کے ذریعہ پانی سے آوازیں پیدا کرتے ہیں۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ فطرت جل ترنگ نہیں۔ یعنی پانی سے نہیں کھیلتی دوسرے معنی ہیں کہ عیش و عشرت اور نغمہ و سرود کا نام نہیں بلکہ لہو ترنگ ہے یعنی خون سے کھیلتی ہے بالفاظِ دگر جد و جہد۔ مقابلہ اور پیکار کا نام ہے یاد رکھو! دنیا میں وہی قومیں برسرِ اقتدار آتی ہیں جو ہر وقت مصروف جد و جہد رہتی ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید نے مسلمانوں کو ہر وقت جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار رہنے کا حکم دیا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ (سورہ توبہ ع ۸) یعنی اور تیاری کرو کافروں سے لڑائی کے لئے جو کچھ تم جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اس سے تمہاری دھاک بیٹھے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اور دوسروں پر ان کے سوا جو ہیں۔

تمہید

(۱)

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری
کہ خاوراں میں ہے قوموں کی روح ترپائی!
اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی!
تری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن
کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی!
زمانہ اپنے حوادث چھپا نہیں سکتا
ترا حجاب ہے قلب و نظر کی ناپاکی!
عطا ہوا حسن و خاشاکِ ایشیا مجھ کو
کہ میرے شعلے میں ہے سرکشی و بے باکی!

(۲)

ترا گناہ ہے اقبالؔ مجلس آرائی
اگرچہ تو ہے مثالِ زمانہ کم پیوند
جو کوکنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو
تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند
تڑپ رہے ہیں فضاہائے نیلگوں کے لئے
وہ پرشکستہ کہ صحنِ سرا میں تھے خورسند
تری سزا ہے نوائے سحر سے محرومی
مقامِ شوق و سرود و نظر سے محرومی

(٭)

اب تمہید شروع ہوئی ہے اور اس عنوان کے تحت اقبالؔ نے اپنے خیالات دو حصوں میں ظاہر کئے ہیں یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ تمہید کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں انہوں نے ایشیائی اقوام سے عموماً اور مسلمانوں سے خطاب کیا ہے اور بعض حقائق و معارف ان پر واضح کئے ہیں۔ دوسرے حصہ میں اپنے متعلق خود تبصرہ کیا ہے۔

(۱)

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

۱۔ فرماتے ہیں کہ موجودہ حالت یہ ہے کہ ایشیا میں نہ مسلمانوں کی خودی بیدار ہے نہ غیر مسلموں کی مسلم اور غیر مسلم دونوں اپنی خودی سے غافل ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرقی اقوام کی روح خوابیدہ ہے خودی کی بیداری کے لئے ہوش شرط ہے لیکن جو شخص یا قوم افیون کے نشہ میں مست ہو اس کی خودی کیسے بیدار ہو سکتی ہے۔

۲۔ جو قوم کشمکش حیات میں مبتلا ہو اور چاروں طرف سے آفات میں محصور ہو اس کو لازم ہے کہ پہلے ان سے نجات حاصل کرے اگر وہ قوم غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے بجائے فلسفہ اور منطق کے مسائل میں منہمک رہے تو یہ انہماک اس کے حق میں بہت مضر ہے۔

۳۔ اے مخاطب! اگر تو اپنی نادانی سے خودی کو پیکر خاکی یعنی مادّی شئے سمجھتا ہے تو پھر تو موت کے غم سے نجات نہیں پا سکتا یعنی اگر کوئی مسلمان اپنی جہالت سے یہ سمجھتا ہے کہ روح بھی جسم کی طرح فانی ہے اور مرنے کے ساتھ ساتھ زندگی ختم ہو جائے گی تو وہ شخص بلاشبہ موت کے تصور سے لرزہ براندام رہے گا لیکن اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری خودی موت کے بعد بھی باقی رہے گی تو پھر اسے موت کا کوئی ڈر نہ ہوگا۔

۴۔ دنیا میں جو واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں ان کا وقوع مختلف النوع قوانین کا پابند ہے اور ہر واقعہ کا جس طرح کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے اسی طرح نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ یعنی زمانہ ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہے جسے ہر صاحب بصیرت پڑھ سکتا ہے لیکن اگر تو اسباب اور نتائج کو نہیں دیکھ سکتا تو اس

کا سبب یہ ہے کہ تیرا دل اور تیری فطرت نظر دونوں ناپاک ہیں اور یہ ناپاکی تیرے حق میں حجاب بن گئی ہے۔

۵۔ میرے کلام میں اللہ نے بڑی تاثیر بخشی ہے اور یہ اس لئے ہے تاکہ میں اپنے کلام سے ایشیا والوں کو بیدار کر دوں۔

تمہید کے دوسرے حصّہ میں علاّمہ کہتے ہیں کہ

۱۔ فرماتے ہیں کہ اگرچہ میں زمانہ کے مانند کم پیوند ہوں کسی سے تعلق نہیں رکھتا لیکن اس کے باوجود میں نے مجلس آراستہ کر دی ہے یعنی بہت سے لوگ میرے ہم خیال ہو گئے ہیں۔

۲۔ جو لوگ پوست افیون کے عادی تھے میں نے انہیں ہوشیار کر دیا اور میرے کلام کی بدولت ان میں آزادی اور حصولِ سروری کے جذبات پیدا ہو گئے۔

۳۔ اور وہ محکوم قومیں جو غلامی کی زندگی میں خوگر بنا دی تھیں اب آزادی کی فضا میں سانس لینا چاہتی ہے۔

۴۔ اس لئے اسلام کی مخالف طاقتیں یہ چاہتیں ہیں کہ کوئی صورت ایسی ہو کہ میں نوائے سحر اور مقام شوق سے محروم ہو جاؤں تاکہ محکوم قوموں کے اندر حریت کے جذبات پیدا نہ کر سکوں۔

تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ علاّمہ نے حسب ذیل عنوانات کے تحت اپنے افکار قلمبند کئے ہیں۔

اسلام اور مسلمان۔ تعلیم و تربیت۔ عورت۔ ادبیات

فنون لطیفہ۔ سیاسیات مشرق و مغرب اور محراب گل اور افغان کے افکار۔

بالفاظ دیگر انہوں نے ان عنوانات کے تحت انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ پر تنقید کی ہے اور ہر معاملہ میں اسلامی زاویۂ نگاہ پیش کیا ہے۔

آخر میں اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ یہ شرح خاص طور سے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے (تاکہ انہیں کلام اقبال فہمی میں سہولت ہو سکے اور اگر وہ اقبال کے پیغام کو ذہن نشین کر سکیں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان کے مقصد کی تکمیل کے لئے کچھ کوشش بھی کریں گے) یہی وجہ ہے کہ میں نے ہر جگہ اختصار سے کام لیا ہے ورنہ اس کتاب میں بہت سے اشعار ایسے ہیں ان کی شرح کے لئے سیکڑوں صفحات درکار ہوں گے۔

حرفِ آخر

آج سے تین سو سال پہلے (یعنی جب مسلمان زندہ تھے) مسلمان حکمراں علم اور علماء دونوں کی قدر کرتے تھے۔ اور ہر عالم کے لئے علمی وظائف مقرر کرتے تھے تاکہ وہ سکونِ قلب کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مشغول رہ سکے۔

چنانچہ حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں ہر اونچے درجے کے طالبعلم کو آٹھ آنے سے لے کر دو روپے یومیہ وظیفہ ملتا تھا اور ہر عالمِ دین کو معقول علمی وظیفہ دیا جاتا تھا۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کو شاہجہاں نے دو گاؤں بطور مددِ معاش عطا کئے تھے۔

لیکن آج بقول استادِ محترم حضرت مولانا رسول خان صاحب مدظلہ
"علم دین سے زیادہ کوئی چیز ذلیل و خوار نہیں ہے"

اندریں حالات میں نے صرف اللہ کی تائید کے بھروسے پہ کلام اقبال کی شرح کا سلسلہ شروع کیا ہے اور اسی سے التجا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(یوسف سلیم چشتی)

—(❖)—



صبح

(بھوپال (شیش محل) میں لکھے گئے)

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

حصّۂ اوّل

اسلام اور مسلمان

(صبح)

شرح مشکلات فرماتے ہیں کہ یہ تو مجھے معلوم نہیں[1] کہ یہ سحر جس سے ہم کل اور آج کا شمار کرتے ہیں کیسے اور کہاں سے پیدا ہوئی ہے لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ سحر جس سے یہ کائنات کانپ اٹھتی ہے۔ بندۂ مومن کی اذان سے پیدا ہوتی ہے یعنی مومن کے نعرۂ تکبیر "اللہ اکبر" میں ایسی تاثیر ہے کہ ساری کائنات لرزہ براندام ہوتی ہے اور بڑے بڑے بت سہم جاتے ہیں۔

خلاصۂ کلام اینکہ ایک سحر تو وہ ہے جو طلوعِ آفتاب سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی مدد سے ہم ماہ و سال کا شمار کرتے ہیں لیکن ایک سحر اور بھی ہے جس سے ایوانِ وجود میں زلزلہ پڑ جاتا ہے اور وہ سحر مومن کی اذان سے پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ مومن

---

[1] اقبالؔ کا یہ کہنا کہ "نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا" محض تجاہلِ عارفانہ ہے مطلب ان کا یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ سحر طلوعِ آفتاب سے پیدا ہوتی ہے۔

صبح کی اذان[1] میں اللہ اکبر کی صدا بلند کرتا ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

خودی کا سرِّ نہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
خودی ہے تیغ فساں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریب سود و زیاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

---

[1] اسلامی تاریخ میں بندۂ مومن کی اذان سے ایسی سحر کے پیدا ہونے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ میں صرف ایک سحر کا حال درج کرتا ہوں۔
۷ر جولائی ۷۱۱ء/۹۲ھ کو جب طلوع آفتاب سے پہلے مسلمانوں نے سرزمین اندلس میں فجر کی اذان دی اور جنگ سے پہلے اپنے سپہ سالار طارق کی امامت میں نماز ادا کی تو وہ سحر پیدا ہوئی جس سے اسپین کی زمین لرزہ براندام ہو گئی۔

خرد ہوئی ہے زماں و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

(∴)

شرح مشکلات

میرا خیال ہے کہ حقائق نگاری اور فلسفہ طرازی کے لحاظ سے اس سے بہتر اور برتر نظم ساری کتاب میں موجود نہیں ہے اگر اس عدیم المثال نظم کے ہر شعر کی مفصل شرح لکھی جائے تو ایک دفتر درکار ہوگا اگرچہ میں دل پر جبر کر کے اختصار سے کام لونگا لیکن پہلے شعر میں جو لفظ "خودی" آیا ہے اس کی مختصر تشریح بہت ضروری ہے۔

خودی کے لغوی معنی

خودی فارسی زبان کا لفظ ہے "خود" سے مشتق ہے۔ خودی بمعنی ذاتِ خویش جسے عربی میں اَنَا اور انگریزی میں (SELF) کہتے ہیں۔ خودی کو اردو میں لفظ "میں" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جب ایک انسان یہ کہتا ہے کہ مثلاً میں یہ کام کرونگا تو وہ لفظ "میں" سے اپنی ذات کی طرف اشارہ کرتا ہے ہم اس کی تشریح نہیں کر سکتے کہ یہ "میں" دراصل کیا ہے۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ موجود ہے اقبال

کا پیغام یہی ہے کہ اس نقطۂ نوری کو پہچانو۔

(ب) خودی کے مرادی معنی

خودی سے ہم بعض اوقات خودداری اور عزتِ نفس بھی مراد لیتے ہیں اور اس مفہوم کی سرحد تکبّر سے ملی ہوئی ہے یعنی جب اس جذبہ میں افراط ہو جائے تو تکبّر کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

(ج) تصوّف میں خودی کا مفہوم

صوفیا کے لٹریچر میں خودی سے خود بینی یا تکبّر مراد لی گئی ہے وہ خودی کو اچھے معنوں میں استعمال نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو تصوّف کی کتابوں میں ایسے جملے ملتے ہیں کہ جب تک خودی کو نہ مٹایا جائے خدا نہیں مل سکتا۔ گویا صوفی خودی کو تکبر کے معنی میں استعمال کرتا ہے وہی تکبّر جس کے متعلق سعدیؒ نے لکھا ہے۔

تکبّر عزازیل را خوار کرد
بزندانِ لعنت گرفتار کرد

یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۱۴ء میں اقبالؔ نے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی اسرارِ خودی شائع کی۔ تو صوفیوں کی جماعت نے از راہ نادانی ان پر اعتراض کیا کہ اقبالؔ تو مسلمانوں کو تکبّر کی تعلیم دے رہے ہیں اور یہ ہنگامہ ۱۹۱۵ء شروع ہو کر ۱۹۲۰ء تک جاری رہا چنانچہ علامہ نے اس باب میں اپنی پوزیشن واضح کی اور بتایا کہ "خودی" کو میں نے ان معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے[1]۔

---

[1] اس مناقشہ کی تفصیل اسرارِ خودی کی شرح میں لکھونگا جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

(د) خودی کے اصطلاحی معنی

"اقبال کے کلام میں خودی سے خود بینی یا غرور مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مصداق وہ شئے ہے جس سے قیامت کے دن باز پرس ہوگی یا وہ شئے مراد ہے جس کا تزکیہ کر لیا جائے تو انسان فلاح پا جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ تحقیق کہ وہ مراد کو پہونچا جس نے اس نفس کو سنوار لیا۔ یعنی جس نے اپنی خودی کا تزکیہ کر لیا وہ کامیاب ہو گیا۔

(ب) اقبال کے الفاظ میں خودی ایک نقطۂ نوری ہے۔ چنانچہ گلشن رازِ جدید میں لکھتے ہیں۔

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

یعنی خودی ایک غیر مادی جوہر ہے لیکن مادی جسم پر تصرف کر سکتی ہے۔

(ج) یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے۔ خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے۔

(د) خودی وہی شئے ہے جسے منطقی اصطلاح میں نفس ناطقہ کہتے ہیں۔ اور قرآن مجید نے اس کو کہیں نفس سے تعبیر کیا ہے۔ کہیں روح سے اور اس کی تین حالتیں بیان کی ہیں۔ نفس امّارہ۔ نفس لوّامہ اور نفس مطمئنہ۔

(ہ) خودی وہ جوہر ہے جس کی بدولت انسان استنباط۔ استخراج اور استدلال کر سکتا ہے۔

(ز) خودی وہ جوہر ہے جس کی بنا پر انسان کو اشرف المخلوقات کا لقب

عنایت ہوا ہے اور انسان کی خودی اس احساس کا نام ہے کہ میں اشرف المخلوقات ہوں۔ خودی میں بے اندازہ قوتیں مخفی ہیں اور اقبال کے فلسفہ خودی کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان ان مخفی قوتوں کی صحیح طریق پر تربیت کرے اور تربیت کا طریقہ یہ ہے کہ سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کرے اور اتباع کی واحد صورت یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے محبت کرے۔

خلاصہ کلام اینکہ عشق رسولؐ کے بغیر اتباعِ رسولؐ ناممکن ہے اور اتباع رسولؐ کے بغیر خودی مرتبۂ کمال تک نہیں پہنچ سکتی اور جب تک خودی مرتبۂ کمال کو نہ پہنچے انسان اپنا مقصد حیات حاصل نہیں کر سکتا اور اگر مقصد حیات حاصل نہ ہوا تو عدم اور وجود دونوں برابر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے عشقِ رسولؐ پر اپنا سارا زور کلام صرف کر دیا ہے۔

اقبالؔ کا یہ فلسفہ قرآن کریم کی اس آیتِ شریفہ سے ماخوذ ہے۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (سورہ آل عمران) یعنی اے رسولؐ! آپ مسلمانوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ میری اتباع کرو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ خود تم سے محبت کرنے لگے گا۔

اس آیت کو سمجھنے کے لئے ذیل کی آیت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (سورہ بقرہ) جو لوگ ایماندار مومن ہیں ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔

یعنی ایمان کی بنیاد محبّت الٰہی ہے اور اللہ سے محبت کرنے کی صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جائے اور اتباعِ رسولؐ بغیر محبت رسولؐ کے نہیں ہو سکتی اس لئے دراصل ایمان کی بنیاد محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

اب اس نظم کے اشعار کا مطلب مختصر طور پر لکھتا ہوں۔

پہلا شعر:۔ انسانی خودی کی ترقی اور ارتقائے کامل اس بات پر موقوف ہے کہ انسان کلمۂ توحید پر اس طرح ایمان لائے کہ اس کے عمل سے یہ ثابت ہو کہ وہ کائنات میں اللہ کے سوا نہ وہ کسی ہستی سے ڈرتا ہے نہ کسی کی اطاعت کرتا ہے یعنی اللہ کے سوا نہ وہ کسی کو اپنا معبود قرار دیتا ہے نہ مقصود نہ مطلوب اس کا مرنا اور جینا صرف اللہ ہی کے لئے ہے (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اللہ سے شدید محبت نہ ہو) یعنی توحید پر عامل ہونے سے خودی کی مخفی قوتیں بروئے کار آ سکتی ہیں اور وہ اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ سکتی ہیں۔

خودی کو اگر تیغ سے تشبیہ دی جائے تو جب تک تلوار میں دھار نہ ہو اور کاٹ میں تیزی نہ ہو تلوار بے کار ہے اس لئے توحید خودی کے لئے بمنزلۂ

---

[1] اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ دراء الوراء اور نگاہوں سے پوشیدہ ہے اس لئے کوئی انسان اس سے براہ راست محبت نہیں کر سکتا۔ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے اللہ کی ذات تک بے چون وچرا پہنچ سکتا ہے۔

سان ہے جس طرح سان پر چڑھانے سے تلوار صحیح معنی میں تلوار بن جاتی ہے اسی طرح جب مسلمان حقیقی معنی میں موحّد بن جاتا ہے تو اس کی خودی اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے اسی نکتہ کو اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے۔

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

دوسرا شعر:۔ فرماتے ہیں کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے زمانہ میں نمرودؔ نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور اللہ کے بندوں کو اپنی پرستش پر مجبور کیا تھا اور حضرت ابراہیمؑ نے اس کا خاتمہ کیا تھا اسی طرح موجودہ زمانہ میں کئی نمرود پیدا ہو گئے ہیں جو خدائی کا دعویٰ کر کے اللہ کے بندوں کو گمراہ کر رہے ہیں اس لئے موجودہ زمانہ بھی اس بات کا متمنی ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ ایسا پیدا ہو جو عصرِ حاضر کے بتوں کو پاش پاش کر دے حقیقت حال یہ ہے کہ یہ دنیا تو صنم کدہ ہے اور پرستش اور اطاعت کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے۔

تیسرا شعر:۔ اے مسلمان! اگر تو نے اس دنیائے فانی سے دل لگایا ہے تو بلاشبہ تو نے "متاعِ غرور" کا سودا کیا ہے اقبالؔ نے یہاں دنیا کی زندگی کو قرآنی تعلیم کے مطابق متاعِ غرور یعنی دھوکہ کی پونجی قرار دیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ یعنی نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر دھوکہ کی پونجی۔

اے انسان! تو دنیا کی دلچسپیوں میں منہمک ہو گیا ہے اور سمجھتا ہے

45351

کہ اگر میں نے سچ بولا تو حکومت ناراض ہو جائے گی اور مالی نقصان ہو جائے گا اور اگر میں خدا کے بجائے ارباب اقتدار کی اطاعت کروں گا تو مجھے دولت اور عزت نصیب ہو گی یہ سب خیالات بالکل مہمل ہیں تو غلط طور پہ نفع اور نقصان کے فریب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ ارے نادان! نہ اس دنیا کی کوئی اصلیت ہے اور نہ اس کا سود و زیاں کوئی حقیقت رکھتا ہے کیونکہ اللہ کے سوا نہ کوئی معبود ہے نہ مقصود۔ نہ مطلوب۔

چوتھا شعر:۔ اے مخاطب! دنیا اور اس کے متعلقات اور اس کے گوناگوں مناظر اور مظاہر مثلاً مال و دولت۔ بیوی بچے۔ رشتہ دار مادی سامان آرائش جس کے لئے تو اللہ اور اس کے رسول کے احکام سے روگردانی کرتا ہے۔ یہ سب بے حقیقت اور فانی چیزیں ہیں یہ سب تیرے وہم اور گمان کے تراشے ہوئے بت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا مسلم کا نہ کوئی معبود ہو سکتا ہے نہ مطلوب نہ مقصود۔

اللہ ہی ایک مستقل قائم بالذات اور باقی ہستی ہے۔ وہی اس لائق ہے کہ اس سے محبت کی جائے اور صرف وہی اس لائق ہے کہ اسے مقصود زندگی بنایا جائے۔ مال۔ دولت۔ جاگیر۔ عہدے۔ بیوی بچے ان میں سے کسی کو ثبات نہیں ہے اور اس لئے ان میں سے کسی کے ساتھ دل لگانا سراسر نادانی ہے کیونکہ نہ انہیں دوام ہے اور نہ تو ان کو اپنے ساتھ قبر میں لیجا سکتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ زمان و مکان کی بحث چونکہ بہت طویل ہے اور کالج کے طلبہ کی فہم سے بھی بالاتر ہے اس لئے اس سے قطع نظر کر کے شعر کا

مطلب یہ ہے کہ دنیا کے عقلاء اور حکماء مدتوں سے اس مسئلہ میں الجھے ہوئے ہیں کہ زمان و مکان (TIME AND SPACE) کی حقیقت کیا ہے یہ خارج میں موجود ہیں۔ یا نہیں؟ اس بحث میں عقلاء اس قدر منہمک ہوئے کہ خدا کے بجائے زمان و مکان کے تصوّرات کی پرستش کرنے لگے حالانکہ اصلی اور بنیادی چیز حیات ہے انسان کو سب سے زیادہ توجہ اس بات پر دینی چاہیئے کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ زمان یا زمانہ تو وہ ہماری زندگی (حیات) ہی کا دوسرا نام ہے اور اس کا تصور زندگی ہی سے وابستہ ہے۔

زندگی دہر است و دہر از زندگی است[1]

لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فرمانِ نبی است

اور حیات خود اللہ تعالیٰ کے حکم سے موجود ہوئی ہے جیسا کہ قرآن حکیم فرماتا ہے۔ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔ آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے موجود ہوئی ہے اور تم لوگ اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتے کیونکہ تمہیں حقائق اشیاء کا بہت قلیل علم دیا گیا ہے۔

---

[1] اقبالؔ نے اسرارِ خودی میں یہ شعر لکھا ہے کہ زندگی زمانہ ہی کی ایک شان ہے اور زمانہ کا وجود زندگی ہی سے وابستہ ہے یعنی زندگی نہ ہو تو زمانہ کا تصور نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تصور کرنے والا ہی نہیں تو تصوّر کون کرے گا؟ اسی لئے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمانہ کو بُرا مت کہو۔

یعنی روح کی ماہیت عقل انسانی کی دسترس سے بالاتر ہے اور زمان و مکان کا تصوّر خود روح یا حیات سے وابستہ ہے اس لئے اس کی حقیقت کا سمجھنا بھی بہت دشوار ہے بقول اقبال صرف وہ شخص زمانہ کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے جو خودی کی حقیقت سمجھ سکتا ہے جب تک نفس کی معرفت حاصل نہ ہو زمان و مکان کی ماہیت یا حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی۔

پس ایک مسلمان کو معلوم ہونا چاہئے کہ دراصل نہ زمانہ کا وجود ہے نہ مکان کا وجود ہے ان دونوں کا وجود اعتبار معتبر پر موقوف ہے دراصل ایک ہی ذات ہے جس کا وجود حقیقی ہے اور وہ اللہ ہے اسی کے فیض سے حیات موجود ہوئی (اللہ نہ ہوتا تو یہ کائنات بھی نہ ہوتی) اور حیات نے زمان و مکان کے تصورات پیدا کئے کیونکہ حادثات و واقعات عالم کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ ماضی بھی ہو حال بھی ہو۔ استقبال بھی ہو۔ مثلاً آپ جب انقلاب ۱۸۵۷ء کا ذکر کریں گے تو زمانہ ماضی کا تصور لامحالہ پیدا ہو جائے گا۔

الغرض زمانہ موقوف ہے حیات انسانی پر۔ اور حیات انسانی منحصر ہے ذات باری کے فیضان یا اس کی صفتِ ربوبیت کی تجلی پر۔ تو اقبال کہتے ہیں کہ دراصل نہ ہے زمان و مکان۔ صرف اللہ ہی موجود ہے اور یہ دنیا اور اس کے مظاہر یعنی زمان و مکان سب ظلی وجود رکھتے ہیں یہ سب اس کے

لہ یعنی زمان کے وجود کا تحقق۔ نفس مدرک کے وجود پر موقوف ہے جس طرح موسیقی کا وجود سننے والے پر منحصر ہے۔

سہارے سے موجود ہیں ان کا وجود حقیقی یا خانہ زاد نہیں ہے چنانچہ اس حقیقت کو اقبالؔ نے بال جبریل میں بایں الفاظ بیان کیا ہے۔

وہی اصل مکان و لامکاں ہے — مکاں کیا شے ہے؟ اندازِ بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے؟ کیا بتائے — اگر ماہی ہے تو دریا کہاں ہے

اقبالؔ کی رائے میں زمان (TIMAE) خود اسرارِ کائنات میں سے ایک سربستہ راز (Mystery) ہے اور محض عقل اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتی ان چیزوں کی ماہیت صرف عارف کو حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اقبالؔ خود کہتے ہیں۔

نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت
غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت

اور ظاہر ہے کہ غوطہ لگانے کا طریقہ صرف مرشد کامل کی صحبت میں رہ کر حاصل ہو سکتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں درست ہے۔ عموماً لوگ موسم بہار میں موسیقی پسند کرتے ہیں لیکن یہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا نغمہ ایسا دل پذیر ہے کہ بہار ہو یا خزاں

لہ خدا ربط حادث بالقدیم۔ وجود۔ وحدۃ الوجود۔ روح زمان و مکان۔ علم ربط عالم یا معلوم۔ روشنی یا نور۔ پتھر۔ بجلی۔ ربطِ روح یا جسم انسانی وغیرہ یہ سب اسرارِ کائنات میں داخل ہیں اور صرف وہ شخص ان سے واقف ہو سکتا ہے جو اپنی خودی سے واقف ہو۔

ہر موسم میں دل کو بھاتا ہے یعنی توحید الٰہی زندگی کی ہر حالت میں انسان کو روحانی سکون اور طمانیت عطا کر سکتی ہے۔

ساتواں شعر:- اگرچہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں مختلف اقسام کے بت پوشیدہ ہیں اور وہ توحید کی حقیقت سے بیگانہ ہو چکے ہیں لیکن میں تو بہر حال اسلام کا پیغام دنیا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً سناؤں گا کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود یا حاکم نہیں ہے چنانچہ اسی مضمون کو بانگِ درا میں یوں ادا کیا ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی۔ باقی بتانِ آزری

تن بہ تقدیر

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پروین کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

شرح مشکلات

پہلا شعر:- قرآن نے مسلمانوں کو ایمان کے ساتھ عمل صالح جدوجہد سعیٔ پیہم اور جہاد کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ اس تعلیم کی بدولت مسلمان دنیا میں حکمراں بن گئے لیکن غیر اسلامی تصوف کے زیر اثر اگر مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا اور ترکِ دنیا کا غلط اصول اختیار کر لیا اور یہ سمجھ لیا کہ اسلام ترک دنیا کا حکم دیتا ہے حالانکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ پہلے دنیا کو فتح کرو تاکہ اسلامی نظام قائم ہو سکے پھر دنیا اور اس کی لذات کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے قربان کر دو۔ چنانچہ فاروق اعظمؓ کی سطوت کے سامنے

قیصر و کسریٰ لرزہ براندام تھے لیکن وہ پیوند لگی ہوئی قمیص پہنتے تھے اور چٹائی پہ سوتے تھے۔

دوسرا شعر:۔ ایک زمانہ تھا جب مسلمان اللہ کے لئے زندگی بسر کرتے تھے اور اس کا صلہ انہیں خدا نے یہ دیا تھا کہ ان کے ارادوں میں مشیت ایزدی پوشیدہ تھی یعنی وہ جس طرف نکل جاتے تھے تائید ایزدی ان کے ساتھ ہوتی تھی لیکن جب مسلمانوں نے احکامِ الٰہی سے روگردانی کرلی تو اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا اور آج ان کی حالت یہ ہے کہ عمل صالح سے کنارہ کر کے تقدیر پر بھروسہ کئے بیٹھے ہیں حالانکہ خدا کی تقدیر یعنی اس کا قانون یہ ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ انسان کو اللہ وہی عطا کرتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔ اقبالؔ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں نے تقدیر کا غلط مفہوم دماغوں میں جاگزیں کر لیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

معنیِ تقدیر کم فہمیدۂ
نے خدا را نے خودی را دیدۂ[1]

تیسرا شعر:۔ اب وہ اس انقلاب کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ یعنی بے عملی جو بہت بڑی بات تھی وہ اچھی کیسے ہو گئی؟ اس

---

[1] اے مسلمان تو نے تقدیر کا مفہوم ہی نہیں سمجھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ تجھے اللہ کی معرفت حاصل ہے اور نہ تو اپنی خودی کی حقیقت سے آگاہ ہے۔

کا جواب یہ دیتے ہیں کہ غلامی ایسی لعنت ہے کہ اس میں قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے یعنی جب کوئی قوم اپنی بداعمالیوں کی بدولت غلام بن جاتی ہے تو اس کا معیار خیر و شر بھی بدل جاتا ہے وہ اچھی باتوں کو بری اور بری باتوں کو اچھی سمجھنے لگتی ہے۔ مسلمانوں کو دیکھ لو۔ جہالت۔ قبر پرستی۔ رسوم پرستی۔ تقلید کورانہ۔ اسراف بیجا۔ تن آسانی۔ عیاشی یہ سب بری باتیں ہیں لیکن مسلمان ان کو اچھا سمجھتے ہیں۔ علم۔ محنت۔ ایثار۔ اتحاد۔ کفایت شعاری اور ایمانداری یہ سب اچھی باتیں ہیں لیکن مسلمان ان سب باتوں سے دور بھاگتے ہیں۔

معراج

دے ولولۂ شوق جسے لذّتِ پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرّہ مہ و مہر کو تاراج
مشکل نہیں یارانِ چمن معرکۂ باز
پُرسوز اگر ہو نفسِ سینۂ درّاج
ناوک ہے مسلماں! ہدف اس کا ہے ثریّا
ہے سرِّ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج
تو معنیٔ وَالنَّجْم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مدوجزر ابھی چاند کا محتاج

شرحِ مشکلات

پہلا شعر:- اگر کسی معمولی مسلمان میں عشقِ رسول ؐ کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ اس جذبہ کی بدولت دنیا میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے اور حیرت انگیز کارنامے انجام دے سکتا ہے۔

دوسرا شعر:- اے مسلمانو! مانا کہ تم کمزور ہو لیکن اگر تمہارے سینہ میں عشقِ رسول ؐ کا سوز پیدا ہو جائے تو تم باجبروت اور طاقتور دشمن کو مغلوب کر سکتے ہو۔

تیسرا شعر:- فرماتے ہیں کہ میں نے تو معراجِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واقعہ سے یہ سبق اخذ کیا ہے کہ مسلمان اگر اس میں محبت رسول ؐ (محبت الٰہی) کا جذبہ کارفرما ہو تو زمین کی کیا حقیقت ہے وہ عناصرِ کائنات پر حکمراں ہو سکتا ہے۔

چوتھا شعر:- لیکن اے مسلمان! تیرا مدّ و جزر ابھی تک چاند کا محتاج ہے یعنی تو ابھی تک عناصرِ اربعہ کی قید میں ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں مادی اسباب کا محتاج ہے تو نے ابھی تک اپنی خودی کو نہیں پہچانا تو نے عشقِ رسول ؐ کی بدولت ابھی تک اپنی روحانی قوتوں کو مرتبۂ کمال تک نہیں پہنچایا اس لئے اگر تیری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس جسم کے ساتھ کس طرح آسمان پر تشریف لے گئے تو مجھے اس پر مطلق حیرت نہیں ہے[1]!

---

[1] سورۂ والنجم قرآن مجید میں ایک سورہ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کا مطلب اسی وقت سمجھ میں آسکتا ہے جب انسان اپنی خودی کی معرفت حاصل کر کے عناصرِ کائنات پر حکمراں ہو جائے۔

ایک فلسفہ زدہ سیّد زادے کے نام

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زنّاریٔ برگساں نہ ہوتا

ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طِلسم سب خیالی

محکم کیسے ہو زندہ گانی؟
کس طرح خودی ہو لازمانی

آدم کو ثبات کی طلب ہے
دستورِ حیات کی طلب ہے

دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق
مومن کی اذاں ندائے آفاق

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا مرے لاتی و منا تی

تو سیّدِ ہاشمی کی اولاد
میری کفِ خاک برہمن زاد

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

اقبالؔ اگرچہ بے ہنر ہے
اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز
سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز

انجام خودی ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سرِّ محمدؐ و براہیم

دل در سخنِ محمدی بند
اے پورِ علیؓ ز بو علی چند

چوں دیدۂ راہ بیں نداری
قائد قرشی بہ از بخاری

شرح مشکلات یہ نظم اگرچہ علامہ نے ایک فلسفہ زدہ سید زادہ کے خیالات کی اصلاح کے لئے لکھی تھی لیکن اس زمانہ کے بہت سے فلسفہ زدہ مسلمان اس سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ فلسفہ زدہ اس شخص کو کہتے ہیں جو وحی کے مقابلہ میں عقل انسانی کی برتری کا قائل ہو فرماتے ہیں کہ

پہلا شعر: اے نوجوان! اگر تو اپنے دین (اسلام) سے بیگانگی کے باعث اپنی خودی کو تباہ نہ کر دیتا۔ تو کبھی حکمائے مغرب کے خیالاتِ باطلہ کا پیرو نہ ہوتا۔

یہاں خودی سے اسلامی زندگی مراد ہے اور برگساں سے مغربی حکماء کی جماعت مراد ہے۔ برگساں (HENRI BERGSON) مشہور فرانسیسی فلسفی ہے ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوا اور اس زمانہ میں عقلیت کے خلاف تحریک (Anti Rationalistic Movement) کا علم بردار ہے اس کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ عقل (Intellect) ادراک حقائق نہیں کر سکتی اس لئے ہمیں وجدان (Intuition) کو اپنا رہنما بنانا چاہئے تھا اقبال اور برگساں میں یہی خاص نقطۂ اتصال ہے۔

دوسرا شعر: اے نوجوان میں تجھے آگاہ کرتا ہوں کہ ہیگل (HEGEL) کا فلسفہ محض لفظوں کا طومار ہے پوست تو ہے مگر مغز نہیں ہے اور اس نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کی حقیقت ایک طلسم سے زیادہ نہیں اس کا فلسفہ بظاہر بہت عظیم الشان نظر آتا ہے لیکن جب اس کے خیالات کا تجزیہ کرتے ہیں

تو کچھ پلّے نہیں پڑتا۔

تیسرا شعر:۔ ہیگل[1]۔ برگسان اور دوسرے فلسفی دور از کار باتیں تو بہت کرتے ہیں۔ لیکن اس سوال کا ان کے پاس نہ کوئی جواب ہے نہ حل ہے کہ زندگی کس طرح محکم ہو سکتی ہے۔

مثلاً کانٹ کہتا ہے کہ کائنات کا وجود حقیقی ہے اس کے مقابلہ میں ہیگل کہتا ہے کہ غیر حقیقی ہے یہ اور اسی قسم کے صدہا فلسفیانہ مسائل ذہنی دلچسپی کا سامان تو بہم پہنچا سکتے ہیں لیکن ان مسائل سے حیاتِ انسانی مستحکم نہیں ہو سکتی اسی لئے اسلام نے ہمیں ان مسائل میں الجھانے کے بجائے زندگی کو محکم کرنے کے طریقے بتائے ہیں۔

---

[1] ہیگل۔ انیسویں صدی کا نہایت مشہور جرمن فلسفی گذرا ہے ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۳۱ء میں وفات پائی اس کا فلسفہ ایک خاص قسم کی تصوریت ہے جسے ہیگل کی تصوریت (Hegelian Idealism) کہتے ہیں اور بعض باتوں میں افلاطون کے فلسفہ سے مشابہ ہے۔ افسوس کہ میں اس شرح میں برگسان اور ہیگل کے فلسفہ کی تشریح نہیں کر سکتا۔ پھر اگر چند صفحے لکھوں تو اجمال کی وجہ سے ابہام پیدا ہو جائے گا۔ وضاحت کروں تو کتاب اتنی ضخیم ہو جائے گی کہ طلبہ کے لئے خریدنا دشوار ہو جائے گا اس لئے جس طالبعلم کو ہیگل یا برگسان کے فلسفہ سے آگاہی مطلوب ہو وہ (Dhillon یا Wicker) کی تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کرے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان کو جن مسائل سے فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ۔ وہ نہیں جن میں فلاسفہ اُلجھے ہوئے ہیں بلکہ وہ یہ ہیں۔ مثلاً

(ا) زندگی کیسے محکم ہو سکتی ہے۔؟

(ب) خودی کیسے زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہو سکتی ہے۔؟

چوتھا شعر:۔ انسان کو جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اسے ثبات کیسے حاصل ہو نیز وہ زندگی بسر کرنے کا بہترین نظام چاہتا ہے جن مسائل میں حکماء منہمک رہتے ہیں مثلاً زمانہ موجود ہے یا معدوم ہے؟ اور حقیقی ہے یا غیر حقیقی ہے؟ ان سے ہمارے تمدّنی۔ اقتصادی۔ معاشی۔ سیاسی عمرانی مسائل نہیں ہو سکتے۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک شخص بھوکا ہے وہ آپ کے پاس آکر روٹی کا طالب ہوا آپ نے اس سے کہا کہ تم تو صرف روٹی کے طالب ہو میں تم کو یہ بتا سکتا ہوں کہ گیہوں کے عناصر ترکیبی کیا ہیں۔ چنانچہ آپ نے پہلے گیہوں کے اجزا کی تشریح کی۔ پھر علم نباتات پر لکچر دیا۔ اور اس کے بعد یہ بتایا کہ روٹی جب معدہ میں جاتی ہے تو اس کا نشاستہ مٹھاس میں کس طرح تبدیل ہو جاتا ہے اور جگر کیا فعل کرتا ہے پھر اس سے اخلاط اربعہ بنتے ہیں وغیر ذالک۔

تو سوال یہ ہے کہ کیا آپ کی تقریر سے اس کی بھوک کا مسئلہ حل ہو گیا کیا اس کا خالی پیٹ بھر گیا؟ اب پڑھئے اس شعر کو ؎

آدم کو ثبات کی طلب ہے
دستورِ حیات کی طلب ہے

پانچواں شعر:- اے نوجوان! جس بات سے دنیا کی تاریکی دور ہو سکتی ہے یعنی انسانی مشکلات کا خاتمہ ہو سکتا ہے وہ فلسفہ نہیں ہے (کہ وہ محض ظن و تخمین کا نام ہے) بلکہ مومن کی اذان یعنی نکتۂ توحید الٰہی ہے

چھٹا۔ ساتواں۔ آٹھواں شعر:- اب اقبال اس نوجوان کو بعض حقائق کی تلقین کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ میں برہمنوں کی اولاد ہوں۔ میرے آبا و اجداد کشمیری برہمن تھے اور بت پرست تھے تو میں زادہ ہے۔ میں برہمن زادہ ہوں اس لئے فلسفہ تو میری رگ رگ میں سمایا ہوا ہے کیونکہ برہمنوں کا مشغلۂ حیات فلسفہ ہی ہے۔

نواں شعر:- اگرچہ میں دنیاوی اعتبار سے کوئی عروج حاصل نہ کر سکا اور دنیا میں ترقی کا فن مجھے نہیں آتا لیکن فلسفہ سے اچھی طرح واقف ہوں بلکہ دنیا میں آج تک جتنے فلسفیانہ مدارس فکر (Philosophical Systems) قائم ہوئے ہیں سب پر ناقدانہ نظر ڈال چکا ہوں۔

دسواں شعر:- اس لئے میں اپنی ساری عمر کے تجربہ کا خلاصہ تجھ سے بیان کرتا ہوں کہ

اگیارھواں شعر:- انجام خرد ہے بے حضوری؟ یعنی عقل کا منتہیٰ یہ ہے کہ انسان انجام کار اللہ سے دور ہو جاتا ہے اور الحاد اور انکار میں نہیں تو تشکیک میں تو ضرور مبتلا ہو جاتا ہے اور آدمی کتنا ہی بڑا فلسفی کیوں نہ ہو محض فلسفہ سے زندگی کے پیچیدہ مسائل حل نہیں کر سکتا

زندگی سے دوری کے معنی یہ ہیں کہ فلسفی یہ تو بتا سکتا ہے کہ علم اور عالم اور معلوم میں کیا نسبت ہے یا علم حاضر عند المدرک کو کہتے ہیں یا مابہ الانکشاف کو۔ لیکن وہ زندگی سیاسی معاشی معاشرتی اور تمدنی مسائل کا حل نہیں کر سکتا۔

بارھواں شعر:۔ نیز فلسفہ میں انہماک انسان کی قوت عمل کو مردہ کر دیتا ہے اور فلسفی آدمی حجرہ میں بیٹھ کر غور و فکر تو کر سکتا ہے لیکن نہ تزکیۂ نفس کر سکتا ہے نہ اس میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔

تیرھواں شعر:۔ لیکن فلسفہ کے بالمقابل دین ایک حقیقت ثابتہ ہے دین یعنی اسلام فلسفہ کی طرح چند نظریات یا قیاسات یا ظن و تخمین کا نام نہیں بلکہ وہ مسلک زندگی کی تقویم ہے یعنی زندگی بسر کرنے کا دستور العمل ہے اور حیات انسانی کے لئے مکمل ضابطہ ہے۔

دین اسلام تو حضرت ابراہیمؑ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی کمالات کا آئینہ ہے اس دین میں ان قدسی نفوس کی عظمت پوشیدہ ہے اگر کسی کو مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام سے آگاہی مقصود ہو تو دین اسلام اور اس کے اصول و فروع کا مطالعہ کرے یا کم از کم بخاری شریف یا مسلم شریف یا ترمذی شریف ہی غور سے پڑھ لے۔

چودھواں شعر:۔ پس اے مسلمان نوجوان! ہیگل اور برگساں یعنی فلسفۂ مغرب سے قطع تعلق کر کے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی یعنی حدیث شریف کا مطالعہ کر۔ یہ مت دیکھ کہ مکمائے

مغرب کیا کہتے ہیں کیونکہ وہ خود اندھے ہیں اور اندھا دوسروں کو راستہ نہیں دکھا سکتا بلکہ یہ کہ فلاں مسئلہ میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں اے علی کے بیٹے! تو بو علی سینا کے فلسفہ کا کب تک اتباع کرتا رہے گا۔

نوٹ:۔ پور علی اور بو علی میں بہت عمدہ شاعرانہ لطف بیان ہے ان لفظوں کے لفظی معنی بھی ہو سکتے ہیں اور مرادی معنی بھی۔ لفظی معنی تو علی کا بیٹا اور علی کا باپ لیکن مراد ہے وہ سید زادہ اور مشہور فلسفی بو علی سینا۔

آخر میں علامہ اس نوجوان کے واسطے سے مسلمان نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ اگر دیدۂ راہ بیں حاصل نہ ہو یعنی اگر تمہیں اسلامی علوم سے آگاہی نہ ہو تو پھر تمہارے لئے محفوظ راستہ یہ ہے کہ تم بخاری کے بجائے قرشی کو اپنا رہنما بناؤ۔

بخاری کے لغوی معنی ہیں۔ بخارا کا رہنے والا مرادی معنی ہیں ابو علی بن سینا[1] کیونکہ وہ مدتوں امیر بخارا کا طبیب رہا۔ قرشی کے لغوی معنی ہیں قبیلہ قریش سے تعلق رکھنے والا مرادی معنی ہیں دین اسلام کا جاننے والا۔

یہ بڑی سبق آموز نظم ہے اور اس میں اقبال نے دین اور فلسفہ دونوں کا بہت عمدگی کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ اور اس ضمن میں اپنا زاویہ نگاہ بھی واضح کر دیا ہے یعنی اقبال فہمی کے لئے یہ نظم بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے اس لئے غور سے مطالعہ کرنا چاہئے۔

---

[1] ابو علی سینا دسویں صدی عیسوی میں دنیائے اسلام کا نامور حکیم اور فلسفی گذرا ہے منطق فلسفہ اور طب میں ید طولیٰ رکھتا تھا اس نے ارسطو کے فلسفہ کی شرح لکھی ہے اس کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں اشارات اور شفا، محقق طوسی نے اشارات کی شرح لکھی ہے اور یہ کتاب عام طور پر ہمارے عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔

زمین و آسماں

ممکن ہے کہ تو جس کو سمجھتا ہے بہاراں
اوروں کی نگاہوں میں وہ موسم ہو خزاں کا
ہے سلسلہ احوال کا ہر لحظہ دگرگوں
اے سالکِ رہ فکر نہ کر سود و زیاں کا
شاید کہ زمیں ہے یہ کسی اور جہاں کی
تو جس کو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا

شرح مشکلات

دنیا میں انسانوں کے زاویۂ نگاہ باہم مختلف ہوتے ہیں۔ زید کی نظر میں جو چیز مفید اور اچھی ہے بکر کی نگاہ میں وہی چیز مضر اور بری ہے۔ علاوہ بریں جو شئے زید کے لئے مضر ہے عین ممکن ہے کہ وہی شئے بکر کے لئے مفید ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ حالات کے بدلنے سے انسان کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے اور زاویۂ نگاہ کے بدل جانے سے حالات بدل جاتے ہیں لہٰذا جو بات آج موجب نقصان نظر آتی ہے وہی بات کل باعث نفع بن جاتی ہے مثلاً ایک آدمی کے مکان میں نیم کا پیڑ کھڑا ہے وہ اسے بہت برا سمجھتا ہے کیونکہ پتے بھی

گرتے ہیں۔ اور دھوپ بھی نہیں آتی۔ وہ شخص اس درخت کو کٹوانے کی فکر میں ہے۔ قضارا وہ مرضِ سودا میں مبتلا ہو جاتا ہے اور طبیب اسے نیم کی چھال اور نمکولیوں کا مغز استعمال کرنے کا مشورہ دیتا ہے تو وہی درخت جو کل تک برا تھا آج بیحد مفید بن جاتا ہے۔

بس اسی طرح یہ سمجھو کہ تم آسمان کو اونچا سمجھتے ہو۔ ممکن ہے اس کے اوپر کوئی اور عالم ہو اور یہ آسمان اس عالم کے لئے بمنزلۂ زمین ہو یعنی جیسے تم اونچا سمجھتے ہو۔ بالائے آسمان رہنے والے اسی کو نیچا سمجھتے ہیں۔

مسلمان کا زوال

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسّر تونگری سے نہیں
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے۔ تونگری سے نہیں

شرح مشکلات نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ اقبال کی رائے میں مسلمان کے زوال کا باعث یہ نہیں کہ وہ بے زر ہے بلکہ یہ ہے کہ اس میں شانِ فقر نہیں پائی جاتی۔

خودی کی طرح اقبال نے فقر کو بھی بڑی اہمیت دی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ خودی کی تربیت اور اس کا مرتبۂ کمال تک پہنچنا سب کچھ فقر پر منحصر ہے اس لئے مختصر طور پر فقر کو بھی سمجھ لینا چاہئے۔

فقر کے ایک معنی تو مفلسی کے ہیں مثلاً کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا۔ قریب ہے کہ مفلسی انسان کو کافر بنا دے یعنی مفلسی انسان کو کفر کے قریب پہنچا دیتی ہے۔

فقر کے دوسرے معنی ہیں صرف اللہ پر بھروسہ کرنا اور دنیا سے بے نیاز ہو کر اپنی تمام حاجات اللہ کی درگاہ میں پیش کرنا یہ وہ صورت ہے کہ مردِ مومن پہلے دنیا کو فتح کرتا ہے پھر اللہ کے لئے اس دنیا اور اس کی دلفریبی اور لذت پر لات مارتا ہے اگرچہ روم اور شام۔ عراق اور ایران اس کے باجگذار ہوتے ہیں۔ لیکن وہ بوریئے پر سوتا ہے اور پیوند لگا ہوا کرتا پہنتا ہے۔

دوسری مثال۔ سارا عرب اس کے زیرنگیں ہوتا ہے لیکن ایک ایک مہینہ تک اس کے چولھے میں آگ نہیں جلتی اور جس کمرے میں وہ رہتا ہے اس میں ایک چارپائی۔ ایک بوریا اور ایک پانی کے گھڑے کے علاوہ اور کوئی سامان نہیں ہوتا۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے الفقر فخری میں اپنی شان فقر پہ فخر کرتا ہوں یا فقر میرے لئے باعث فخر ہے۔ یعنی جس طرح دنیا کے بادشاہ اپنی دولت۔ فوج اور طاقت پہ فخر کرتے ہیں میں فقر پہ فخر کرتا ہوں کہ دنیا میں کسی کا محتاج نہیں ہوں صرف اللہ کا محتاج ہوں۔

فقر۔ اقبالؔ کی اصطلاح بھی ہے اور مجھے افسوس ہے کہ میں اس جگہ اس کی پوری تشریح نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے اس کی تشریح میں دو سو صفحے کی کتاب انگریزی میں لکھی ہے جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی بس دو لفظوں میں اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ فقر کے تیسرے معنی اقبالؔ نے روح اسلام کے لئے ہیں اور یہی وہ جوہر ہے جس کی بدولت خودی مرتبۂ کمال تک پہنچتی ہے تو اب اقبالؔ کی زبان سے اس کی تشریح سنو۔ اقبالؔ کہتے ہیں۔

فقر قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل ندیدم جز بذکر

یعنی فقر دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ذکر اور فکر۔

ذکر کے معنی۔ یاد کرنا۔ یاد رکھنا۔ دھیان رکھنا۔ ہر گھڑی مدنظر رکھنا محبت کرنا۔ اطاعت کرنا۔ تعمیل احکام کرنا۔ فرمانبرداری کرنے کے ہیں۔ اور فکر کے معنی: تدبر کرنا۔ غور کرنا۔ تعقل کرنا۔ تفقہ کرنا۔ غور و خوض کرنا استدلال۔ استنباط اور استخراج کرنا۔ ادراکِ حقائق کرنا اور جزئیات سے کلیات کرنے کے ہیں۔

یہ دو لفظ اس آیت سے ماخوذ ہیں۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ

اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۔ (سورہ آل عمران)

یعنی صاحبانِ عقل وہ لوگ ہیں جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یعنی ہر حالت میں اور ہر وقت اللہ کو یاد کرتے ہیں یعنی ہر حال میں اس کی اطاعت کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں اور اس غور و فکر کی بنا پر بے اختیار یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو نے اس کائنات کو بلا مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ ایک فقر تو وہ ہے جس کی تلقین دنیا کے اکثر مذاہب کرتے ہیں یعنی رہبانیت یا ترک دنیا لیکن اسلام جس فقر کی تعلیم دیتا ہے وہ رہبانیت نہیں بلکہ وہ ذکر اور فکر کے امتزاج کا نام ہے یعنی مومن اللہ سے محبت کرتا ہے اور بوجہ محبت اس کے احکام کی اطاعت کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اپنی عقل خداداد سے کام لے کر کائنات میں غور و فکر کرتا ہے اور تحقیق سے کام لے کر عناصر پر حکمرانی کرتا ہے یعنی فقر کا مفہوم ہے اللہ کی اطاعت اور کائنات پر حکومت۔

میں نے خودی کی طرح فقر کا مفہوم بھی قدرے وضاحت کے ساتھ ذکر کر دیا ہے کیونکہ اقبالؔ کے کلام میں خودی اور فقر یہ دو اصطلاحیں اکثر استعمال ہوئی ہیں۔

یہی وہ فقر ہے جس کی بدولت خودی مرتبۂ کمال کو پہونچتی ہے چنانچہ اقبالؔ خود لکھتے ہیں۔

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ

اس جگہ ایک نکتہ اور بھی واضح کر دوں ابتداء میں ہم لکھ چکے ہیں کہ

ع خودی ہے تیغ فساں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

یعنی خودی کو اگر تلوار فرض کیا جائے تو توحید بمنزلہ فساں یعنی سے ہے یہاں انہوں نے کہا ہے کہ

ع چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی

یعنی خودی تیغ ہے فقر سان ہے۔

پس ثابت ہوا کہ توحید اور فقر ہم معنیٰ ہیں کیونکہ خودی کے حق میں دونوں کا اثر یکساں ہے توحید بھی سان ہے اور فقر بھی۔

بات یہ ہے کہ غور سے دیکھو تو جب تک آدمی صحیح معنوں میں موحّد نہ ہو اس میں شانِ فقر پیدا ہی نہیں ہو سکتی یعنی دراصل موحد اور فقر مرادف الفاظ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ جب کسی مسلمان میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے تب وہ موحّد کامل بنتا ہے۔

اب نظم کا مطلب بیان کرتا ہوں اور امید ہے کہ بآسانی سمجھ میں آجائیگا

پہلا شعر:۔ اگرچہ دولت بھی اس دنیا میں ہماری ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے لیکن جو عزت اور وجاہت ایک انسان کو شانِ فقر سے حاصل ہو سکتی ہے وہ دولت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

دوسرا شعر:۔ اگر مسلمان نوجوان اپنے اندر بہادری اور غیرت کا

جذبہ پیدا کرلیں تو قوم مفلسی کے باوجود دنیا میں سکندری یعنی حکمرانی کرسکتی ہے حکومت کے لئے دراصل دولت اور کثرتِ افراد درکار نہیں بلکہ جسارت حوصلہ۔ بے جگری اور غیرتِ دینی درکار ہے یعنی دین پر مرمٹنے کا جذبہ۔

تیسرا شعر:۔ اگر دنیا میں مسلمانوں کا زوال ہوا تو وہ بے زری سے نہیں ہوا بلکہ اس کا سبب کچھ اور ہے جس کو تو خود سمجھتا ہے یعنی بے غیرتی[1] اسی خیال کو اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے۔

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن
اے مسلماں مردن است ایں زیستن

چوتھا شعر:۔ اگر دنیا میں میری عزت ہوئی یا میرا جوہر نمایاں ہوا تو یہ شرف مجھے تونگری سے حاصل نہیں ہوا۔ کیونکہ دولت میرے پاس ہے ہی نہیں بلکہ یہ عزت مجھے قلندری سے حاصل ہوئی ہے۔ واضح ہو کہ اقبالؔ نے قلندری کو فقر کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

---

[1] موجودہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی دینی بے غیرتی کی بہترین مثال ہے جس کی تشریح بالکل لاحاصل ہے کیونکہ وہ تو اظہر من الشمس ہے۔

علم و عشق

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

شرح مشکلات

خودی اور فقر کی طرح عشق بھی اقبال کی خاص اصطلاحوں میں سے ہے انہوں نے اس کی توصیف میں ہر کتاب میں متعدد اشعار لکھے ہیں مولانا روم کی طرح اقبال بھی عشق کے بہت مداح ہیں اور اس کو علم یا عقل پر فضیلت دیتے ہیں۔

اقبال کی رائے میں عشق انسانی زندگی میں سب سے بڑی قوت محرکہ ہے اور اس کی بدولت انسان محیر العقول کارنامے انجام دے سکتا ہے خودی کی پرورش اور تربیت محض عشق پر موقوف ہے۔ بال جبریل سے صرف ایک شعر نقل کرتا ہوں جس سے عشق کا مقام واضح ہو سکتا ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

عشق سے اقبال کی مراد دراصل عشق رسولؐ ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جب تک کسی فرد یا جماعت کو کسی ذات یا کسی شئے سے عشق نہ ہو وہ ترقی نہیں کر سکتی اور جب کسی فرد یا قوم میں یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے یعنی کسی نصب العین کے حصول کا سودا سر میں سما جاتا ہے تو وہ قوم ناممکن کو ممکن بنا کر دکھا دیتی ہے جب تک کسی کو کسی سے عشق نہ ہو وہ شخص سرگرم عمل نہیں ہو سکتا فرہاد نے پہاڑ کاٹ کر رکھ دیا یہ کس قدر ناممکن کام تھا جو اس نے کر دکھایا محض اس لئے کہ ایک شخص (شیریں) کے عشق نے اس میں یہ طاقت پیدا کر دی تھی۔

اس مقصد کے حصول کے لئے اقبال نے اپنی قوم کو عشق رسول کا سبق دیا اور کلام اقبال شاہد ہے کہ سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۳۸ء تک وہ اسی سبق کو مختلف

طریقوں سے پڑھاتے رہے اور ان کے کلام میں جو تاثیر پیدا ہوئی وہ اسی جذبہ کا نتیجہ تھی۔

اقبال کہتے ہیں کہ انسان میں دو قوتیں ہیں۔ علم اور عشق یہ دونوں ضروری ہیں لیکن عشق کو علم پر تفوق حاصل ہے اور اس نظم میں انہوں نے اسی نکتہ کو بڑے دلپذیر انداز میں بیان کیا ہے۔

پہلا شعر:۔ ارباب علم کہتے ہیں کہ اصحاب عشق دیوانے ہوتے ہیں یعنی ایسی باتیں کرتے ہیں جو عقل کے خلاف ہوتی ہیں اس کے جواب میں اصحاب عشق کہتے ہیں کہ علماء یعنی حکماء و فلاسفہ ساری عمر قیاس اور گمان کی وادیوں میں سرگرداں رہتے ہیں اقبال عشاق کے ہمنوا ہو کر عقل سے کہتے ہیں کہ اگر تم حقیقت سے آشنا ہونا چاہتے ہو تو کتابوں کے کیڑے مت بنو کیونکہ معرفت کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتی مثلاً کوئی فلسفی آج تک یہ نہ بتا سکا اور نہ بتا سکتا ہے کہ خدا کیا ہے۔؟ انسان کیا ہے؟ یہ کائنات کیسے پیدا ہوئی؟ روح کیا ہے؟ اور خدا روح اور کائنات میں رشتہ کیا ہے؟ مختصر یہ کہ علم تو حجابات پیدا کرتا ہے۔ اگر ایک سوال کا جواب دیتا ہے تو اس جواب سے دس مزید سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً کوئی منطقی آج تک یہ نہ بتا سکا کہ علم کی ماہیت کیا ہے اور عالم کو علم کیسے حاصل ہوتا ہے۔[1] ہاں عشق سے تمام حجابات دور ہو جاتے

---

[1] اس ایک مسئلہ پر مناطقہ میں چودہ مختلف مذاہب پیدا ہو گئے اور عقل آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ ان میں کون حق پر ہے افسوس کہ اس شرح میں ان مذاہب کی تفصیل نہیں لکھ سکتا۔

ہیں اور حقیقت تک رسائی ہو جاتی ہے یعنی اپنی معرفت علم سے حاصل نہیں ہو سکتی عشق سے حاصل ہو سکتی ہے اسی لئے اس کا مرتبہ عقل سے بلند تر ہے۔

دوسرا شعر:۔ علم سے ہم کو اشیاء کی صفات کا علم حاصل ہو سکتا ہے لیکن ذات شئے کا علم حاصل نہیں ہو سکتا (بقول کانٹ (KANT) عقل کی مدد سے ہم صرف مظاہر کو جان سکتے ہیں حقائق تک رسائی نہیں ہو سکتی)

لیکن عشق کی بدولت انسان صفات کے درجہ سے آگے بڑھ کر ذات کا مشاہدہ کر سکتا ہے مثلاً روح کے آثار و مظاہر کو دیکھ کر ایک منطقی روح کے متعلق کچھ قیاسات پیش کر سکتا ہے لیکن روح کی حقیقت کیا ہے یہ صرف ایک عاشق ہی سمجھ سکتا ہے۔

واضح ہو کہ عاشق سے یہاں اقبال کی مراد فرہاد یا قیس کی قسم کے عشاق نہیں ہیں بلکہ عاشق سے مراد ہے وہ شخص جو اللہ کے عشق میں سرشار ہو اور کسی مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھ کر اس نے تزکیہ و تصفیۂ نفس کر لیا ہو مثلاً حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت فاروق اعظمؓ، حضرت مولانا رومؒ، حضرت علامہ تیمیہؒ، حضرت نواب صدیق حسنؒ بھوپالی، حضرت مجدد الف ثانیؒ وغیرہم

الغرض عشق کی بدولت یہ کائنات زندہ ہے اور اس میں جو عمل الترقا

لہ کانٹ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "تنقید عقل خالص" میں اس مسئلہ کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے انگریزی میں مظاہر کے لئے (PHENOMENA) اور حقائق کے لئے (NOUMENA) کی اصطلاحیں مستعمل ہیں۔

نظر آتا ہے سب عشق کا کرشمہ ہے عشق سے قلب کو اطمینان اور روح کو ثبات حاصل ہوتا ہے علم تو شکوک اور شبہات پیدا کرتا رہتا ہے ان کا صحیح جواب صرف عشق سے حاصل ہو سکتا ہے۔

تیسرا شعر :- سلطنت۔ حکومت۔ فقر اور دین یہ سب عشق ہی کے معجزات یعنی کارنامے ہیں اور بڑے بڑے بادشاہ ارباب عشق کے سامنے غلاموں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے دور کیوں جائیے۔ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کر لیجئے۔ سلطان شمس الدین التمش حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے سامنے بڑے ادب کے ساتھ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا تھا اسی طرح سلطان علاؤ الدین خلجی اس آرزو میں رہا کہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدینؒ اولیاء کبھی اس کے دربار میں تشریف لائیں یا اسی کو حاضری کی اجازت دیں لیکن اس کی یہ آرزو پوری کبھی نہ ہو سکی اسی لئے اقبالؔ نے یہ لکھا ہے۔

پادشاہاں در قباہائے حریر
زرد رو از سہم آں عریاں فقیر

الغرض عشق اس کائنات میں سب سے بڑی طاقت ہے عاشق عناصر پر حکمراں ہوتا ہے۔ زمین و زماں۔ مکین و مکاں سب عشق ہی کی بدولت اپنی اپنی جگہ قائم ہیں عشق سے ظن و تخمین کا ازالہ ہو جاتا ہے اور یقین پیدا ہو جاتا ہے اور یقین سے انسان کامیابی حاصل کر لیتا ہے خواہ وہ دینی ہو یا دنیاوی ہو چنانچہ اقبال لکھتے ہیں۔

یقیں پیدا کر اے غافل! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

چوتھا شعر:۔ علم یا عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی دنیا میں عیش و عشرت کے سامان مہیا کرے لیکن عشق یا محبت کی شریعت (قانون) میں یہ بات حرام ہے عقل کی نظر میں انسان کو طوفان سے بچنا چاہیئے۔ اور ساحل یعنی عافیت اختیار کرنی چاہیئے لیکن اس کے برعکس محبت کی شریعت میں لذت ساحل (عافیت کی زندگی) حرام ہے یعنی عشق آدمی کو عقل کے خلاف راستوں پر چلاتا ہے چنانچہ بانگ درا میں اقبالؔ کہتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

الغرض عشق کا قانون یا طریقہ عمل کے ضابطہ یا دستور کے بالکل خلاف ہے مثلاً عقل کہتی ہے کہ کھیتی کر کے خرمن جمع کرو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ لیکن عشق کہتا ہے کہ زندگی کی اعلیٰ اقدار کے لئے اولیٰ چیزوں مثلاً مال و دولت۔ گھر بار سب کو قربان کرو[1]۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عقل کتابوں کا نتیجہ ہے یا کتابوں سے پیدا ہوتی ہے اور عشق خود کتابوں کی ماں ہے یعنی کتابی علوم اس کا نتیجہ ہیں۔

نوٹ:۔ اگرچہ میں حتی الوسع اقبالؔ کے مفہوم کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن اس کی بعض تراکیب اس قدر جامع اور بلیغ ہوتی

---

[1] چنانچہ صدیق اکبرؓ نے دو مرتبہ اپنا سارا گھر بار اور کل اثاثہ حیات اللہ کی راہ میں قربان کر دیا جب ہی تو صدیق اکبرؓ کا لقب پایا جس پر ساری کائنات کو رشک آیا۔

ہیں کہ جب تک صفحے سیاہ نہ کئے جائیں مطلب واضح نہیں ہوتا بمثال کے طور پر اس نظم کے آخری مصرع پر غور کیجئے جو لطف اس میں ہے کہ

ع علم ہے ابن الکتاب عشق ہے اُمّ الکتاب

وہ اس کی شرح سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ "ام الکتاب" کی ترکیب میں قرآن مجید کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ قرآن مجید کو اُم الکتاب کہتے ہیں یہاں اقبال نے اس ترکیب سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ عشق ام الکتاب ہے یعنی عاشق (مومن) حکما کی کتابوں سے بے نیاز ہوتا ہے کیونکہ عشق اس کو قرآن حکیم کی روح سے آشنا کر دیتا ہے اور یہ کلام ربانی خود جملہ علوم سکھا دیتا ہے چنانچہ مولانا رومؒ نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

بینی اندر خود علومِ انبیاء،
بے کتاب و بے معین و اوستا،

یعنی جو شخص اللہ کی محبت اختیار کر لیتا ہے اس کو تمام علوم آسمانی بغیر کسی کتاب یا استاد کی مدد کے حاصل ہو جاتے ہیں۔

ایک اور مخفی مفہوم بھی اس ترکیب سے سمجھ میں آسکتا ہے وہ یہ کہ خدا سے محبت کا طریقہ ام الکتاب سے حاصل ہوتا ہے یعنی قرآن مجید انسان کو اللہ سے محبت کرنا سکھا سکتا ہے۔

غرض عالم کتابوں کا محتاج ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا دل بیدار نہیں ہوتا لیکن عاشق کتابوں کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ اس کو سرچشمۂ علم یعنی قرآن مجید سے نسبت قلبی حاصل ہوتی ہے اور یہ نسبت اس کے قلب کو بیدار کر دیتی ہے اور

وہ جملہ علوم سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

اجتہاد

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذّتِ کردار، نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ہندی مسلمانوں کے دینی ذوق کے فقدان پر ماتم کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں طلب علم، تحقیق اور ریسرچ کا مذاق بالکل نہیں رہا۔ حالت یہ ہو گئی ہے کہ جو لوگ۔

پہلا شعر:۔ دینی علوم پڑھتے ہیں۔ وہ صرف درسی کتابوں کے

مطالعہ کو کافی سمجھتے ہیں۔ دین اسلام میں جو حکمت ہے، شریعت میں جو نکات اور اسرار مخفی ہیں ان کی تحقیق کا کسی میں ذوق نہیں ہے نہ کہیں عمل کی طرف رغبت نظر آتی ہے۔ نہ علماء میں غور و فکر کا مادّہ دکھائی دیتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اب رہے صوفی (حلقۂ شوق) تو ان میں بھی جرأتِ غور و خوض نہیں ہے۔ افسوس! یہ سب غلامی اور کورانہ تقلید (مثلاً قادری چشتی۔ حنفی۔ شافعی حنبلی۔ مالکی۔ قادیانی۔ رضائی بہروردی وغیرہ) اور ذوقِ تحقیق کے زوال کا نتیجہ ہے۔

تیسرا شعر:۔ اور جو لوگ علم دین پڑھتے ہیں ان کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو تو دین کے سانچے میں ڈھالتے نہیں بلکہ دین کو اپنے خیالات کے تابع بناتے رہتے ہیں۔ اور قرآن مجید من گھڑت تاویلات کرتے رہتے ہیں۔

چوتھا شعر:۔ غلامی نے ان کی فطرت اس درجہ مسخ کر دی ہے کہ کتاب اللہ سے کفار کی غلامی کے جواز کی دلیلیں تلاش کرتے ہیں۔ گویا ان کے اس طرزِ عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی رائے میں کتاب اللہ ناقص ہے کیونکہ وہ مومنوں کو غلامی کا طریقہ نہیں سکھاتی اس شعر میں ان دنیا پرست علماء کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے انگریزوں اور روسیوں کافروں کی حکومت کو قرآن و حدیث کی رو سے مسلمانوں کے لئے رحمت قرار دیا اور مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ اِن دشمنانِ دین کی حمایت کریں۔

واضح ہو کہ مستشرق فرانسس رابنسن نے جناب احمد رضا صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ " احمد رضا بریلوی انگریزی حکومت کے حامی رہے انہوں نے پہلی جنگ عظیم میں بھی انگریزی حکومت کی حمایت کی۔ اس طرح تحریک خلافت میں بھی ۱۹۲۱ء میں وہ انگریز کے حامی تھے۔ نیز انہوں نے بریلی میں ان علماء کی کانفرنس بھی بلائی جو تحریک ترکِ موالات کے مخالف تھے۔

(INDIAN MUSLIMS ص ۴۴۳ مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی)

(:)

شکر و شکایت

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

(:)

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے اللہ کے بارے میں اپنے درد دل کا اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ کہ اے مولا! اگرچہ میں ایک بندۂ ناداں ہوں لیکن تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے اپنی محبت مجھے عطا فرمائی ہے اور میری روح کو عالم بالا سے وابستہ کر دیا ہے اور اسی لئے میرے دل میں مذہب و ملت کی خدمت کا جذبہ موجزن ہے۔

دوسرا شعر:۔ چنانچہ اسی جذبہ کی بدولت میں نے مسلمانوں کو قرآن مجید کا پیغام سنایا اور ان کے دلوں میں اسلام کو دنیا میں سربلند کرنے کا ولولہ پیدا کر دیا۔

تیسرا شعر:۔ اسی جذبہ کا نتیجہ ہے کہ اس زور مادیت میں جو لوگ دین سے کچھ بھی نسبت رکھتے تھے۔ وہ میرے کلام کو ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

چوتھا شعر:۔ لیکن بڑے رنج کے ساتھ میں یہ بات تیری جناب میں عرض کرتا ہوں کہ تو نے مجھے ایسے ملک میں پیدا کیا ہے جس ملک کے لوگ نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ روزہ بھی رکھتے ہیں۔ لیکن انگریز کی غلامی پہ راضی ہیں اور انگریز کی حمایت جان و دل سے بریلوی حضرات کے علماء کرواتے تھے۔ تعجب ہے کہ وہ کلمہ تو تیرا پڑھتے ہیں لیکن اطاعت انگریز کی کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ نظم دراصل ایک لطیف شاعرانہ اندازِ بیان کی حامل ہے دراصل اقبال اپنی قوم سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو مسلمان کافر کی غلامی پہ رضامند

ہو اور اس غلامی سے رہائی کی کوشش نہ کرے وہ مسلمان ہی نہیں کیونکہ اللہ کا بندہ۔ انگریز کا بندہ کیسے ہو سکتا ہے۔

ع یا بندۂ خدا بن۔ یا بندۂ زمانہ[1]

ذکر و فکر

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے علّم الاسماء
مقامِ ذکر کمالاتِ رومی و عطّار
مقامِ فکر مقالاتِ بو علی سینا
مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکاں
مقامِ ذکر ہے سبحان ربّی الاعلیٰ

شرحِ مشکلات

ذکر و فکر کے معنیٰ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اقبالؔ اس نظم میں ان کے مفہوم کو اپنے خاص انداز

---

[1] سلطان ٹیپو شہیدؒ نے اسی اصول پر عمل کیا اور حیاتِ جاوید حاصل کر لی اور نظام علی خاں آف حیدر آباد نے انگریزوں کی حمایت کر کے ابدی لعنت خرید لی۔

میں بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ ذکر و فکر دراصل اس سالک یا مومن کی روحانی ترقی کی منزلیں ہیں جس کی شان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا۔ اور اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ (سورہ بقرہ ع ۳) یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی فطرت میں جستجو اور تحقیق کا مادہ ودیعت فرما دیا۔ مقام ذکر کیا ہے؟ اس کا جواب اقبالؔ نے کس قدر دلپذیر انداز میں دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

دوسرا شعر:۔ جب مومن مقام ذکر پر فائز ہوتا ہے تو رومیؒ اور عطارؒ بن جاتا ہے یعنی روحانیت میں بلند مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور جب آدمی مقامِ فکر تک پہنچ جاتا ہے۔ تو بو علی سینا بن جاتا ہے۔

مقالاتِ بو علی سینا سے مراد ان کی فلسفیانہ تصانیف ہیں جن کا ذکر گذر چکا ہے۔ رومیؒ سے مراد اقبالؔ کے روحانی مرشد حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ ہیں جن کی مثنوی حقائق و معارف کا ایک زبردست خزانہ ہے۔ چنانچہ علامہ نے مجھ سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "اگرچہ میں نے یورپ کا سارا فلسفہ پڑھا ہے لیکن دراصل فائدہ مجھ کو دو ہی کتابوں سے ہوا۔ ایک قرآن و حدیث دوسرے مثنوی۔

عطارؒ سے حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ مراد ہیں جن کی مثنوی ہی منطق الطیر بہت مشہور ہوئی۔ یہ اسلامی تصوّف کے بہت بڑے ماہر ہیں چنانچہ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او
ما از پئے سنائی و عطار آمدیم

اقبالؔ نے ان تینوں کی تصانیف سے استفادہ کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں جابجا تصوف کا رنگ جھلکتا ہے اور بالِ جبریل میں تو یہ رنگ بہت نمایاں ہے۔

تیسرا شعر:۔ تیسرے شعر میں اقبالؔ نے بلاغتِ کلام کا اعجاز دکھایا ہے۔ کہتے ہیں کہ

قوتِ فکر کا ثمرہ یہ ہے کہ انسان زمان اور مکان کی ماہیت کو دریافت کرتا ہے یعنی اہم فلسفیانہ مسائل میں غور کرتا ہے اور قوتِ ذکر کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنے خالق کے سامنے سربسجود ہو کر اس احکم الحاکمین کی یا کی بیان کرتا ہے۔ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی۔ یعنی جب مسلمان سجدہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میرا رب تمام عیوب اور نقائص سے پاک ہے اور سب سے اونچا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ذکر اور فکر انسان کی دو بنیادی قوتوں اور طاقتوں (FACULTIES) کا نام ہے۔ جب وہ ذکر میں ترقی کرتا ہے تو رومی اور عطار کی صفت میں جگہ پاتا ہے اور جب وہ فکر میں ترقی کرتا ہے تو فارابی اور بوعلی سینا کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے اور اسلام ایسا دین ہے جو ان دونوں قوتوں کا جامع ہے۔

مُلّائے حرم

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

(٭)

شرح مشکلات یہ ان کم سواد مُلّاؤں سے خطاب ہے جو علم دین حاصل کئے بغیر مسلمانوں کی رہنمائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور مسجدوں میں امامت کر کے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پہلے مصرع میں نہایت لطیف طنز ہے جو لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتا۔ فرماتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ بہت ممکن ہے کہ تو خدا تک پہنچ گیا ہو یعنی تو نے بہت سے روحانی مدارج حاصل کر لئے ہوں۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ تو ابھی تک آدمیت کے مقام پر نہیں پہونچا یعنی تجھے یہ معلوم نہیں کہ انسان کس حد تک ترقی کر سکتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ یہی وجہ ہے کہ تیری نمازیں بالکل جسدِ بے روح کی طرح ہیں نہ ان میں جلال کا رنگ ہے نہ جمال کا۔ اور نہ تیری اذان میں وہ تاثیر ہے کہ مسلمانوں کے مصائب کی تاریک رات ختم ہو۔ اور وہ سحر نمودار ہو

جس کا میں آرزومند ہوں۔[1]

تقدیر

نااہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت
ہے خوار زمانے میں کبھی جوہرِ ذاتی
شاید کوئی منطق ہو نہاں اس کے عمل میں
تقدیر نہیں تابعِ منطق نظر آتی
ہاں ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو
تاریخِ اُمم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی
ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی
بَرّاں صفتِ تیغ دو پیکر نظر اس کی

---

[1] اس شعر میں دو لفظ غور طلب ہیں۔ جلالؔ اور جمالؔ۔ میں اس کی تفصیل تو کر نہیں سکتا صرف اتنا بتانا کافی ہوگا کہ یہ دونوں اللہ کی دو خاص شانیں (ASPECTS) ہیں اور مومن کے اندر ان کا عکس پایا جانا شدید ضروری ہے جلالؔ۔ شان و شوکت۔ قوت۔ حکمت۔ سرداری۔ جمالؔ۔ لطف و کرم۔ رحمت نوازش۔ مہربانی۔ کلمۂ توحید ان دونوں کا جامع ہے۔ لَا اِلٰہَ سے جلال اور اِلَّا اللّٰہُ سے جمال کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔

شرح مشکلات اقبالؔ نے مسئلہ تقدیر پر اس قدر لکھا ہے کہ اگر ان کی تمام کتابوں سے اس موضوع سے متعلق اشعار کو ایک جگہ جمع کر کے ان کی شرح لکھی جائے تو بلا مبالغہ ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے انہوں نے اس مہتم بالشان مسئلہ پر مختلف پہلوؤں سے نگاہ ڈالی ہے چنانچہ اس نظم میں ایک خاص زاویۂ نگاہ پیش کیا ہے۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ اس دنیا میں کبھی کبھی نااہلوں کو طاقت اور حکومت حاصل ہو جاتی ہے اور باکمالوں کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ (جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے)

دوسرا شعر:۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ تقدیر منطق کے تابع نہیں نظر آتی یعنی بعض اوقات ہماری عقل کا تقاضا کچھ ہوتا ہے اور دنیا میں جو کچھ رونما ہوتا ہے وہ بالکل اس کے خلاف ہوتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ لیکن ایک حقیقت ایسی ہے جو ہر اس شخص کے سامنے واضح ہے جو قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کرے اور وہ یہ ہے کہ تقدیر قوموں کے عمل پر نظر رکھتی ہے اور اس کی نظر نہایت تیز ہے۔ ایسی تیز ہے جیسی تلوار کی دھار۔ اور تاریخ سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو قومیں فطرت کے قوانین کی پابندی کرتی ہیں۔ وہ ترقی کرتی ہیں اور جو قومیں نافرمانی کرتی ہیں وہ مٹ جاتی ہیں۔ یعنی فطرت افراد کے گناہوں کو تو کبھی کبھی معاف بھی کر دیتی ہے لیکن ملّت کے گناہوں کو معاف نہیں کرتی۔ اسی خیال کو اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے۔

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
نہیں کرتی دے ملّت کے گناہوں کو معاف

اس کی مثال یوں سمجھو کہ یہ تو ممکن ہے کہ "بچّہ سقّہ" چند روز کے لئے نیرنگیٔ روزگار کی بدولت تخت کابل پر جلوہ گر ہو جائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ بچّہ سقّہ کے ٹائپ کے حکمرانوں کا طویل سلسلہ شروع ہو جائے یا ایک قوم مسلسل بداعمالیوں میں مبتلا رہے اور صفحۂ ہستی سے معدوم نہ ہو جائے چنانچہ عاد اور ثمود کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں اور انشاء اللہ اب انگریزوں کی باری ہے۔

توحید

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
ہیں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قُلْ ھُوَ اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام
آہ! اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہہ
وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

شرح مشکلات توحید مسلمانوں کا پہلا فریضہ ہے۔ توحید کے معنی یہ ہیں کہ اللہ ایک ہے اور اپنی ذات و صفات میں وہ یکتا ہے بس اللہ ہی کو ہر چیز کا مالک و مختار جانیں اور یہ سمجھیں کہ اس کے سوا پیغمبر ہوں یا پیر، فرشتے ہوں یا شہید، کسی کا اس کے کارخانۂ قدرت میں کچھ اختیار نہیں سب اس کے سامنے عاجز اور بے اختیار ہیں۔

علّامہ اقبالؔ نے اس نظم میں اسلامی عقیدۂ توحید کے حقائق و معارف بیان کئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ

ایک زمانہ تھا جب مسلمان قرآن و حدیث کو سمجھ کر پڑھتے تھے اور توحید کے مقتضا پر عمل کر کے دنیا میں قوت اور شوکت کے مالک تھے۔ مقتضا پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو زبان سے کہتے تھے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی اطاعت نہیں کرتے تو واقعی ان کا طرزِ عمل بھی یہی تھا۔

لیکن آج ۱۹۵۰ء میں کیا حالت ہے؟ مسلمانوں نے توحید کے اقتضا پر عمل کرنا تو چھوڑ ہی دیا ہے اس کا مفہوم بھی عام مسلمانوں کے دماغوں سے نکل گیا ہے۔ اللہ کے سوا انبیاؑ۔ اولیاؒ کو اٹھتے بیٹھتے پکارنے لگے اور اب یا اللہ کے بجائے یا رسول اللہؐ۔ یا علیؓ۔ یا حسینؓ۔ یا خواجہ۔ یا غوث۔ یا پیران پیر کے نعرے لگانے لگے اور ان کو حاضر ناظر سمجھ کر اپنا حاجت روا مشکل کشا سمجھنے لگے۔

اب رہے علماء تو (الّا ماشاء اللہ) ان کی کیفیت یہ ہے کہ عقیدۂ توحید ان کی نظر میں علم کلام کا ایک مسئلہ بن گیا ہے یعنی وہ صرف اس پر اکتفا کرتے ہیں کہ شرح مقاصد اور شرح مواقف میں توحید سے متعلق جو علمی اور منطقی بحثیں ہوئی ہیں ان کا اجمالی علم حاصل ہو جائے۔ توحید کا تقاضا کیا ہے اس سے ان کو بھی کوئی سروکار نہیں ہے۔

واضح ہو کہ علم کلام وہ علم ہے جس میں اسلامی عقائد کا فلسفہ بیان کیا جاتا ہے اور ان کو عقل کے مطابق ثابت کیا جاتا ہے اور غیروں کے

اعتراضات کے جواب دیئے جاتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ اقبال کا کہنا ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اللہ کی ذات اور صفات میں منطقی بحثوں سے منع فرما دیا تھا اس کے بجائے یہ حکم دیا تھا کہ ہم توحید پر ایمان لاکر اس کے اقتضاء پر عمل کریں ہم نے ارشادِ نبویؐ کو پسِ پشت ڈال دیا اور اس کے برعکس طریقہ اختیار کیا چنانچہ آج کیفیت یہ ہے کہ توحید کے اقتضاء پر مسلمانوں کے کسی ملک میں عمل نہیں ہوتا۔ ہاں مسئلہ توحید پر منطقی بحثیں ضرور ہوتی ہیں جن سے فریاد قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

دوسرا شعر:۔ توحید ایک روشنی ہے اور اگر اس سے بداعمالی کی تاریکی دور نہ ہو تو خود مسلمان سے مسلمان کا مقام پوشیدہ رہے گا یعنی توحید کے اصول پر عمل کرنے سے مسلمان اپنے اصلی مقام یعنی خلافتِ الٰہیہ پر فائز ہو سکتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ اے مسلمانوں نے لیڈر! میں نے تیری فوج دیکھی ہے ان کے پاس سب کچھ ہے لیکن توحید کی تلوار نہیں ہے۔

چوتھا شعر:۔ افسوس نہ ہمارے علماء اس راز سے واقف ہیں نہ فقہاء۔ کہ جب تک قوم میں کردار کی وحدت پیدا نہ ہو۔ افکار کی وحدت اگر پیدا بھی ہو جائے تو کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ اور حقیقت حال یہ ہے کہ اب مسلمانوں میں نہ وحدتِ کردار ہے نہ وحدتِ افکار ہے اور آج ۱۹۵۰ء میں تو سیاسی وحدت بھی ختم ہوتی نظر آرہی ہے۔

پانچواں شعر:۔ آخر میں اقبال اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ ہمارے موجودہ امام جو صرف نمازوں میں امامت کرتے ہیں یہ لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں کہ قوم کا مفہوم کیا ہے اور قومیں کیسے برسرِ عروج آتی ہیں اور ان کی امامت و قیادت کیسے کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ قوم کی رہنمائی سے قاصر ہیں۔

نوٹ:۔ میں اس جگہ اقبال کے اس تبصرہ پر اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان دو رکعت کے اماموں سے زیادہ لائق ملامت وہ امام ہیں جو مسجدوں کے دائرے سے باہر مسلمانوں کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ بیشک مساجد کے مُلّا اس حقیقت سے باخبر نہیں کہ قوم کیا چیز ہے؟ اور قوموں کی امامت کیا ہے لیکن ہمارے یہ قائدین اور رہنما جو عالی شان ایوانوں میں صوفوں پر براجمان ہیں۔ یہ بھی تو اس حقیقت سے نابلد ہیں کہ قوم کسے کہتے ہیں اور قوموں کی امامت کیا چیز ہے اور میری رائے میں یہ لیڈر زیادہ قابل ملامت ہیں کیونکہ قوم مسجدوں میں تو بہت کم جاتی ہے دن رات انہی کی کوٹھیوں کا طواف کرتی رہتی ہے ملّاؤں سے واسطہ تو تھوڑی دیر کا ہے سارا وقت تو انہی لیڈروں کی خوشامد میں بسر ہوتا ہے۔

علم اور دین

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم
چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم
وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

شرح مشکلات اقبال کا مقصد یہ ہے کہ صحیح علم دین سے جدا نہیں ہے۔ انہوں نے اس نکتہ کو بہت مشکل انداز سے پیش کیا ہے اور میں اختصار پر مجبور رہوں۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ جو علم قرآن و حدیث کے تابع ہے (دل و نظر کا ندیم ہے) وہ خود اپنے غلط اصول کی اصلاح کر سکتا ہے۔ مثلاً فلسفہ اور سائنس اگر پابندِ قرآن ہو تو انسان کو الحاد اور کفر سے محفوظ

رکھ سکتا ہے اور وہ قوم کے حق میں رحمت بن سکتا ہے یعنی نفع پہنچا سکتا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو یہی فلسفہ اور سائنس بنی آدم کے حق میں لعنت بن جائے گا بلکہ موجبِ ہلاکت۔

دوسرا شعر:۔ کہتے ہیں علم ایک وحدت ہے اور ہمیشہ سے ایک رہا ہے کیوں؟ اس لئے کہ زمانہ ایک۔ حیات ایک۔ کائنات بھی ایک جب کائنات میں ہر جگہ وحدت کارفرما ہے تو علم میں وحدت کیوں نہ ہو لہٰذا یہ کہنا کہ فلاں علم جدید ہے فلاں قدیم ہے۔ کم نظری کی دلیل ہے۔

تیسرا شعر:۔ اب خرد اور نظر دونوں میں مطابقت دکھاتے ہیں اور اس کو ایک مادی مثال سے واضح کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ذرا غنچہ کی طرف دیکھو! اگر نسیم سحر کے ساتھ قطرۂ شبنم شریک نہ ہو۔ اگر خارجی یا مادی مظہر کے ساتھ فیضانِ آسمانی شامل نہ ہو تو چمن میں کسی غنچہ کی پرورش نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اگر انسانی عقل (نسیم) کے ساتھ الہام ربانی (شبنم) شامل نہ ہو تو علم کی صحیح تربیت نہیں ہو سکتی۔

چوتھا شعر:۔ یاد رکھو! وہ علم۔ علم ہی نہیں بلکہ جہالت ہے جس میں مشاہداتِ حکیم (عقل) کے ساتھ تجلیاتِ کلیم (الہام) سے ہمکنار نہ ہو یعنی صحیح اور سچا علم وہی ہے جس کی تصدیق قرآن و حدیث سے ہو سکے۔

الغرض دین اسلام سراپا علم ہے اور علم سراسر دین سے ماخوذ ہے جو علم دین سے ماخوذ نہیں وہ علم ہی نہیں جہالت ہے۔

ہندی مسلمان

غدّارِ وطن اس کو بتاتے ہیں برہمن
انگریز یہ سمجھتا ہے مسلماں کو گداگر
پنجاب کے اربابِ نبوّت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر
آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں ولکم ماندہ دریں کشمکش اندر

شرح مشکلات

اس مختصر نظم میں اقبال نے ۱۹۳۶ء کے ہندی مسلمانوں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے اگرچہ یہ نظم آج سے ۱۵ر پندرہ سال پہلے لکھی گئی تھی لیکن اس کا مضمون آج بھی صحیح ہے۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ برہمن یعنی ہندو تو مسلمان کو غدّارِ وطن سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے خیال کے مطابق مسلمان رہتا تو ہے ہندوستان میں لیکن محبت کرتا ہے عرب سے۔ اور یہ بات ملک و وطن پرستی (نیشنلزم) کی رو سے وہ جرم ہے جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔

اس کا دوسرا قصور یہ ہے کہ اپنی قومیت کی بنیاد وطن پر نہیں رکھتا

جب اس سے دریافت کیا جاتا ہے کہ تم کون ہو؟ تو وہ یہ نہیں کہتا کہ میں ہندی ہوں بلکہ بلا تامل اور برملا یہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔

تیسرا قصور یہ ہے کہ وہ پانی تو پیتا ہے گنگا اور جمنا کا۔ پھل کھاتا ہے ان درختوں کے جو ہندوستان کی مٹی سے اگتے ہیں لیکن نام یہ رکھتا ہے بدیشی۔ زبان بولتا ہے بدیشی۔ لباس پہنتا ہے تو وہ بھی بدیشی۔ کاشی اور پریاگ[1] کو آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ بلکہ ان شہروں میں رہتا ہے لیکن ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ اور مکہ مدینہ کا نام بھی سن لیتا ہے تو تڑپ جاتا ہے اور کچھ نہیں تو جو لوگ وہاں سے واپس آتے ہیں انہیں کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر دل خوش کر لیتا ہے۔ لہٰذا اس کی غدّاری میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

اب رہے انگریز تو وہ مسلمان کو گداگر سمجھتے ہیں کیونکہ نہ اس قوم میں تعلیم ہے نہ فراست۔ نہ تجارت ہے نہ دولت۔ نہ اتحاد ہے نہ طاقت نہ ہمدردی ہے نہ رفاقت۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اس قوم کے اکثر امراء عیاش ہیں۔ اعلیٰ عہدیدار (الّا ماشاء اللہ) دین سے بے گانہ ہیں اور ہماری نقالی میں مست ہیں۔ جاگیردار اوّل درجہ کے ضمیر فروش اور خطابات کے لالچی ہیں۔ اور پروفیسر تو ہمارے افکار و خیالات کی فی الحقیقت گدائی کر رہے ہیں۔ اب رہے لیڈر تو بقول اکبر الٰہ آبادی۔

---

[1] بنارس۔ [2] الٰہ آباد مراد ہے۔

وقع دل سے اثرِ یاس کیا کرتے ہیں
ریزہ ولیوشن ہی فقط یاس کیا کرتے ہیں

جب دیکھو اپنے کالجوں اور اسکولوں کی امداد کے لئے کاسۂ گدائی لے کر ہماری خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں اور ایڈریس کے پردہ میں ہم سے بھیک مانگتے رہتے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ پنجاب میں انگریزوں نے اپنی جرأت و شجاعت اور فوجی حکمت عملی کے بجائے اپنی عیاری و مکاری اور چالبازی سے مسلمانوں کے مقابل میں اپنے لئے جس آلۂ کار کا انتخاب کیا وہ تھے مرزا غلام احمد قادیانی اور احمد رضا خاں بریلوی۔ ان دونوں حضرات نے انگریزوں کے خلاف جہاد کو زبردست حرام کاری اور گناہ کبیرہ بتلایا۔ اور انگریزوں کی وفاداری و حمایت کو فریضۂ شرعی ٹھہرایا۔ اور مسلمانوں کی طاقت کو اور شریعت اسلامیہ کو پاش پاش کرنے کے لئے انگریزوں کے اشارہ پر مرزا نے ۱۹۰۱ء میں نبوت و رسالت کا دعویٰ کر دیا۔ اور احمد رضا خاں بریلوی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدائیت کا درجہ دیدیا اور زمین و آسمان اور تمام مخلوقات کا مالک و مختار بنا دیا۔ جس کی وجہ سے علامہ اقبالؒ نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ مومن کامل کی اولاد آج کافر اور مشرکانہ عقائد کو دین اسلام مانتی ہے۔ جو حقیقت میں انگریزوں کا دین ہے۔ ع کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر!۔ تو مومن کافر بن کر رہے

تیسرا شعر:۔ میرا دل اس صورتِ حال کو دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوتا ہے اور میں منتظر ہوں کہ آوازۂ حق کب اور کس طرف سے بلند ہوتا ہے

آوازۂ حق سے اقبالؔ کی مراد یہ ہے کہ دیکھئے وہ دن کب آتا ہے جب مسلمان اس لائق ہوگا کہ ان تینوں طاقتوں کے سامنے کلمۂ حق بلند کر سکے گا۔

(٭)

آزادیٔ شمشیر کے اعلان پر

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
اس بیت کا یہ مصرعِ اول ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار
ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضے میں یہ تلوار بھی آجائے تو مؤمن
یا خالدِؓ جانباز ہے یا حیدرِ کرارؓ

(٭)

شرحِ مشکلات

جب ۱۹۳۵ء میں حکومت پنجاب نے تلوار کو لائسنس سے مستثنیٰ کر دیا تو اقبالؔ نے مسلمانوں کو اس سلسلہ میں ایک نکتہ سمجھایا تھا کہ اب جبکہ تمہیں تلوار کے لئے لائسنس لینے کی

ضرورت نہیں ہے یعنی تم آزادی کے ساتھ تلوار رکھ سکتے ہو تو اس بات پر غور کرو۔

۱۔ کہ فولاد کی تیز تلوار کیا چیز ہے؟

۲۔ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ توحید کے اسرار دو چیزوں میں پوشیدہ ہیں ایک تو یہی فولاد کی تلوار۔

۳۔ دوسری چیز فقر کی تلوار ہے اور اگر فولاد کی تلوار کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اندر شانِ فقر بھی پیدا ہو جائے تو مومن یا خالدؓ جانباز بن جاتا ہے یا حیدر کرارؓ ہو جاتا ہے۔

جہاد

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جنابِ شیخ کو معلوم کیا نہیں؟
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر
تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں
ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذّت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل
کہتا ہے کون اسے کہ مسلماں کی موت مر
تعلیم اس کو چاہیئے ترکِ جہاد کی
دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگذر

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے انگریزوں کی حمایت کرنے والی جماعت فرقہ قادیانیہ و بریلویہ سے یہ سوال کیا ہے کہ اگر جہاد اور قتال بری بات ہے تو تم لوگ یورپ کو ترکِ جہاد کا مشورہ کیوں نہیں دیتے ؟ آخر مسلمانوں ہی سے کیوں کہتے ہو کہ اے دوستو! اب جہاد کا خیال اپنے دل سے نکال دو ۔ یہ فقرہ اس گوہرِ آبدار سے ماخوذ ہے

اے دوستو! جہاد کا اب چھوڑ دو خیال
دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

پہلا شعر:۔ شیخ نے فتویٰ دیا ہے کہ یہ زمانہ قلم کا ہے یعنی اسلام قلم کے زور سے دنیا کے ادیان پر غالب آئے گا اب مسلمانوں کو جہاد کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ تلوار کارگر ہی نہیں رہی۔

دوسرا شعر:۔ لیکن کیا جناب شیخ اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں کہ مسجدوں میں یہ وعظ بالکل بے سود ہے ؟

تیسرا شعر:۔ مسلمانوں کے پاس تلوار ہے کہاں جو جناب شیخ اسے نیام میں رکھنے کا مشورہ دے رہے ہیں اور اگر کسی مسلمان کے پاس تلوار ہے بھی تو اس کا دل جہاد کے جذبہ سے بالکل خالی ہو چکا ہے کیونکہ انگریزی حکومت صرف اسی مسلمان کو ہتھیار رکھنے کی اجازت دیتی تھی جس کے متعلق اسے یقین ہوتا تھا کہ یہ شخص کبھی اس ہتھیار کو ہمارے خلاف استعمال نہیں کرے گا۔ صرف شیروں کا شکار کر کے ان کی کھالوں سے اپنے "دربارِ ہال" کو سجا لیا کرے گا۔

جس مسلمان کی حالت یہ ہے کہ وہ کافر کی موت مرنا بھی نہیں چاہتا یعنی چارپائی پر بھی مرنا نہیں چاہتا۔ اس بزدل سے کون یہ کہہ سکتا ہے کہ تو ایک مسلمان کی موت مر۔ یعنی درجۂ شہادت حاصل کر۔

نوٹ: مسلمانوں کی اصطلاح میں چارپائی پر مرنا گویا کافر کی موت مرنا ہے اور مسلمان کی موت یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں شہادت حاصل کی جائے چنانچہ دنیائے اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ سلطان ٹیپو شہیدؒ اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ مسلمان کی موت مرے۔ اور نظام علی خاں کافر کی موت مرا بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ سلطان شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید مرے ہی نہیں۔ ہاں ہاں وہ تو زندہ ہیں۔

چوتھا شعر:۔ دراصل جناب شیخ کو۔ اس قوم کو ترکِ جہاد کا مشورہ دینا چاہیئے جس کی خونریزی اور سفاکی سے ایک دنیا تنگ آچکی ہے جس نے بلاوجہ سوڈان اور فلسطین۔ عراق اور ہندوستان۔ میں مسلمانوں کا خون بہایا۔

پانچواں شعر:۔ اقوام یورپ اپنے باطل نظام اور غلط عقائد کی حفاظت کے لئے ہر وقت جنگی تیاریوں میں مشغول ہیں۔

چھٹا شعر:۔ اگر اقوام مشرق کے لئے جنگ، وجدال بری بات ہے تو یقیناً اقوامِ مغرب کے لئے بھی یہ فعل مذموم ہی ہے۔

ساتواں شعر:۔ اس لئے ہم کلیسا کی حمایت کرنے والے علماء سے یہ پوچھتے ہیں کہ اگر تم حق کی اشاعت کر رہے ہو تو یہ کیا بات ہے کہ مسلمانوں

کو جنگ سے بچنے کی تلقین کرتے ہو۔ اور یورپ کو اس فعل سے باز نہیں رکھتے
اگر یورپ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اصولِ زندگی کی حمایت یا استحکام
کے لئے تلوار اٹھا سکتا ہے تو مسلمانوں کو بھی یہ حق ضرور ہی حاصل ہونا چاہئے
کہ ہر دشمن کا تلوار سے منہ توڑ جواب دے۔

قوت اور دین

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخِ اُمم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحبِ نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے طاقت اور دین و مذہب کے باہمی رشتہ کو واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ:۔

پہلا شعر:۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسکندر اور چنگیز ہلاکو خاں اور نادر شاہ اور اسی قسم کے دوسرے فاتحین نے بلا وجہ بنی آدم کا خون بہایا۔

دوسرا شعر:۔ غرض تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوت کا نشہ بہت خطرناک ہوا کرتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ یہ قوت کا نشہ ایسا زبردست سیلاب ہے کہ اس کے آگے عقل اور ایمان۔ علم اور ہنر سب تنکوں کی طرح بہہ جاتے ہیں کوئی چیز حکومت کے نشہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

چوتھا شعر:۔ اگر طاقت کا یہ نشہ دین کے زیر اثر نہ ہو یعنی اگر اس طاقتور حکمراں یا فاتح کے اندر خوف خدا نہ ہو تو وہ تمام دنیا میں ہلاکت برپا کر سکتا ہے لیکن اگر وہ قوت دین کی حفاظت میں صرف کی جائے تو پھر وہی زہر تریاک بن جاتا ہے اور وہ بادشاہ ہر کمزور کا حمایتی اور حق و صداقت کا علمبردار بن جاتا ہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ فاروق اعظم[1] رضی اللہ عنہ

---

[1] جناب فاروق اعظمؓ کا زمانۂ خلافت بلا شبہ بنی آدم کے حق میں رحمت تھا جب آپ بیت المقدس کے گرجہ میں تشریف لے گئے تو وہاں نماز کا وقت آگیا۔ نصاریٰ نے عرض کیا کہ آپ یہیں نماز پڑھ لیجئے لیکن آپ نے یہ کہہ کر گرجہ کے اندر نماز پڑھنے سے انکار فرمایا کہ ممکن ہے میرے بعد مسلمان اس گرجہ کو مسجد قرار دے کر تم لوگوں کو اس مقام سے محروم کر دیں۔ کیا یہ ایک واقعہ آپ کے مجسم رحمت ہونے کا ثبوت نہیں

سلطان[1] نورالدین زنگیؒ۔ اور سلطان[2] صلاح الدین ایوبیؒ۔ دنیا اور دنیا والوں کے لئے مجسم رحمت تھے۔

---

[1] سلطان عادل نورالدین محمود زنگی دوسری صلیبی جنگ کا ہیرو ۱۱۴۶ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ سلطان نہایت عادل۔ رحم دل۔ علم دوست۔ غریب نواز۔ رعایا پرور اور اسلام دوست تھا۔ اس کی صفات حمیدہ کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کے دشمن اس کی مدح پر مجبور تھے چنانچہ ولیم لیشپ آف ٹائر لکھتا ہے کہ سلطان نورالدین زنگی اگرچہ نصاریٰ کا شدید ترین دشمن تھا لیکن نہایت عادل۔ حوصلہ مند۔ عقل مند اور اپنی قومی روایات کے اعتبار سے مذہب دوست تھا۔ اس کے عہد حکومت میں کوئی دولتمند کسی غریب کو کسی قسم کا آزار نہیں پہنچا سکتا تھا اس کی معدلت شعاری کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کی وفات کے بعد اگر کوئی شخص کسی پر ظلم کرتا تو مظلوم اس کی قبر پر جا کر فریاد کیا کرتا تھا۔ کہ اے سلطان! تیری وفات کے بعد دنیا کے لوگ پھر ظلم و ستم پر مائل ہو گئے ہیں۔ ۱۱۷۳ء میں وفات پائی۔

[2] سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی رحمدلی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ عیسائیوں نے جب بیت المقدس فتح کیا تو ساٹھ ہزار مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا جس میں عورتیں بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے لیکن جب سلطان نے اس شہر کو فتح کیا تو سب کو معاف کر دیا اور اجازت دیدی کہ چالیس دن کے

(بقیہ صفحہ ۱۰۴ پر)

فقر و ملوکیت

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم
اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور
کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم
عشق و مستی نے کیا ضبطِ نفس مجھ پہ حرام
کہ گرہ غنچے کی کھلتی نہیں بے موجِ نسیم

(بقیہ صفحہ ۱۰۳ کا)

اندر شہر کو خالی کر دیں اور سلطان کی مملکت میں جہاں چاہیں آباد ہو جائیں اگرچہ ہر مرد پہ دس دینار اور ہر عورت پہ پانچ دینار اور ہر بچہ پہ ایک دینار زر فدیہ عائد کیا گیا تھا۔ لیکن دس ہزار نادار عیسائیوں کا زر فدیہ خود سلطان نے ادا کیا اور کئی ہزار آدمیوں کا فدیہ معاف کر دیا گیا اس کے علاوہ سلطان نے بیوہ عورتوں اور یتیموں کو اپنے پاس سے بہت سا روپیہ دیا اور کسی شخص کو قتل نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ یورپ کی تاریخ اس رحم دلی اور انسانیت کی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتی۔

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے روحِ اسلام (فقر) اور ملوکیت کا موازنہ پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ۔

پہلا شعر:۔ دنیا پرست بادشاہ تو ظاہری ساز و سامان پر بھروسہ کرتے ہیں لیکن جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں وہ لوگ صرف اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں اور ساز و سامان کی چنداں پرواہ نہیں کرتے اگر میسّر آجائے تو بہت خوب۔ ورنہ وہ لوگ بے ساز و سامان ہی میدانِ جہاد میں کود پڑتے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ اگر سینوں میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت موجزن ہو تو مجاہد فی سبیل اللہ دشمنوں پر بجلی بن کر گرتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اور ایسی بے جگری اور بہادری سے لڑتا ہے کہ ہر دور میں فرعون اور کلیم کا واقعہ تازہ ہو جاتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ اب اقبالؔ رُخ بدل کر کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! اگر تمہارے پاس ساز و سامان کی کمی ہے تو ہرگز آزردہ خاطر نہ ہونا اسلام کی کامیابی کا دور عنقریب آنے والا ہے کیونکہ اقوامِ یورپ کے سامنے کوئی اخلاقی نصب العین نہیں ہے۔ وہ سب دولت اور استعمار کی حرص میں مبتلا ہیں اور اس ناپاک جذبہ کی بنا پر ان کی اخلاقی حالت بالکل تباہ ہو چکی ہے۔ میں شاید اس حقیقت کو ابھی واضح نہ کرتا لیکن جس طرح موجِ نسیم سے غنچہ شگفتہ ہو جاتا ہے اسی طرح عشق و مستی نے مجھے اظہارِ حق پر مجبور کر دیا ہے۔

اسلام

روحِ اسلام کی ہے نورِ خودی نارِ خودی
زندگانی کے لئے نارِ خودی نور و حضور
یہی ہر چیز کی تقویم، یہی اصلِ نمود
گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
لفظِ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے "فقرِ غیور"

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے اسلام کی حقیقت بیان کی ہے کہ دراصل اسلام "فقرِ غیور" کا دوسرا نام ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

پہلا شعر:- اسلام کی روح۔ نورِ خودی اور نارِ خودی ہے یعنی اسلام خودی میں نور اور نار کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ نور سے مراد ہے شانِ جمال اور نار سے مراد ہے شانِ جلال۔ اور ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ کہ لا الٰہ سے شانِ جلال اور الا اللہ سے شانِ جمال کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور لا الٰہ الا اللہ، یہی اصلِ اسلام ہے یعنی اسلام کی روح ہے اور انسانی

زندگی کی تکمیل کے لئے انہیں دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ مختصر طور پر یوں کہہ سکتے ہیں۔

نار۔ نور۔ جلال۔ جمال۔ لا الٰہ۔ الّا اللہ۔ روح اسلام۔ نیز نور سے حضور یعنی اللہ کی موجودگی کا احساس پیدا ہوتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب الا اللہ کہا تو اللہ کی ہستی کا اثبات ہو گیا اسی سے رنگ جمال پیدا ہوا اور اسی سے ہستی باری کا اثبات یعنی رنگ حضور پیدا ہو گیا گویا نور اور حضور ایک ہی چیز ہے۔ یعنی اللہ

دوسرا شعر:۔ بس یہی نور و نار ہر شے کی بنیاد ہے اور یہی نمود کی اصل ہے۔ یعنی خودی ہر شے میں موجود ہے حتیٰ کہ جمادات میں بھی لیکن فطرت نے اس روح کو نظروں سے پوشیدہ رکھا ہے یہ نکتہ صرف غور کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ تفصیل سنو!

واضح ہو کہ یہ کائنات اللہ کے اسماء کا پرتو ہے اور اس کے جس قدر اسماء ہیں وہ سب اس کی صفات ہی تو ہیں مثلاً رحیم و کریم اور قہار و جبار انہیں صفات کی تجلّی ہر دم ہوتی رہتی ہے اور یہ صفات دو قسم کی ہیں جلالی اور جمالی گویا اللہ کی دو شانیں ہیں۔ شانِ جلال اور شانِ جمال لا الٰہ اس کی شانِ جلال کا مظہر ہے اور الّا اللہ اس کی شانِ جمال کا مظہر ہے اور ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ کائنات پر اس کی صفات ہر دم تجلّی فرماتی رہتی ہے اس لئے رنگِ جلال اور رنگِ جمال (یعنی نور اور نار) ہر شئے کی تقویم اور ہر شے کی نمود کی اصل ہے اور یہی روح اسلام ہے یعنی اسلام انسانی خودی میں یہی دونوں

شانیں پیدا کر دیتا ہے۔ جسے اقبالؔ نے نور اور نار سے تعبیر کیا ہے جب مومن اپنے آپ کو صبغۃ اللہ یعنی اللہ کے رنگ میں رنگ لیتا ہے تو اس میں بھی جلالی اور جمالی شان پیدا ہو جاتی ہے اور جمال اسلام کی روح ہے اور یہی دونوں شانیں جن کو اقبالؔ نے نور اور نار سے تعبیر کیا ہے۔ ہر شئے کی بنیاد ہیں۔

تیسرا شعر:- اگر یورپ کو لفظ اسلام سے نفرت ہے تو ہم اسے اسی دین کا دوسرا نام بتاتے ہیں اور وہ نام "فقرِ غیور" ہے۔

فقرِ غیور سے مراد وہ فقر ہے جس میں غیرت کا مادہ پایا جائے یعنی ایک فقر تو مسکینی اور گداگری سکھاتا ہے۔ اسلام کو اس فقر سے کوئی علاقہ یا رابطہ نہیں ہے۔

اسلام انسان میں ایسا فقر پیدا کرتا ہے جس میں مسکینی اور دلگیری نہیں ہوتی بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے غیرت ہوتی ہے اور مسلمان کی شناخت یہ ہے کہ وہ غیور ہوتا ہے کسی کے آگے سربسجود نہیں ہوتا اور کفر سے کسی صورت میں بھی مفاہمت نہیں کرتا۔ دنیا کو ہیچ سمجھتا ہے۔ دولت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ بوریئے پر سوتا ہے۔ پیوند لگا ہوا کرتا پہنتا ہے لیکن سلاطین کے سامنے کلمۂ حق کہتا ہے۔ اور مطلق نہیں ڈرتا۔ بلکہ سلاطین خود اس کے سامنے لرزہ براندام رہتے ہیں۔

اسلام جس فقر کی تعلیم دیتا ہے۔ اقبالؔ نے بال جبریل میں خود اس کی تصریح کی ہے۔

اک فقر سکھاتا ہے مسکینی و دلگیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری

اسلام بھی فقر کی شان پیدا کرتا ہے لیکن وہ فقر انسان کو دنیا میں سربلند اور حکمراں کر دیتا ہے بلکہ۔

بادشاہاں در قبا ہائے حریر
زرد رو از سہم آں عریاں فقیر

یعنی بادشاہ لوگ جو ریشمی لباس پہنتے ہیں۔ اور اس ننگے فقیر کو دیکھ کر اس کے خوف سے پیلے پڑ جاتے ہیں۔

یعنی اسلام مسلمان میں جو شانِ فقر پیدا کرتا ہے اس سے بادشاہ بھی لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔ اقبالؔ نے اس فقر کی تشریح اپنی فارسی کتابوں میں کی ہے مثلاً "مثنوی پس چہ باید کرد" لہٰذا جن لوگوں کو اقبال کے اصلی رنگ سے آگاہی مطلوب ہو۔ انہیں لازم ہے کہ ان کی فارسی کتابوں کا مطالعہ کریں۔

نوٹ:۔ میں مثنوی۔ پس چہ باید کرد" کی شرح بھی لکھ رہا ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی شائع ہو جائے گی اور اس کے بعد اسرار خودی اور رموزِ بیخودی کی شرح شائع کروں گا۔ (انشاء اللہ)

حیات ابدی

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

(٭)

شرح مشکلات اقبالؔ نے دو شعروں میں ہمیں حیات ابدی حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ اگر ہم زندگی (حیات) کو صداقت سے تشبیہ دیں تو خودی کو قطرۂ نیساں کہہ سکتے ہیں اور صداقت کا وظیفہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قطرہ کی پرورش کر کے اسے موتی بنا دے۔ پس ہم کو اپنی زندگی اس طرح بسر کرنی چاہیئے کہ اعمال صالحہ کی بدولت ہماری خودی اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ سکے جس طرح قطرہ جب گہر (موتی) بن جاتا ہے تو مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اس کی صورت یہ ہے کہ انسان کو اپنی خودی کی حفاظت کرنی یعنی اسے مستحکم کرنا لازم ہے (واضح ہو کہ خودی صرف

عشق سے مستحکم ہو سکتی ہے) پس اگر ہماری خودی میں تین صفات پیدا ہو جائیں تو وہ لازوال ہو سکتی ہے یعنی اسے حیات ابدی حاصل ہو سکتی ہے وہ تین صفات یہ ہیں۔ خود نگر۔ خود گر۔ خود گیر۔

خود نگر کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے ماحول سے آگاہ ہوں دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے میں دوسروں کے محتاج نہ ہوں مثلاً دنیا کو کافروں کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔

خود گر کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی تربیت اور اصلاح خود کر سکیں دوسروں کے دستِ نگر نہ ہو۔ مثلاً انگریزوں کا ضابطۂ حیات اختیار نہ کریں۔

خود گیر کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی حفاظت خود کر سکیں دوسروں کے سہارے اپنی زندگی بسر نہ کریں مثلاً کامن ویلتھ یا لیگ آف نیشنز پر اعتماد نہ کریں۔

ان تینوں صفات سے خودی میں پختگی پیدا ہو سکتی ہے اور اقبال خود کہتے ہیں۔ ع خودی چوں پختہ گردد لازوال است

سلطانی

یہ اشعار ریاض منزل (دولت کدہ سر راس مسعود) بھوپال میں لکھے گئے

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اسی مقام سے آدم ہے ظلِّ سبحانی
یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہانبانی
کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی
مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی
ہوا حریف مہ و آفتاب تو جس سے
رہی نہ تیرے ستاروں میں وہ درخشانی

شرح مشکلات یہ نظم بلندیٔ افکار اور عمقِ معانی کے لحاظ سے ضربِ کلیم کی بہترین نظموں میں سے ہے اس نظم میں اقبالؔ نے سلطانی (بادشاہت) کا حقیقی مفہوم سمجھایا ہے۔ یوں سمجھو کہ سلطانی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نقلی یا مجازی دوسری اصلی یا حقیقی۔ علامہ فرماتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ وہ فقر جو قرآن حکیم کی روح کو اپنی زندگی میں داخل کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ہزاروں مقام رکھتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ چنانچہ جب مسلمان اپنے اندر شانِ فقر پیدا کر لیتا ہے تو خودی اپنی مخفی قوتوں سے آگاہ ہو جاتی ہے یعنی اس وقت مومن کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں کس قدر زبردست طاقتیں موجود ہیں تو جب خودی اپنی شان قاہری سے آگاہ ہوتی ہے تو اسی مقام یا اس وقوف کو "سلطانی" کہتے ہیں۔

غرض سلطانی کی اصل حقیقت وقوف یا شعور ہے نہ کہ تخت و تاج یعنی اس وقت مومن کو اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ دراصل سلطان میں ہوں نہ کہ وہ سلاطین جو تخت پر جلوہ گر ہیں اس وقت وہ ان نقلی سلاطین کو ایسی ہی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جیسے یہ دنیاوی سلاطین اپنے امیروں کو دیکھتے ہیں۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب پانی پت کے گورنر کے چوبدار نے حضرت بوعلی قلندر پانی پتی کے ایک مرید کو مارا اور وہ حضرت کی خدمت میں فریاد

ے کر حاضر ہوا تو حضرت نے اپنے کاتب کو حکم دیا کہ دہلی کے بادشاہ کو میری طرف سے خط لکھ دو کہ اگر تو نے اس بدطینت عامل (گورنر) کو پانی پت سے فوراً دوسری جگہ تبدیل نہیں کیا تو میں دہلی کے تخت کو کسی دوسرے بادشاہ کے حوالہ کر دوں گا۔

باز گیر ایں عاملِ بد گوہرے
ورنہ بخشم ملکِ تو بادیگرے

اقبال نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

غور کیجئے۔ حضرت قلندر پانی پتی محض ایک گدائے گوشہ نشین تھے نہ ان کے پاس فوج تھی نہ خزانہ۔ لیکن اس کے باوجود ان میں اس قدر طاقت تھی کہ انہوں نے ہندوستان کے مطلق العنان بادشاہ کو ایسا سخت خط لکھ دیا۔ سوال یہ ہے کہ ان میں یہ طاقت اور یہ شوکت کیسے پیدا ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

تیسرا شعر۔ یہی مقام یعنی شانِ فقر جسے حقیقی معنی میں سلطانی کہہ سکتے ہیں مومن کی قوتوں کی کسوٹی ہے مومن اپنی قوتوں کو اسی سلطانی کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور اسی مقام پر پہونچکر وہ حقیقی معنی میں خلیفۃ اللہ علی الارض بن جاتا ہے۔ بظاہر وہ چٹائی پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے لیکن دراصل ساری دنیا پر حکومت کرتا ہے اور ساری دنیا اس ایک فقیر سے کانپتی

رہتی ہے۔

چوتھا شعر:۔ واضح ہو کہ یہ سلطانی اپنے اندر جبر و قہر (ظلم) کا رنگ نہیں رکھتی بلکہ عشق و مستی کا رنگ رکھتی ہے بالفاظ دگر دنیاوی سلاطین تو صرف لوگوں کے جسم پر حکومت کرتے ہیں لیکن مومن (صاحب فقر) لوگوں کے دلوں پر حکمراں ہوتا ہے۔ دنیاوی سلاطین تو تلوار کے زور سے حکومت کرتے ہیں لیکن مومن محبت کی مدد سے حکومت کرتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جبر و قہر سے جہانبانی ممکن نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جن بادشاہوں نے جبر و قہر سے حکومت کی ہے ان کا انجام نہایت برا ہوا ہے۔

پانچواں شعر:۔ یہ شعر اس نظم کی جان ہے۔ کہتے ہیں کہ۔ تجھ کو (مسلمان قوم سے خطاب ہے) جو غلامی میں مبتلا کیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ نے تجھے حقیقی سلطانی عطا فرمائی تھی یعنی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے فقر کا سبق پڑھایا تھا لیکن تو نے وہ سبق بالکل بھلا دیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو بھلا دینے کے معنی یہ ہیں کہ تو نے اللہ کو بھلا دیا پس اس نے اپنے قانون کے مطابق تجھے بھلا دیا۔

چھٹا شعر:۔ افسوس کہ تو نے چند روزہ زندگی کو عیش و آرام سے بسر کرنے کی خاطر فرنگی کی غلامی قبول کر لی ہے۔

ساتواں شعر:۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیری قوم کے (ستاروں) افراد کی عزت خاک میں مل گئی اور وہ تمام دنیا کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو گئی۔

-۞-

صوفی سے

تری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا
مری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا
تخیلات کی دنیا غریب ہے لیکن
غریب تر ہے حیات و ممات کی دنیا
عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تری
بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے موجودہ دور کے گوشہ نشین رہبانیت پسند اور بے عمل صوفیوں سے خطاب کیا ہے جو سائنس اور علوم جدیدہ سے بالکل بے خبر ہیں۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ تو فوق العادت امور میں اس درجہ منہمک رہتا ہے کہ امورِ مادی کی طرف کبھی متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس مادی دنیا کا کاروبار معجزات پر نہیں بلکہ قوانین فطرت پر چل رہا ہے یہ صحیح ہے کہ اللہ معجزات بھی دکھاتا ہے لیکن شاذ و نادر ہی ایسا کرتا ہے۔ تجھے لازم ہے کہ معجزات کی دنیا سے باہر نکل کر حادثات کی دنیا کا بھی مطالعہ کرے یعنی یہ دیکھ

کہ کائنات میں جس قدر حوادث رونما ہوتے ہیں۔ ان کی علت کیا ہے۔
واضح ہو کہ حوادثِ کائنات کی علت دریافت کرنا یہی تو سائنس کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کو دین کے ساتھ ساتھ سائنس کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے (سائنس سے میری مراد طبیعات۔ کیمیا۔ اور علم الحیات ہے۔)

دوسرا شعر:۔ یہ سچ ہے کہ تخیلات کی دنیا جس میں تو رہتا ہے بہت دلچسپ اور عجیب و غریب ہے۔ لیکن زندگی اور موت کی دنیا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے یعنی علم الحیوٰۃ (BIOLOGY) اور علم الحیوان (ZOOLOGY) کا مطالعہ انسان کے لئے جس قدر ضروری ہے اس سے زیادہ دلچسپ ہے ان علوم سے ہم کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اللہ نے جہاں ہاتھی جیسی بڑی چیز پیدا کی ہے وہاں ایسے چھوٹے کیڑے بھی پیدا کئے ہیں۔ جو خوردبین کے بغیر نظر بھی نہیں آسکتے۔ علاوہ بریں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جاندار مخلوقات کیسے زندہ رہتی ہیں اور کیسے مرتی ہیں۔

تیسرا شعر:۔ پس اے صوفی! تو کبھی کبھی ممکنات کی دنیا کی طرف بھی متوجہ ہو جس طرح مراقبہ ضروری ہے اسی طرح مشاہدہ بھی تو ضروری ہے مسلمانوں کو ان دونوں کی ضرورت ہے۔ مراقبہ سے ذکر کی قوت ترقی کرتی ہے۔ مشاہدہ سے فکر کی قوت میں ترقی ہوتی ہے۔ اور اقبالؔ کہتے ہیں کہ کوئی تعجب نہیں اگر تو ممکنات کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دے یعنی سائنسداں تو صرف ظاہری اسباب کو مدنظر رکھتا ہے یعنی وہ صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ پانی میں یہ تاثیر ہے کہ وہ پیاس بجھا سکتا ہے لیکن ایک صوفی اس سے آگے بڑھ کر

یہ معلوم کرتا ہے کہ یہ تاثیر کہاں سے آئی اور وہ مراقبہ سے یہ معلوم کرتا ہے کہ کوئی ہستی ہے جس نے پانی کے عناصر کو اس طرح ترتیب دیا کہ ان میں پیاس بجھانے کی تاثیر پیدا ہو گئی۔

نوٹ:۔ یہ صرف تین شعروں کی نظم ہے لیکن بار بار پڑھنے اور سمجھنے کے لائق ہے۔ ضربِ کلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ نہ الفاظ مشکل ہیں نہ اسلوب بیان مشکل ہے لیکن معانی و مطالب بہت عمیق ہیں اور یہی کمال شاعری ہے کہ آسان لفظوں میں ایسے بلند مضامین ادا کر دیئے ہیں۔

افرنگ زدہ

(۱)

ترا وجود سراپا تجلّیِ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زر نگار و بے شمشیر

(۲)

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں کی غیر اسلامی زندگی پر تنقید کی ہے۔ ان کی رائے میں کالجوں اور اسکولوں کی تعلیم کا صرف ایک نتیجہ برآمد ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکے اور لڑکیاں چال ڈھال۔ وضع و لباس۔ خورد و نوش۔ گفتگو زبان اور تمدن تہذیب اور معاشرت۔ عقائد اور افکار غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ میں کافروں کی مقلد ہو گئی ہیں۔ اقبالؔ نے اسی چیز کو "افرنگ زدہ" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ افرنگ زدہ کی ترکیب "سگ زدہ" کو مدنظر رکھ کر وضع کی گئی ہے جس طرح سگ زدہ وہ ہے جس کی رگ رگ میں دیوانے کتّے کا زہر سرایت کر جائے اسی طرح "افرنگ زدہ" وہ لڑکا یا لڑکی ہے جس کی رگ رگ میں فرنگی کافروں کے ناپاک خیالات سرایت کر جائیں اور جس طرح کتّے کے زہر سے جسمانی موت واقع ہو جاتی ہے اسی طرح فرنگیوں کے ناپاک خیالات کے زہر سے مسلمان کی روحانی موت واقع ہو جاتی ہے۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان نوجوان! تیرے وجود میں مجھے کہیں اسلام کی جھلک نظر نہیں آتی اس کے برعکس تیری شخصیت سے ازسر تا پا فرنگیت ٹپکتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تیرے والدین نے تیری شخصیت کی تعمیر میں اسلام اور اس کی روایات کو کسی وقت بھی داخل نہیں ہونے دیا بلکہ بچپن ہی سے تجھ کو فرنگی اساتذہ کے سپرد کر دیا۔ اور انہوں نے تجھ کو پورے طور سے کفر کے سانچے میں ڈھال دیا۔

دوسرا شعر:۔ یہی وجہ ہے کہ تیرا جسم خودی سے بالکل مُعرّا ہے

یعنی تو ایک نیام ہے جس پر سونے کا تفیس کام بنا ہوا ہو لیکن ہو خالی۔ اب تو خود سوچ لے کہ میدان جنگ میں خالی نیام کیا کام دے سکتی ہے۔

(۲)

یہ تو ہوا تیری شخصیت کا حال اب جہاں تک تیرے ذہن کا تعلق ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ کیا تو مغربی تعلیم کی بدولت خدا کا منکر ہو گیا تیری گفتگو سے صاف مترشح ہے کہ تیری نگاہ میں خدا کا وجود ثابت نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے کالج میں صرف روسو[1]۔ کارل مارکس اور فرائڈ کے نظریات کا

---

[1] ڈاکٹر ریگ مونڈ فرائڈ (STOMUND TREVD) ۱۸۵۶ء ۱۹۳۸ء آسٹریا کا مشہور ماہر علم اعصاب (HEUROLOGIST) اور طبیب اور نظریۂ تحلیلِ نفسی (PSYCHOAHALYSIS) کا موجد یہودی الاصل تھا۔ زندگی کا بڑا حصہ دیانا میں بسر کیا ۱۸۸۳ء میں نیورپیتھالوجی کا پروفیسر مقرر ہوا اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی زندگی جنسی جذبات کے گرد گھومتی ہے۔

روسو ۱۷۱۲ء تا ۱۷۷۸ء جنیوا میں پیدا ہوا فرانس میں زندگی بسر کی ساری عمر مختلف حوادث کا شکار رہا اس کی مشہور کتاب "روشل کانٹریکٹ (SOCIALC AATRACT) ہے جو ۱۷۶۲ء میں شائع ہوئی۔ مذہب۔ سیاست۔ تمدن اور تعلیم اس کے خاص موضوع تھے جمہوریت کا بہت بڑا علمبردار تھا۔ چنانچہ انقلاب فرانس بڑی حد تک اس کے انقلاب آفریں خیالات کا نتیجہ تھا جرمن کا مشہور فلاسفر کانٹ نیز گوئٹے اور کارل مارکس بھی اس کی تعلیمات سے متاثر ہوئے۔

مطالعہ کیا ہے۔ قرآن اور حدیث یعنی اللہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات تو تیری زندگی میں کبھی داخل ہی نہیں ہوئیں لیکن میری نگاہ میں تو خود تیرا ہی وجود ثابت نہیں ہے۔ کیوں؟

تیسرا شعر:۔ اس لئے کہ وجود کیا ہے؟ وہ جوہر خودی کی نمود اور اس کے اظہار ہی کا تو نام ہے اور تیرے اندر اول تو خودی ہی نہیں اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کا وجود فرض بھی کر لیا جائے تو کافرانہ تعلیم کی وجہ سے اس کا جوہر فنا ہو چکا ہے یعنی اس کے نشو و نما کا اب کوئی امکان باقی نہیں ہے۔

چوتھا شعر:۔ پس اے مسلمان نوجوان! سر دست تو اس بحث میں مت پڑ۔ کہ خدا ہے یا نہیں بلکہ تو اس بات پر غور کر۔ کہ میں خود موجود ہوں یا نہیں؟ خدا کا وجود تو بعد میں ثابت ہو گا تو پہلے اپنا وجود تو ثابت کر۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مصرع بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔

ع کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

کیا اس نظم سے ناظرین اس درد کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتے جو اقبال کے دل میں ملت کے نوجوانوں کے لئے موجود تھا؟ سچی بات تو یہ ہے کہ اسی درد کی کسک نے اقبال اور کلام اقبال دونوں کو لازوال بنا دیا۔

اقبال نے اس نظم میں افرنگ زدہ نوجوان مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں سے خطاب کیا ہے اور جو کچھ کہا ہے۔ بالکل درست اور بجا ہے۔ لیکن میں اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اصلی مجرم یہ نادان لڑکے اور لڑکیاں نہیں بلکہ ان کے

والدین ہیں جو محض دنیا پرستی میں مبتلا ہیں وہ دنیاوی نمود کے لئے ان بے گناہوں کو کالجوں کی بھٹی میں بے دریغ جھونک رہے ہیں اور اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ قوم کے نونہالوں کی خودی آگ میں جل کر بھسم ہو جاتی ہے اور پاکستان بن جانے کے بعد تو لڑکوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہماری لڑکیاں گمراہی اور تباہی کی طرف جا رہی ہیں۔ کاش اقبال آج زندہ ہوتے اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ مسلمان لڑکیاں کیسے ذوق و شوق کے ساتھ نار جہنم کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہیں اور ان کے نابینا والدین ہر قدم پر الحمد للہ اور سبحان اللہ کہہ رہے ہیں۔

جس وقت ہماری قوم کی نوجوان لڑکیاں کسی سرکاری تقریب کے موقع پر زنانہ نیشنل گارڈ کی دلفریب وردی پہن کر اور پوری قوت کے ساتھ سینہ تان کر انگریزی انداز سے غیر ملکی مہمانوں کو سلامی دیتی ہیں تو ان کے والدین خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان جس مقصد کے لئے بنایا گیا تھا وہ سو فی صدی پورا ہو گیا۔ کاش اقبال آج زندہ ہوتے تو میں انہیں انہی کے یہ دو شعر پڑھ کر سناتا۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین — پردہ[1] اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

---

[1] واضح ہو کہ جس زمانہ میں (یعنی ۱۹۱۵ء سے پہلے) اقبال نے یہ قطعہ لکھا تھا اس وقت تک "پردہ" نہیں اٹھا تھا لیکن آج ۱۹۵۰ء میں قوم کی خوش نصیبی ہے پردہ تقریباً اٹھ چکا ہے صرف جاہل عورتوں میں باقی رہ گیا ہے۔

تصوّف

یہ اشعار ریاض منزل (دولت کدہ سر راس مسعود) بھوپال میں لکھے گئے

یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علمِ لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ عقل جو مہ و پروین کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ یزداں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
فروغِ صبحِ پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(❖)

شرح مشکلات یہ نظم معانی و مطالب، سوز و گداز اور حقیقت بیان کے لحاظ سے اقبال کی غیر فانی نظموں میں سے ہے اس قدر سلیس اور دلکش انداز ہے کہ ہر شعر دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے اور اثر آفرینی

کا تو یہ عالم ہے کہ پندرہ سال سے میں مسلسل اس کو پڑھ رہا ہوں لیکن ہنوز طبیعت کو سیری نہیں ہوئی ہے۔ حالانکہ یہ فلسفیانہ نظم ہے یعنی اس نظم میں تصوف کی حقیقت بیان کی ہے اور نہایت عمیق خیالات ظاہر کئے ہیں۔ لیکن ہر مصرع ثانی میں بالکل میرؔ کا سا رنگ نظر آتا ہے اور وہی سوز و گداز اور وہی تاثیر ہے جو میرؔ کا طغرائے امتیاز ہے۔

پہلا شعر:۔ فرماتے ہیں کہ اگر ارباب تصوف کی لکھی ہوئی تفاسیر اور ان کا مدوّن کردہ علم باطنی اسلام کی مصیبتوں کا ازالہ نہیں کر سکتا تو پھر یہ سب چیزیں اور سارے علوم و فنون بالکل بے کار ہیں یعنی اللہ اور رسولؐ کی نگاہ میں ان کی کوئی قیمت نہیں۔ جو تصوّف حرم یعنی اسلام کے درد کا علاج نہیں کر سکتا وہ کسی کام کا نہیں مختصر یہ کہ جو حکمت اور جو علم مسلمان صوفیوں کو جہاد فی سبیل اللہ پہ آمادہ نہیں کر سکتا وہ بالکل بے کار ہے۔

سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی اور آپ کے جانثاروں یعنی صحابہ کرامؓ کی زندگیوں پہ نظر کرو۔ کیا کوئی صوفی ان سے بڑھ کر قرآن اور حدیث سے باخبر ہو سکتا ہے کیا کوئی صوفی ان سے بڑھ کر تصوف سے آگاہ ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں تو ان کی زندگیوں کا مطالعہ کرو اور دیکھو کیا ان لوگوں نے ساری عمر حجروں میں بیٹھ کر مراقبہ میں بسر کی۔ یا ساری عمر میدانِ جنگ میں جہاد فی سبیل اللہ میں بسر کی؟ پھر غور کرو کہ سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی آرزو کیا تھی۔ کیا حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میں اللہ کے راستہ میں جہاد کروں اور قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں۔ پھر جہاد کروں اور پھر قتل

کیا جاؤں. پھر زندہ کیا جاؤں اور اللہ کے راستہ میں جہاد کروں اور پھر قتل کیا جاؤں۔

کیا اس میں کوئی شک ہے کہ جیسا نازک زمانہ اسلام پر آج آیا ہوا ہے گذشتہ چودہ سو سال میں اس کی نظیر نہیں ملتی. کیونکہ آج ساری دنیا اسلام کو مٹا دینے کے درپے ہے کفر کی جس قدر صورتیں دنیا میں موجود ہیں سب نے اسلام کے خلاف متحدہ محاذ جنگ قائم کر رکھا ہے جتنے مذاہب ہیں سب نے اسلام کے خلاف سازش کر رکھی ہے اور جس قدر سیاسی نظام ہیں سب اسلام کے خلاف صف آراء ہو چکے ہیں. آج طاغوتی قوتیں صاف لفظوں میں اعلان کر رہی ہیں کہ دنیا میں جہالت. سفاہت. ضلالت اور تمام برائیوں کے لئے جگہ نکل سکتی ہے لیکن محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قائم کردہ نظام کے لئے کہیں گنجائش نہیں ہے۔

صدر جمہوریہ امریکہ چار ہزار سال پرانے نظام حیات اور ضابطۂ اخلاق سے استفادہ کرنے کو تیار ہے وہ تبت کے گمنام لاما کے گمنام تر ضابطۂ اخلاق سے استمداد کے لئے آمادہ ہے وہ ہزاروں سال سے مردہ زبان (سنسکرت) کی اخلاقی کتابوں سے دریوزہ گری کر سکتا ہے. لیکن زندہ کلام رسولؐ اور زندہ زبان کی اور زندہ کتاب اللہ (قرآن) کے زندگی بخش اخلاقی ضابطہ (MORAL CODE) کا ذکر بھی زبان پر نہیں لاتا۔ مبادا شیطان اس سے ناراض ہو کر اس کی حمایت سے دست بردار ہو جائے۔

اندریں حالات اگر تصوّف کا لٹریچر اور تصوّف کے وظائف، صوفیوں

کو سربکف ہونے پہ آمادہ نہیں کر سکتے تو کچھ بھی نہیں کر سکتے اور ان چیزوں کا کچھ فائدہ نہیں۔

دوسرا شعر:۔ اگر صوفیوں کے یہ مراقبے، یہ راتوں کے اذکار سِرّی و جہری (خاموشی اور بلند آواز سے اللہ کا ذکر) اور یہ سارا جوش و خروش اور یہ (اللہ ھُو) کے نعرے۔ یہ قوّالی کی کیف انگیز محفلیں۔ یہ ختم خواجگانِ چشت و مشائخ نقشبند۔ یہ حلقۂ ذکر۔ یہ کیف و مستی۔ یہ زلفیں اور یہ عمامے یہ عبائیں اور یہ قبائیں۔ یہ تسبیحیں اور یہ مصلّے۔ غرضکہ یہ تمام لوازمات اگر تیری خودی کی نگہبانی نہیں کر سکتے یعنی تجھے جہاد پہ آمادہ نہیں کر سکتے تو پھر سب بے کار ہیں۔

تیسرا شعر:۔ اور یہ عقل جو آسمان کے تارے توڑ کر لا سکتی ہے اور لاتی ہے۔ یہ عقل جس کی بدولت (سائنس داں) مریخ سے نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کر رہا ہے جس کی بدولت چاند تک پہنچنے کا انتظام کر رہا ہے جس کی بدولت فطرت کے رازہائے سربستہ (مثلاً ٹیلیفون۔ ٹیلیگراف۔ ٹیلی ویژن۔ لاسلکی (وائرلیس) ایکسرے۔ ہوائی جہاز۔ آب دوز۔ اور ایٹم بم) کھول رہا ہے یہ عقل اگر۔

ع شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

میں اس جملہ کی تشریح میں صفحے سیاہ کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ جو لطف اس "شریک شورشِ پنہاں" کی ترکیب میں پنہاں ہے۔ وہ اس کی تشریح سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

شورشِ پنہاں سے اقبال کی مراد وہی جذبہ عشق حقیقی ہے جس کی تشریح قبل ازیں کر چکا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انسانی عقل و خرد محبت الٰہی کے تحت نہ ہو تو پھر وہ عقل و خرد بالکل بے کار ہے۔ کیونکہ وہ دنیا تو عطا کر سکتی ہے دین عطا نہیں کر سکتی یعنی سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی عزت و سرفروشی کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتی۔ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے میدانِ جنگ میں سر سے کفن باندھ کر جانے کا مشورہ نہیں دے سکتی۔

چوتھا شعر:۔ اگر کوئی شخص اپنی عقل سلیم کی بدولت اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ ضرور کوئی ہستی ایسی ہے جس نے یہ دنیا بنائی ہے تو بھی چنداں فائدہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جب تک خرد کے ساتھ مسلمان کا دل اور اس کی نگاہ یہ دونوں قوتیں بھی مسلمان نہ ہو جائیں اس وقت تک وہ مسلمان حقیقی معنیٰ میں مسلمان یعنی مومن نہیں ہو سکتا۔

واضح ہو کہ مغربی فلسفہ میں دل و نگاہ کی نہ کوئی حیثیت تسلیم کی گئی ہے اور نہ ان کا ذکر کیا گیا ہے مغربی حکماء دل کو محض ایک پارۂ گوشت تصور کرتے ہیں جس کا کام خون پھینکنا ہے اور بس۔ لیکن اسلام کا مرتبہ عقل سے بھی بڑھا ہوا ہے جس طرح عقل انسانی زندگی کا مرکز ہے لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "دل" کی اصلاح کرو۔ یا دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ۔ تو اس وقت دل سے ہماری مراد یہ پارۂ گوشت نہیں ہوتی بلکہ اس میں جو روحانی قوت مخفی ہے وہ مراد ہوتی ہے۔ یوں سمجھو کہ جس طرح دماغ بظاہر ایک مضغۂ گوشت ہے لیکن اس میں قوتِ مدرکہ ایک ناقابل فہم طریقہ سے تصرف کرتی ہے

اسی طرح دل بھی بظاہر گوشت کا لوتھڑا ہی ہے لیکن اس میں بعض روحانی قوتیں مخفی ہیں جن کا علاقہ اس عالم سے نہیں بلکہ اس عالم یعنی عالم لاہوت سے ہے اور انسان کے اخلاق کی اصلاح صرف دل کی اصلاح سے ہو سکتی ہے اسی لئے صوفیائے کرام نے تزکیۂ قلب کو مقدم قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ کا سب سے بڑا مقصد یہی قرار دیا ہے کہ آپ تزکیۂ نفوس انسانی کا بہترین طریقہ دنیا کو سکھا دیں تاکہ انسان اللہ سے رابطۂ قلبی پیدا کر سکے جو مقصدِ حیاتِ انسانی ہے اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو اللہ نے بندوں پر احسان عظیم سے تعبیر فرمایا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (سورہ آل عمران)

یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ انہی کی جنس میں سے ان کی اصلاح کے لئے ایک رسول کو مبعوث کیا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی کتاب پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیۂ نفس کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔ یعنی میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ بہترین قسم کے اخلاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دوں۔

انسانی اخلاق کا مرکز چونکہ قلب ہے اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تمام تر توجہ قلب کی اصلاح پہ مبذول فرمائی اس مرکز کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے ہو سکتا ہے۔ اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ لَمُضْغَۃٌ اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ۔ (مشکوٰۃ شریف) فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ وہ (مضغۂ گوشت) قلب ہے۔

غرض اگر عقل کے ساتھ قلب بھی مسلمان ہو جائے یعنی اس کی بھی قرآنی طریق پہ اصلاح ہو جائے تو انسان کامل ہو جاتا ہے۔

اور تیسری چیز نگاہ ہے یعنی وہ بصیرت یا فراست مومنانہ جو عقل اور دل کے مسلمان ہو جانے کے بعد پیدا ہو جاتی ہے اور یہ نگاہ دراصل وہ نور ہے جو مومن کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یا صحیح تر الفاظ میں جب مومن کے دل کا آئینہ چمکنے لگتا ہے تو اس میں انوار الٰہی کا عکس پڑنے لگتا ہے اور اقبال اسی عکس یا چمک کو نگاہ سے تعبیر کرتے ہیں بس مومن سب کچھ اسی کے ذریعہ سے دیکھتا ہے اور پھر سارے علوم اس پہ منکشف ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا اقبال یہ کہتے ہیں کہ حقیقی تصوف یہ ہے کہ مسلمان اپنی عقل کے ساتھ ساتھ اپنے دل اور اپنی نگاہ کو بھی مسلمان بنائے اگر اس نے یہ نہیں کیا تو پھر کچھ بھی نہیں کیا۔

واضح ہو کہ ان کو مسلمان بنانے کا طریقہ اقبال نے بال جبریل میں بیان کر دیا ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

پانچواں شعر:۔ اے مخاطب! اگر تجھ کو میری گفتگو کچھ عجیب سی یا کچھ پریشان سی معلوم ہو تو حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میری گفتگو، میرا پیغام میری تعلیم۔ کفر کی تاریکی کو دور کرنے والی ہے گویا کفر کی رات کے لئے پیام صبح ہے اور سب جانتے ہیں کہ جب صبح ہوتی ہے تو دنیا میں ہر جگہ ہلچل پڑ جاتی ہے۔ ہر جگہ حرکت کے آثار نظر آتے ہیں اسی لئے فروغ صبح کو پریشانی سے تعبیر کیا۔

ہندی اسلام

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملّت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوّتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد
اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوّف ہو وہ اسلام کر ایجاد
ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

شرح مشکلات

اس سے پہلے اقبال نے "ہندی مسلمان" کی حالت پر تبصرہ کیا ہے۔ اس نظم میں انہوں نے "ہندی اسلام" کا نقشہ کھینچا ہے۔

پہلا شعر: جس طرح کی زندگی خورد و نوش پر منحصر ہے اسی طرح

قوم کی زندگی وحدتِ افکار پر موقوف ہے یعنی قوم اس وقت ترقی کر سکتی ہے اور حقیقی معنی میں اس پر لفظ قوم کا اطلاق ہو سکتا ہے جب اس کے تمام افراد ہم خیال ہو جائیں۔ ہم خیالی کے بھی دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ عقائد کے لحاظ سے افراد میں افتراق نہ ہو۔ سب لوگ یکساں عقائد کے پابند ہوں یعنی صرف قرآن و حدیث کے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ ان کے سامنے نصب العین بھی ایک ہی ہو۔ اس صورت میں قوم کے تمام افراد ایک ہی طریقہ پر سوچ بچار کرتے ہیں اسی کو وحدت افکار کہتے ہیں۔ یہ وحدتِ افکار اس قدر ضروری چیز ہے کہ اگر قوم کے کسی فرد کو ایسا الہام ہو جس سے یہ وحدت فنا ہوتی ہو تو وہ الہام بھی مفید نہیں بلکہ قوم کے حق میں خالص الحاد ہے۔

دوسرا شعر:۔ واضح ہو کہ وحدت کی حفاظت حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے یعنی قوم کے پاس طاقت ہونی لازمی ہے کہ اگر کوئی فرد اس وحدت کو فنا کرنے کی کوشش کرے تو قوم طاقت سے کام لے کر اس شخص کی اصلاح کر سکے یعنی پہلے اسے سمجھائے اور اگر وہ راہ راست پر نہ آئے تو پھر اسے قرار داد کے مطابق واقعی سزا دے سکے۔ ایسے مفسدوں کا علاج عقلِ خداداد سے ممکن نہیں ہے یعنی اگر ان سے مناظرہ کیا جائے تو وہ باز نہیں آسکتے ان کا علاج صرف ایک ہی ہے کہ طاقت سے کام لے کر ان کا خاتمہ کر دیا جائے کیونکہ جس طرح پورے جسم کی بقاء کے لئے ڈاکٹر ایک انگلی کاٹ دیتا ہے اور ہر شخص اس کے اس فعل کو اچھا سمجھتا ہے اسی طرح پوری قوم کی بقاء کے لئے ایک شخص کو قتل یا محبوس کر دینا بالکل جائز ہے۔

تیسرا شعر:۔ اے مسلمان! اگر تجھ میں یہ قوت نہیں ہے کہ تو زور شمشیر اپنی قوم کی وحدت کو برقرار رکھ سکے تو پھر اس کے سوا اور صورت ہی کیا ہے کہ تو کسی غار میں بیٹھ کر اللہ اللہ کیا کرے۔

چوتھا شعر:۔ یا پھر ایسا اسلام ایجاد کر جس کا تصوف تجھے مسکینی و محکومی اور دائمی مایوسی کی تلقین کرے۔

پانچواں شعر:۔ مسلمان کو ہندوستان میں جو نماز پڑھنے کی اجازت ہے تو وہ نادان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام آزاد ہے حالانکہ اسلام ایک مستقل نظام زندگی کا نام ہے۔ اور نماز اس نظام کا صرف ایک جزء ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ انگریز نے مسلمان کو تو قدرے آزادی دیدی ہے کہ کلب میں جا سکتا ہے سینما دیکھ سکتا ہے۔ گھوڑ دوڑ میں جوا کھیل سکتا ہے۔ ہوٹل میں شراب پی سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اسلام کو پوری طرح محبوس کر رکھا ہے اگر کوئی مسلمان اسلامی زندگی بسر کرنا چاہے تو اس کی سزا اسے فوراً ملے گی ایک دن بھی اس کو آزاد نہیں چھوڑا جائے گا کیونکہ انگریز کی نگاہ میں اسلامی زندگی بسر کرنے سے امن عامہ میں خلل عظیم واقع ہوتا ہے اور اسی فتنہ کی روک تھام کے لئے "سیڈیشن ایکٹ" ایجاد کیا گیا تھا۔

(۵)

غزل

دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمّتوں کے مرضِ کہن کا چارہ
ترا بحر پُر سکوں ہے! یہ سکوں ہے یا فسوں ہے
نہ نہنگ ہے، نہ طوفاں، نہ خرابیٔ کنارہ
تو ضمیرِ آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے
نہیں بے قرار کرتا تجھے غمزۂ ستارہ
ترے نیستاں میں ڈالا مرے نغمۂ سحر نے
مری خاک پے سپر میں جو نہاں تھا اک شرارہ
نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آ گئی میسّر مری شوخیٔ نظارہ

(٭)

شرح مشکلات

پہلا شعر:- اے مسلمان! تیرا دل جذبۂ محبت سے خالی ہے اس لئے مردہ ہے لہذا اگر تو دنیا میں سربلندی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اپنے دل کو زندہ کر لے کیونکہ دنیا میں قوموں کے مرض کہن یعنی غلامی کا علاج صرف یہی ہے کہ وہ اپنے دلوں میں آزادی

کا بے پناہ جذبہ پیدا کرلیں۔ جب دل میں کسی شئے کے حصول کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے تو گویا وہ زندہ ہو جاتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ مجھے افسوس ہے کہ تیرے دل میں کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا کوئی امنگ نظر نہیں آتی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے تجھ پر جادو کر کے عقل و خرد سے بے گانہ کر دیا ہے جو تو مشکلات اور مصائب سے اس قدر گھبرا جاتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو نے قوانین فطرت کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ فطرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر شخص آزاد فضا میں زندگی بسر کرے۔

چوتھا شعر:۔ اسی لئے میں نے تیری زندگی میں ہلچل پیدا کرنے کا انتظام کیا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تیرے دل میں آزادی کی تڑپ پیدا ہو جائے لیکن تیرے دل میں یہ تڑپ اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب تو میرے کلام کو غور سے پڑھے اور سمجھے اور فطرت کا مطالعہ میرے زاویۂ نگاہ سے کرے۔

دنیا

مجھ کو بھی نظر آتی ہے یہ بوقلمونی
وہ چاند، یہ تارا ہے، وہ پتھر یہ نگیں ہے
دیتی ہے مری چشمِ بصیرت بھی یہ فتویٰ
وہ کوہ، یہ دریا ہے، وہ گردوں، یہ زمیں ہے
حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے، تجھے جو کچھ نظر آتا ہے، نہیں ہے!

(:)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ صرف انسانی خودی کا وجود حقیقی ہے یعنی خودی باقی رہنے والی شئے ہے اور اس کے علاوہ کائنات کی سب چیزیں غیر حقیقی اور فانی ہیں۔ اس نکتہ کی صراحت ضروری ہے کیونکہ انسان بھی فانی ہے بایں معنیٰ کہ اس پر بھی موت وارد ہوگی۔ لیکن انسان اور دوسری چیزوں میں فرق یہ ہے کہ انسان کی خودی باقی رہے گی۔ دوسری اشیاء مثلاً سورج چاند۔ ستارے۔ پتھر۔ پہاڑ۔ جواہرات۔ دریا۔ آسمان اور زمین حشرات الارض وحوش وطیور سب فنا ہو جائیں گی۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں جو بوقلمونی یعنی اختلاف ہیئت نظر آتا ہے میں اس کا انکار نہیں کرتا۔ مثلاً چاند۔ تارا۔ پتھر اور نگینہ باہم مختلف نظر آتے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ اور میری بصیرت مجھے یہ بھی بتاتی ہے کہ فلاں شے پہاڑ ہے۔ فلاں شے دریا ہے۔

تیسرا شعر:۔ لیکن جو بات حق ہے میں اُسے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا اور سچی بات یہ ہے کہ اے انسان! صرف تو حقیقی معنی میں موجود ہے تیرے علاوہ جو کچھ ہے اس کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ صرف تیری خودی باقی ہے یہ دنیا فانی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا مقصود اس فعل تخلیق کائنات سے صرف یہ ہے کہ تو اپنی خودی کو اس کے رسولِ پاکؐ کی غلامی اختیار کر کے مرتبہ کمال تک پہنچا سکے اور یہ جو کچھ تیرے علاوہ اس کائنات میں تجھے نظر آتا ہے یہ سب اسی مقصدِ عظمیٰ کے لئے پیدا کیا گیا ہے یہ کوہ و دریا۔ شمس و قمر۔ آسمان اور زمین سب تیرے خدمت گذار ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اگر ہے تو صرف اتنی کہ تو ان کو اپنی خودی کی تکمیل کے لئے استعمال کرے۔ یہی وجہ ہے کہ تیری خودی باقی ہے اور یہ ساری کائنات فانی ہے۔ اقبالؔ نے اس خیال کو متعدد بار کئی مقامات پر مختلف طریقوں سے ظاہر کیا ہے۔ مثلاً بالِ جبریل میں لکھتے ہیں۔

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمودِ سیمابی

گلشن زار میں لکھتے ہیں۔

وجودِ کوہسار و دشت و در ہیچ
جہاں فانی۔ خودی باقی دگر ہیچ

مقصود اقبال کا اظہار اس حقیقت سے یہ ہے کہ اے مسلمان! جب یہ مسلّم ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ کسی چیز کو ثبات و دوام نہیں ہے۔ آج ہے کل نہیں ہے تو کس قدر بے وقوفی کی بات ہے کہ تو ان موہوم اشیاء کی طلب میں اپنی تخلیق کے اصل مقصود سے غافل ہو جائے تجھے اللہ نے اس لئے تو پیدا نہیں کیا کہ تو زن۔ زر۔ یا زمین کے حصول میں تضیعِ اوقات کر کے اپنی خودی کو تباہ کرے یاد رکھ دنیا کی کوئی چیز مومن کے لئے مقصود بالذات نہیں ہو سکتی۔ بیشک وہ شادی بھی کرتا ہے تجارت بھی کرتا ہے اور مکان بھی بناتا ہے لیکن عورت۔ دولت اور عمارت ان فانی چیزوں سے دل نہیں لگاتا۔ وہ ان سب کو اپنی خودی کے لئے استعمال کرتا ہے لیکن ان کی محبت میں گرفتار ہو کر اللہ سے غافل نہیں ہوتا وہ ہر گھڑی اس صداقت کو پیش نظر رکھتا ہے کہ دنیا اور اس کی زندگی سراسر دھوکا ہے اور عقلمند وہ ہے جو اس دھوکے میں نہ آئے اور صرف اللہ سے لَو لگائے جہاں کسی مسلمان نے اللہ کو چھوڑ کر غیر سے دل لگایا اسی وقت وہ اپنے مقام سے گر جاتا ہے اور اگر توبہ نہ کرے تو اس کی بربادی بالکل یقینی ہے۔

نماز

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(∴)

شرح مشکلات اس دو شعر کی نظم میں اقبال نے نماز کی حقیقت بیان کی ہے یعنی اگر مسلمان سچے دل سے خدا پرستی اختیار کرے تو ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:- اے مسلمان! کفر اور اسلام کی آویزش آدم کے وقت سے چلی آ رہی ہے اس لئے کفر (شیطان) ہر زمانہ میں مسلمان کو راہ راست سے برگشتہ کرنے کے لئے نئی نئی قسم کے بت تراشتا رہتا ہے اور ان کو دلفریب شکلوں میں مسلمان کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے مثلاً پہلے زمانہ میں لات و منات مشہور بت تھے اس زمانہ میں عہدے۔ مناصب و خطابات۔ فارن سروس۔ اور جاگیریں وہ دلفریب بت ہیں جو مسلمان کو صراط مستقیم سے برگشتہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

دوسرا شعر:- ان بلند مناصب کے حصول کے لئے مسلمان ارباب حکومت کی عیش گاہوں اور کوٹھیوں کا طواف کرتا ہے اور جب باریاب ہوتا ہے تو مسلسل سجدے کرتا ہے اور کبھی کبھی تو برسوں سجدے کرنا پڑتے ہیں تب کوئی عہدہ ملتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمان! اگر تو صرف خدائے واحد کو اپنا معبود اور مسجود بنالے اور صرف اس کے سامنے خلوص سے سجدہ کرلے تو میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تجھے سینکڑوں جھوٹے اور فانی خداؤں کے سامنے سجدہ کرنے سے نجات مل جائے گی۔

لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ تو اس "ایک سجدہ" کو تو بہت گراں سمجھتا ہے اور مجازی خداؤں و قبروں کے سامنے ہزاروں سجدے کرنا آسان سمجھتا ہے "ایک سجدہ" کے معنی ہیں صرف ایک خدا کو سجدہ کرنا۔

وحی

عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا، جذبِ عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات
خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیونکر
گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے وحی کی ضرورت عقلاً ثابت کی ہے۔ کہتے ہیں کہ۔

پہلا شعر:۔ عقل چونکہ بے مایہ ہے یعنی اسرارِ حیات سے واقف بہت ہے اس لئے عقلاً ثابت ہے کہ وہ امامت یا رہبری یا رہنمائی کی سزاوار نہیں ہے[1] عقل کا سرمایہ محض ظن و تخمین ہے یعنی قیاس گمان اندازہ یا اٹکل اور اگر انسان محض قیاسات پر زندگی بسر کرنے لگے تو اس کی بربادی یقینی ہے۔

مثلاً ہمیں ایک لق و دق صحرا کو عبور کرنا ہے ہم نے قیاس کر لیا کہ اس صحرا (ریگستان) میں کہیں نہ کہیں پانی ضرور ملے گا اس لئے پانی کا ذخیرہ ساتھ نہیں لیا اتفاق ایسا ہوا کہ پانی کہیں نہ ملا لہٰذا ہماری بربادی (موت) یقینی ہے۔

دوسرا شعر:۔ اے انسان! تیری عقل بے مایہ ہے۔ تیری فکر بے نور ہے یعنی تو اکثر اوقات اپنے استنباط اور استخراج میں غلطی کر جاتا ہے اور تیرا جذبِ عمل بے بنیاد ہے یعنی عمل کرنے کے لئے جو جذبہ تیرے اندر پیدا

---

[1] واضح ہو کہ تمام عقلائے دہر کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ فکرِ انسانی سے غلطی کا صدور ممکن ہے اس لئے انہوں نے منطق کا فن ایجاد کیا جس کا مقصد ذہن انسانی کو وقت استدلال و استنباط و استخراجِ مسائل غلطی سے محفوظ رکھنا ہے لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے عقلمندوں سے روزمرّہ بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں اور یہ بات ہر انسان کے تجربہ میں آتی رہتی ہے کہ وہ قیاس کچھ کرتا ہے اور وقوع میں کچھ آتا ہے۔ پس وحی کی ضرورت ثابت ہے۔

ہوتا ہے یا جس جذبہ کی بنا پر تو آمادۂ عمل ہوتا ہے وہ جذبہ کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہے بعض اوقات تو عمل کسی عمل پر راغب ہوتا ہے لیکن فوراً دوسرا خیال آتا ہے اور اس جذبہ کو فنا کر دیتا ہے اور جب عمل کا داعیہ ہی ختم ہو جائے تو عمل کس طرح ہو سکتا ہے۔

اندریں حالات جبکہ تیری عقل بے مایہ ہے۔ تیری قوتِ متفکرہ بے نور ہے اور تیرا جذبۂ عمل بے بنیاد ہے۔ زندگی کی تاریک رات کیسے منور ہو سکتی ہے؟ یعنی زندگی کے پیچیدہ اور دشوار مسائل کیسے حل ہو سکتے ہیں؟

تیسرا شعر پس ہم عقلاً اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اگر حیات اپنے اسرار و رموز کی شرح خود ہی نہ کرے تو ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں عمل اچھا ہے فلاں عمل برا ہے؟ اگر حیات خود شرح اسرار نہیں کرتی تو پھر فعلِ تخلیق انسان عبث قرار پائے گا یعنی جب کوئی صحیح راہنما نہیں تو انسان راہِ حیات کس طرح طے کر سکتا ہے؟ تو پھر اُسے پیدا کر کے خدا نے اس سے یہ کیوں کہا کہ صراط مستقیم پر چل؟ پس ثابت ہوا کہ خود حیات کا تقاضا ہے کہ اُسے ہدایت ملے اور یہ ہدایت جو بعض کامل اور اکمل انسانوں کے واسطہ سے دنیا کو ملتی ہے۔ اصطلاح میں وحی کہلاتی ہے اور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات اس کائنات میں وحی کا سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ سرچشمہ ہے۔

شکست

ریاض منزل (دولت کدہ سر راس مسعود) بھوپال میں لکھے گئے

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست
فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

شرحِ مشکلات

اس نظم میں اقبالؔ نے مسلمانوں کو شکست کا حقیقی مفہوم سمجھایا ہے۔ کہتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ صوفی میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ بالکل سرد ہو چکا ہے اور اس حرارت کے فنا ہو جانے کا باعث یہ ہے کہ موجودہ دور کے صوفیوں میں بہت سے غیر اسلامی عقیدے راسخ ہو گئے ہیں۔ مثلاً یہ قرآنی آیت بتلاتی ہے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو تمام روحوں نے کہا بیشک تو ہمارا رب ہے۔

جس میں اقرارِ عبودیت کی صراحت کی گئی ہے جاہل صوفیوں کے لئے بے عملی کا بہانہ بن گئی اس طرح کہ حجرے میں بیٹھے ہوئے خدا کی یاد کی شراب پیتے رہو یعنی بس حجرے میں بیٹھ کر خدا کو یاد کرتے رہو اور دنیا سے بے خبر ہو جاؤ اور جب کوئی سوال کرے کہ کیا کر رہے ہو تو کہہ دو کہ ہم تو جام اَلَسْتُ پی کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ یہ تو ہوا موجودہ دور کے صوفی کا حال اب رہے علماء اور فقہاء تو وہ بھی اگرچہ زبان سے رہبانیت کی تردید کرتے ہیں لیکن عمل ان کا اسی غیر اسلامی اصول پر ہے یعنی جہاد سے وہ بھی جان چراتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے تو آدمی سیفٹی ایکٹ کے شکنجہ میں کس دیا جاتا ہے۔

واضح ہو کہ یہ سیفٹی ایکٹ دراصل حکومت برطانیہ نے اپنی سیفٹی کے لئے بنایا تھا تاکہ ہر مجاہد محبوس زنداں کیا جا سکے۔

تیسرا شعر:۔ پس کشمکشِ حیات سے مسلمانوں کا گریز کرنا دراصل یہی تو شکست ہے ورنہ اگر مومنوں کو بحکم الٰہی کسی معرکہ میں شکست ہو جائے تو وہ شکست نہیں ہے جس طرح جنگ احد میں جو مسلمانوں کو شکست ہوئی اسے ہم شکست تو نہیں کہتے ہیں کیونکہ یہی شکست فتح مکہ کا ذریعہ بن گئی شکست یہ ہے کہ مسلمان ہمت ہار کر بیٹھ جائے یا میدان جنگ میں جانے سے جی چرائے یا اصل شکست یہ ہے کہ مسلمان قید و بند یا جیلخانہ کی سختیوں یا میدان جنگ میں جانے سے جان چرائے پس مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ اپنے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا کریں۔

عقل و دل

ہر خاکی و نوری پہ حکومت ہے خرد کی
باہر نہیں کچھ عقلِ خداداد کی زد سے
عالم ہے غلام اس کے جلالِ ازلی کا
اک دل ہے کہ ہر لحظہ الجھتا ہے خرد سے

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے عقل و دل کے باہمی رشتہ کو واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ :۔

پہلا شعر:۔ کائنات کی ہر چیز پہ خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی عقل کی حکومت ہے اور دنیا کی ہر چیز تک عقل کی رسائی ہے۔

دوسرا شعر:۔ غرض ایک دنیا عقل کی غلام ہے اور اس کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتی ہے لیکن اس کائنات میں صرف ایک چیز ایسی ہے جو ہر لحظہ اس فرمانروا یعنی عقل سے الجھتی رہتی ہے اور اس کے کہنے کے خلاف کرتی رہتی ہے اور وہ چیز دل ہے۔

مثلاً عقل یہ کہتی ہے کہ دیکھو! اربابِ حکومت کی شان میں قصیدہ خوانی کرو وہ اگر دن کو رات کہیں تو تم یہ کہو بیشک رات ہے وہ دیکھ لیجئے

تارے بھی تو نکلے ہوئے ہیں ان کے ظلم کو کرم سے تعبیر کرو ان کی برائیوں کو بھلائیوں کے رنگ میں پیش کرو تاکہ تمہیں عہدے اور جاگیریں حاصل ہو سکیں لیکن دل کہتا ہے چند روزہ زندگی کے لئے ضمیر فروشی اور دروغ بافی کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں ہے۔

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

(:)

مستیٔ کردار

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال
ملّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مُردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست! نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

(:)

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے مستی کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں اور تین موجودہ صورتوں کو بیان کرنے کے بعد چوتھی صورت

کے فقدان پر ماتم کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ صوفی کی طریقت میں تو فقط مستیٔ احوال پائی جاتی ہے اور ملّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار نظر آتی ہے۔

احوال۔ طریقت کی اصطلاح ہے یعنی وہ روحانی منزلیں جو ایک سالک اپنے روحانی عروج کے سلسلہ میں طے کرتا رہتا ہے یعنی صوفی کے یہاں حال ہی حال ہے اور مُلّا کے یہاں قال ہی قال ہے۔

دوسرا شعر:۔ اب رہے شعراء تو ان کے یہاں نری مستیٔ افکار ہے وہ ہر وقت فکرِ سخن میں مست رہتے ہیں اور دنیا سے بے خبر ہیں ان کی زندگی بیداری اور خواب کے درمیان بسر ہوتی ہے اور ان کی شاعری مردہ اور افسردہ اور بے ذوق ہے۔

تیسرا شعر:۔ الغرض ہماری قوم میں صوفی بھی ہیں اور ملا بھی ہیں اور شاعر بھی ہیں اور سب ماشاء اللہ قابلِ رشک ہیں لیکن کوئی ایسا مردِ مجاہد نظر نہیں آتا جس کی رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار ہو۔ یہ مستی کی چوتھی قسم ہے اور اسلام یہی مستی پیدا کرنا چاہتا ہے آپ قرآن مجید کا مطالعہ کریں ہر جگہ یہی نظر آئے گا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ یعنی انسان گھاٹے میں ہے مگر وہ لوگ گھاٹے میں نہیں ہیں جو ایمان لاکر اعمال صالح بجا لائیں۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے ہر جگہ عمل صالح ہی کی تاکید کی ہے اور ساری دینی اور دنیاوی کامیابیوں کو عمل صالح ہی پر موقوف کیا ہے خود

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ مسلسل اور پیہم عمل صالح کی بہترین مثال ہے اور اس بات کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اقبال کا فلسفہ خودی اس کے سوا اور کیا ہے کہ عمل صالح کی مداومت سے خودی کو مستحکم کرو۔ تاکہ خودی اپنے مقام تک پہنچ سکے اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے اپنے کلام میں قرآن و حدیث کا عطر کھینچ کر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

قبر

مرقد کا شبستاں بھی اسے راس نہ آیا
آرام قلندر کو تہِ خاک نہیں ہے
خاموشیِ افلاک تو ہے قبر میں لیکن
بے قیدی و پہنائی افلاک نہیں ہے

شرح مشکلات

اس دو شعر کی نظم میں اقبال نے قلندر (مرد مومن) کی ایک خاص صفت کا بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں

پہلا شعر:۔ قلندر کو مر کر بھی آرام و سکون نصیب نہیں ہوتا۔ مرقد کا شبستاں بھی اسے راس نہیں آتا۔ کیوں؟

دوسرا شعر:۔ قبر میں افلاک کی سی خاموشی تو ہے لیکن ان کی

سی وسعت نہیں ہے اور قلندر چونکہ مردِ آفاقی ہوتا ہے اس لئے اس کا زاویۂ نگاہ بھی نہایت وسیع ہو جاتا ہے۔ چونکہ دنیاوی زندگی میں وہ ساری دنیا پر حکمراں ہوتا ہے اس لئے قبر کی چند گز زمین بھلا اسے کیسے راس آسکتی ہے؟

یہ شاعرانہ اندازِ بیان کی بہترین مثال ہے کہ اقبال نے کس خوبی سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ قلندر کی طبیعت قید اور حد سے نفرت کرتی ہے کیونکہ اس میں الٰہی صفات کا پرتو ہوتا ہے اور اللہ کی یہ صفت ہے کہ وہ غیر محدود اور لانہایت ہے۔ لہٰذا مومن مرد (قلندر) میں بھی یہی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

قلندر کی پہچان

کہتا ہے زمانے سے یہ درویشِ جوانمرد
جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی اُدھر جا
ہنگامے ہیں میرے تری طاقت سے زیادہ
بچتا ہوا بنگاہِ قلندر سے گذر جا
میں کشتی و ملّاح کا محتاج نہ ہونگا
چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تُو تو اُتر جا
توڑا نہیں جادو مری تکبیر نے تیرا
ہے تجھ میں ٹکر جانے کی جرأت تو ٹکر جا

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ہم کو قلندر کی پہچان بتائی ہے واضح ہو کہ اقبال کے کلام میں قلندر۔ مومن۔ مرد حر فقیر۔ مرد آزاد۔ مرد حق آگاہ خدامست اور بندۂ حق۔ یہ سب مرادف الفاظ ہیں۔ یعنی وہ شخص جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع سے اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچا لیا ہو۔

اقبال کہتے ہیں کہ قلندر کی پہچان یہ ہے کہ وہ زمان و مکان پر حکمراں ہوتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ وہ اللہ کا نائب ہوتا ہے اور چونکہ اللہ زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے۔ اس لئے وہ بھی بالاتر ہوتا ہے اقبال نے اس نظم میں اسی نکتۂ عمیق کو شاعرانہ انداز سے واضح کیا ہے۔

پہلا شعر:۔ فرماتے ہیں کہ قلندر زمانہ سے یہ کہتا ہے کہ تجھے مرد مومن کی مرضی پر چلنا ہوگا۔ واضح ہو کہ کفار کا مقولہ یہ ہے کہ

انسان کو زمانہ کی پیروی کرنی چاہیئے۔

لیکن مومن کا مسلک یہ ہے کہ

"زمانہ کو مومن کی اتباع چاہیئے"۔

دوسرا شعر:۔ قلندر زمانہ سے کہتا ہے چونکہ میرے ہنگامے

تیری طاقت سے زیادہ ہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ تو میری قیام گاہ سے کترا کر یعنی اپنا دامن بچا کر نکل جا۔ اگر تو میری زد پر آ گیا تو میں تجھے اسیر کئے بغیر نہیں چھوڑوں گا تو ساری دنیا کو اپنا پابند بنا سکتا ہے لیکن مومن کو اپنا مطیع نہیں بنا سکتا کیونکہ وہ تو تجھ پر حکمرانی کے لئے پیدا ہوا ہے۔

تیسرا شعر: میری شان یہ ہے کہ اگر تو چڑھتے ہوئے دریا کی شکل میں میرے سامنے آئے تو میں کشتی اور ملاح کا محتاج نہیں بنوں گا بلکہ تجھ کو حکم دوں گا کہ تو پایاب[1] ہو جا۔

چوتھا شعر: کیا میری تکبیر نے تیرے طلسم کو پاش پاش نہیں کر دیا اگر تجھ میں حقائق تاریخ کو جھٹلانے کی جرأت ہو تو جھٹلا دے لیکن میں جانتا ہوں کہ تو ایسا نہیں کر سکتا۔[2]

پانچواں شعر: قلندر تو تمام عناصر کائنات اور اجرام سماوی کا محاسب ہے سب پر حکمراں ہے اور زمانہ کا مرکب نہیں بلکہ راکب ہے۔

---

[1] چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا کو ایسا ہی حکم دیا تھا اور وہ بحکم الٰہی ان کے کہنے سے پایاب ہو گیا تھا۔

[2] حضرت حکیم الامۃ مجدد تھانویؒ روزانہ ڈیڑھ سو خطوط کا جواب اپنے قلم سے تحریر فرماتے تھے اور زندگی میں چھوٹی بڑی ۸۳۵ کتابیں تصنیف فرمائیں اور ہر روز صدہا افراد سے گفتگو فرماتے تھے اور ساری عمر مواعیظ کا سلسلہ جاری رہا۔ کیا یہ "زمان" پر حکومت کا ثبوت نہیں ہے۔

یعنی زمانہ اس پر حکمراں نہیں ہے بلکہ وہ زمانہ پر حکمراں ہے۔

نوٹ:۔ اس جگہ شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اقبالؔ نے یہ نہیں بتایا کہ قلندر یا مردِ مومن زمان و مکان پر کس طرح حکمراں ہو جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب مومن اتباعِ شریعت کا اعلیٰ امتحان پاس کر لیتا ہے تو اس کی خودی میں یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے اب یہ شبہ کرنا کہ کیسے پیدا ہو جاتی ہے۔ بالکل فضول ہے کیونکہ جس کو یہ آرزو ہو وہ اس نسخہ کو آزما کر دیکھ لے۔

فرض کیجئے کہ آپ کسی مرض میں مبتلا ہیں اور اس کے ازالہ کے لئے آپ کسی طبیب کے پاس جاتے ہیں وہ آپ سے کہتا ہے کہ اس نسخہ کا اس طریقہ سے استعمال کرو تو تمہارا مرض دور ہو جائے گا۔ لیکن آپ اس سے کہتے ہیں کہ پہلے منطقی طور پر ثابت کر دو کہ اس نسخہ سے میرا مرض دور ہو جائے گا تو آپ خود ہی غور کر لیں وہ طبیب یا دوسرے عقلاء آپ کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔

جس طرح محض زبان سے یہ کہنے سے کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملانے سے پانی بنتا ہے۔ درحقیقت پانی نہیں بن سکتا جب تک لیبارٹری میں جا کر دونوں گیسوں کو عملی طور پر ملایا نہ جائے اسی طرح جب تک مرشد کی خانقاہ میں جا کر اس سے زمان و مکان پر حکمرانی کا طریقہ عملی طور سے حاصل نہ کیا جائے کوئی شخص محض اس علم سے یا زبان سے یہ بات کہہ دینے سے زمان و مکان پر حکمران نہیں بن سکتا۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپ سے پوچھے کہ بنارسی آم اور فجری آم اور دسہری آم ان تینوں آموں کی مٹھاس میں کیا

فرق ہے ؟ تو کیا آپ زبانی طور پر اس فرق کو بیان کر سکتے ہیں ؟ یا سائل کی تسلی کر سکتے ہیں ؟ یا سائل خود تینوں آموں کی مٹھاس سے واقف ہو سکتا ہے ہرگز نہیں ! کیوں ؟ اس لئے کہ مٹھاس کا علم مٹھائی چکھنے سے حاصل ہوتا ہے اسی طرح زمان و مکان پر حکومت کا علم ان پر حکومت کرنے سے بالفاظِ دگر شانِ قلندری پیدا کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے زبانی طور پر کوئی شخص نہیں بتا سکتا کہ قلندر زمان و مکان پر کیونکر حکمراں ہو جاتا ہے۔ کیا خوب کسی شاعر نے کہا ہے۔ ع ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

یعنی شراب کی لذت صرف پینے کے بعد معلوم ہو سکتی ہے۔

فلسفہ

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں مردِ قلندر کی نظر سے
معلوم ہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گذرا تھا اسی راہ گذر سے
الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے
پیدا ہے فقط حلقۂ ارباب جنوں میں
وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے

جس معنیٔ پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا جونِ جگر سے!

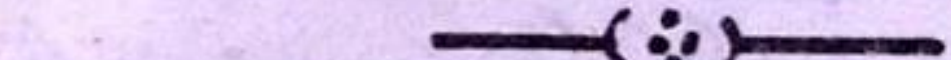

شرح مشکلات | اس نظم میں اقبال نے فلسفہ کی حقیقت بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فلسفہ عقلی کاوشوں یا موشگافیوں کا دوسرا نام ہے اور وہ عقل صرف ارباب جنون یعنی عاشقانِ حق کے حلقہ میں بیٹھنے سے پیدا ہو سکتی ہے جو حق و باطل میں امتیاز کر سکتی ہے۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ کالج کے جوانوں کے افکار خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ قلندر کی نگاہ سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔

دوسرا شعر:۔ اے کالج کے مغرب زدہ مسلمان! مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تو کس قسم کے تشکیک آمیز اور الحاد انگیز خیالات میں مبتلا ہے تیرا دماغ شکوک اور شبہات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے کیونکہ میں خود جب کالج میں کافروں کے مقرر کردہ نصابِ[1] تعلیم کا مطالعہ کر رہا تھا تو اسی قسم کے ناپاک اور غیر اسلامی خیالات کا شکار رہتا تھا۔

---

[1] یہ کافرانہ نظام اور نصاب تعلیم ابھی تک ہمارے سروں پر مسلط ہے۔

تیسرا شعر:۔ لیکن عقل مند آدمی کبھی لفظی بحث نہیں کرتے ان کو تو معنیٰ سے علاقہ ہوتا ہے نہ کہ لفظ سے جس طرح غوطہ خور اگرچہ صدف کی تلاش کرتا ہے لیکن اس کا مقصود صدف نہیں بلکہ گوہر ہوتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ پس اگر تجھے معنی کی آرزو ہو یعنی حقیقت سے آگاہ ہونے کا شوق ہو تو وہ عقل پیدا کر جو شعلہ اور شرر میں تمیز کر سکے اور یہ عقل کتابوں سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ ارباب جنون کی سوسائٹی کا ممبر بننے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

پانچواں شعر:۔ جب تجھے اللہ اور رسولؐ کے عاشقوں کی صحبت کے طفیل میں وہ عقل حاصل ہو جائے گی (اور اس عقل کو اصطلاح میں نورِ قلب کہتے ہیں) تو پھر تیرا دل جس فلسفہ کی تصدیق کر دے پس وہی صحیح اور موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور جو فلسفہ عقلی مسئلہ کی تصدیق نہ کرے وہ غلط ہے بلکہ مہمل ہے۔

چھٹا شعر:۔ یاد رکھ! کہ جو فلسفہ خونِ جگر سے نہ لکھا جائے یعنی جس فلسفہ کو دل کی تائید حاصل نہ ہو وہ یا تو مردہ ہے یا قریب الموت ہے یعنی وہ کسی توجہ کا مستحق نہیں ہے بالکل غلط ہے اور گمراہی کا باعث ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ مومن کا دل یا نورِ ایمانی فلسفہ کی صحت کی کسوٹی ہے صحیح فلسفہ وہ ہے جس کی صحت کی تصدیق "دل" کرے۔

(٭)

مردانِ خدا

وہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیّاری
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری
وجود انہیں کا طوافِ بتاں سے ہے آزاد
یہ تیرے مومن و کافر تمام زنّاری

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے مردانِ خدا یعنی قلندروں کی شان واضح کی ہے۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ مردِ حر کی شناخت یہ ہے کہ اس کی ضرب کاری ہوتی ہے وہ کفر کے حق میں بلائے بے درماں ہوتا ہے[1]۔ وہ شخص

---

[1] قرآن حکیم میں مومنوں کے لئے اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ آیا ہے یعنی مومنوں کی شناخت یہ ہے کہ وہ کافروں پر بڑے ہی سخت ہوتے ہیں ان کے ساتھ مطلق کسی قسم کی رعایت نہیں کرتے۔

مردِ حر کا لقب ہرگز نہیں پا سکتا جس کی حرب (جنگ) تمام عیاری اور مکاری پر مبنی ہو۔

واضح ہو کہ انگریزوں کی تمام جنگیں جو انہوں نے ۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں لڑیں سب کی سب عیّاری و مکّاری اور دھوکہ پر مبنی تھیں۔

دوسرا شعر:۔ احرار کی فطرت میں ہمیشہ سے دو شانیں نظر آتی ہیں۔ قلندری اور کلاہ داری یعنی درویشی اور سلطانی۔

تیسرا شعر:۔ اور وہ چنگاری۔ جسے زمانہ دنیا میں آفتاب کی طرح چمکاتا ہے انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے یعنی وہ تمام کارنامے جن پر زمانہ فخر کر سکتا ہے ہمیشہ مردانِ حر ہی نے انجام دیئے ہیں۔

چوتھا شعر:۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہر قسم کی بت پرستی سے پاک ہیں یہ دنیا کی کسی طاقت یعنی کسی بت کے سامنے سجدہ نہیں کرتے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی بتوں کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔

واضح ہو کہ غیر اسلامی حکومت میں اربابِ حکومت کے سامنے ہاتھ پھیلانا بھی بت پرستی ہے۔ یا اللہ اور رسول ﷺ کے سوا کسی اولیاء اور اماموں اور پیروں کی اطاعت کرنا یہ بھی بت پرستی ہے۔

—(٭)—

کافر و مومن

کل ساحلِ دریا پہ کہا مجھ سے خضر نے
تو ڈھونڈھ رہا ہے سمِ افرنگ کا تریاق
اک نکتہ مرے پاس ہے شمشیر کی مانند
برّندہ و صیقل زدہ و روشن و برّاق
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

—(❁)—

شرح مشکلات اس مختصر سی نظم میں اقبالؔ نے کافر اور مومن میں فرق واضح کیا ہے کہتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ کل دریا کے کنارے میری ملاقات حضرت خضر سے ہوئی انہوں نے مجھ سے پوچھا تو کیا ڈھونڈھ رہا ہے؟ میں نے کہا سمِ افرنگ کا تریاق ڈھونڈھ رہا ہوں؟ یعنی انگریزوں نے میری قوم کی ذہنیت کو مسموم (یعنی غیر اسلامی) کر دیا ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کا تریاق ہاتھ آجائے تو اپنی قوم کو از سر نو مسلمان بنا دوں۔

دوسرا شعر:۔ حضرت خضر نے جواب دیا کہ میں تجھے ایسا

نکتہ بتاتا ہوں جو تلوار کی طرح کاٹ کرنے والا۔ صیقل زدہ اور روشن ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تو مسلمان کو یہ بتا دے کہ کافر اور مومن میں فرق کیا ہے تاکہ مسلمان اپنے آپ کو مومن بنالے اور جب وہ مومن بن جائے گا تو وہ سمِ افرنگ کا تریاق بھی حاصل کر سکے گا بلکہ وہ تریاق خود اس کے اندر پیدا ہو جائے گا۔

تیسرا شعر:۔ کافر اور مومن میں فرق یہ ہے کہ کافر آفاق میں گم ہو جاتا ہے اور مومن آفاق کو خود اپنے اندر گم کر دیتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر چونکہ توحید الٰہی سے بیگانہ ہوتا ہے اس لئے کائنات کی ہر چیز کو اپنا معبود اور اپنا مسجود بنا سکتا ہے بلکہ فی الحقیقت وہ بنا لیتا ہے اس لئے اس کی خودی مردہ ہو جاتی ہے اور وہ کائنات کا غلام ہو جاتا ہے۔ آفتاب و ماہتاب۔ دریا و پہاڑ۔ حیوانات مثلاً گائے اور تمام چیزوں کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور ان سے لامحالہ ڈرتا ہے۔

الغرض:۔ آفاق میں اس کی نہ کوئی حیثیت باقی رہتی ہے نہ وہ آفاق پر حکمرانی کر سکتا ہے حالانکہ خودی اس وقت اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ سکتی ہے جب انسان یہ یقین کرے کہ اس کائنات میں کوئی شئے نہ مجھ پر حاکم ہو سکتی ہے نہ میں کسی کا غلام ہو سکتا ہوں حتیٰ کہ کوئی انسان بھی مجھ پر حکومت نہیں کر سکتا صرف اللہ مجھ پر حکمراں ہے اور یہ کائنات میری غلام ہے لیکن اگر انسان خود عناصرِ کائنات کو اپنا معبود بنالے تو اس کی خودی مردہ ہو جائے گی اور یہ مطلب ہے آفاق میں گم ہو جانے کا۔

اس کے برعکس مومن یہ یقین کرتا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ میری خدمت کے لئے ہے کیونکہ توحید کا مفہوم یہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی طاقت مجھ پر حکومت نہیں کر سکتی۔ پس مومن کائنات پر حکمرانی کرتا ہے وہ اطاعت الٰہی کی بدولت اپنی خودی کی مخفی طاقتوں کو مرتبۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے اور جب خودی اپنے اصلی مقام یعنی خلافت الٰہیہ پر فائز ہو جاتی ہے تو یہ ساری کائنات مومن کی مطیع ہو جاتی ہے اور وہ زمان و مکان پر حکمراں ہو جاتا ہے اسی حقیقت کو اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے کہ آفاق مومن کے اندر گم ہو جاتے ہیں یعنی مومن کے مقابلہ میں آفاق کی کوئی حیثیت نہیں رہتی اور کافر کی حالت یہ ہے کہ آفاق کی طاقتوں کے سامنے اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اسی لئے علامہ اقبال نے بہت ہی صحیح کہا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مہدیٔ برحق

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار
پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدّتِ گفتار ہے، نے جدّتِ کردار
ہیں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اسی افلاسِ تخیّل میں گرفتار
دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار!

(❁)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ دنیا کو کس قسم کے مہدی کی ضرورت ہے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ مشرق کی جامد اقوام ہوں یا مغرب کی ترقی پسند اقوام ہوں سب کی سب ان خیالاتِ فاسدہ میں گرفتار ہیں جو خود ان کی ناقص عقل کے پیدا کردہ ہیں یعنی یہ قومیں صحیح علم یا معرفت حقائق سے محروم اور بیگانہ ہیں اس لئے لامحالہ غلط خیالات میں مبتلا ہیں۔ ان

خیالات کا سرچشمہ وحی الٰہی نہیں ہے بلکہ خود ان کی عقل ہے جو ناقص ہے اور صحیح رہنمائی سے قاصر ہے۔

دوسرا شعر:۔ پیرانِ کلیسا اور شیوخِ حرم دونوں اوہام باطلہ میں گرفتار ہیں نہ ان میں تحقیق کا ذوق ہے نہ حقیقت پژوہی کا مادہ ہے یعنی نہ جدّت گفتار ہے نہ جدّت کردار۔

تیسرا شعر:۔ یہی حال اہل سیاست اور شعراء کا ہے اہل سیاست بھی قدامت پرستی میں مبتلا ہیں اور شاعر اور ادیب بھی کوئی نیا خیال قوم کے سامنے پیش نہیں کرتے۔

چوتھا شعر:۔ آج دنیا کو ایسے مہدی کی ضرورت ہے جو پرانے فرسودہ اور دور افکار خیالات کا قلع قمع کر کے ایسے خیالات پیش کرے جن کی بدولت بنی آدم قدامت پرستی۔ کورانہ تقلید اور جمود کی دنیا سے نکل کر تحقیق اور انکشاف کی دنیا میں داخل ہو سکیں اور اس سے اسلام کی ترقی ہو۔

——(مژدہ)——

مومنؓ

(دنیا میں)

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیّاد ہے مومن

(جنت میں)

کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

○ بھوپال (شیش محل) میں لکھے گئے۔

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ مومن کی اس دنیا میں کیا شان ہے اور جنت میں کیا شان ہوگی۔

پہلا شعر:۔ اس دنیا میں مومن کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ دوستوں یعنی برادرانِ ملت کے حلقہ میں تو آبریشم کی طرح نرم (رحمدل) ہوتا ہے یعنی مسلمانوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتا ہے اور میدانِ جہاد میں وہی مومن فولاد کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔

واضح ہو کہ یہ شعر قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے بلکہ اس کا لفظی ترجمہ ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں یعنی آپ کے متبع ہیں ان کی شان یہ ہے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں ایک دوسرے پر رحیم ہیں۔

دوسرا شعر:۔ وہ برابر حوادثات عالم کا مقابلہ کرتا رہتا ہے اگرچہ وہ خاکی ہے لیکن خاک سے آزاد ہے یعنی یہ صحیح ہے کہ وہ مٹی سے پیدا ہوا ہے (فرشتہ یا جن نہیں ہے) لیکن نہ وہ مادہ پرست ہے نہ دنیا پرست ہے۔ نہ پست خیالات رکھتا ہے نہ لذاتِ دنیاوی کا خواہش مند ہے۔ نہ حریص و طمّاع ہے۔

واضح ہو کہ اسی حقیقت کو اقبال نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

جہاں میں لذّتِ پرواز حق نہیں اس کا
وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

تیسرا شعر:۔ اس کی بلندیٔ نظر کا یہ عالم ہے کہ وہ چیڑ یا اور کبوتر کا شکار نہیں کرتا یعنی عہدوں۔ جاگیروں اور خطابات کا آرزومند نہیں ہے بلکہ بلند مقاصد اپنے سامنے رکھتا ہے۔

(جنت میں)

جنت میں مومن کی زندگی اس نہج پر گذرے گی کہ فرشتے بھی اس کے حُسنِ سیرت سے متاثر ہو جائیں گے اور اس کی شخصیت کی دلکشی کا اعتراف کریں گے لیکن حوروں کو یہ شکایت ہو گی کہ مومن اپنا بہت کم وقت ہمارے ساتھ گذارتا ہے۔

یہ اقبال کا خاص اندازِ بیان ہے یعنی حوروں کو مومن سے شکایت ہو گی کہ وہ کم آمیز ہے۔ یہ کتنا دلکش اسلوب ہے اس بات کے اظہار کہ مومن اپنا زیادہ تر وقت غور و فکر۔ خلوت اور دیدارِ الٰہی کی لذت اس کے انتظار میں بسر کرے گا۔

محمد علی باب

تھی خوب حضورِ علما باب کی تقریر
بیچارہ غلط پڑھتا تھا اعرابِ سمٰوٰت
اس کی غلطی پر علما تھے متبسّم
بولا تمہیں معلوم نہیں میرے مقامات
اب میری امامت کے تصدّق میں ہیں آزاد
محبوس تھے اعراب میں قرآن کے آیات

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبالؔ نے اپنے مخصوص انداز میں محمد علی باب کی جہالت کا پردہ چاک کیا ہے اس شخص نے ۱۸۴۴ء میں بمقام طہران (ایران) یہ دعویٰ کیا کہ میں مامور من اللہ ہوں کہ لوگوں کو مہدی مسعود اور مسیح موعود کے قبول کرنے کے لئے تیار کروں جو میرے بعد ظاہر ہوگا اسی لئے میں نے باب کا لقب اختیار کیا یعنی سادہ دروازہ ہوں جس سے مسیح موعود دنیا میں داخل ہوگا۔

جب اس شخص نے ماموریت کا دعویٰ کیا تو ایران کے مجتہد اعظم نے اسکو طلب کیا اور بہت سے نامور علماء کو جمع کرکے اس سے گفتگو کی شیعہ

علماء کے برافروختہ اور مضطرب ہونے کی خاص وجہ یہ تھی کہ اس کے دعویٰ کی زد براہ راست شیعہ مذہب پر پڑتی تھی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ شیعہ (اثنا عشریہ) یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ بارہویں امام جن کا نام محمد تھا۔ تیسری صدی ہجری میں کسی دینی مصلحت کی بنا پر بارہ سال کی عمر میں روپوش ہو گئے اور ہنوز کسی غار یا مخفی مقام میں زندہ ہیں اور بحکم الٰہی وقت مقررہ پر خروج کریں گے۔ اور شیعان علی کو خلافتِ ارضی عطا فرمائیں گے۔

پہلا شعر:۔ اب اگر یہ شخص اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو پھر شیعہ مذہب بالکل غلط ہے اس لئے شیعہ علما نے اس سے مناظرہ کیا۔ دورانِ مناظرہ میں محمد علی باب نے اپنے دعویٰ کی تائید میں قرآن کی بعض آیات بھی پڑھیں لیکن لفظ "سمٰوٰت" کے اعراب[1] غلط پڑھے اس کی اس جہالت پر علما اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے اور بات بھی صحیح تھی جو شخص عربی کی عبارت صحیح نہ پڑھ سکے وہ قرآن مجید کی کسی آیت کی تفسیر کیسے کر سکتا ہے مثلاً جو شخص خَلَقَ السَّمٰوٰتِ کو خَلَقَ السَّمٰوَاتَ پڑھ دوسرے لفظوں

---

[1] اعراب سے حرکات ثلثہ یعنی زبر۔ زیر اور پیش مراد ہیں عربی زبان میں سامی زبانوں کی طرح اعراب کی صحت بہت ضروری ہے ورنہ مفہوم کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے مثلاً وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرَاهِيْمَ رَبُّهٗ کے معنی ہیں جب ابراہیم کے رب نے ابراہیم کو آزمایا۔ وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرَاهِيْمُ رَبَّهٗ کے معنی جب ابراہیم نے اپنے رب کو آزمایا اور یہ کفر ہے۔

میں یہ ثابت کر رہا ہے کہ میں عربی گرامر سے بالکل ناواقف ہوں اور اس قاعدہ سے واقف نہیں ہوں کہ سمٰوٰت کی حالت نصبی کو فتحہ سے ظاہر نہیں کرتے بلکہ کسرہ سے ظاہر کرتے ہیں۔

دوسرا شعر:- القصہ جب باب صاحب نے یہ دیکھا کہ علماء میری جہالت پر متبسم ہیں تو اس نے اپنی خفت مٹانے کے لئے کمال ایمانداری اور خلوص سے کام لے کر یہ ملا کہہ دیا کہ حضرات! افسوس ہے کہ آپ میری جلالتِ شان سے واقف نہیں۔ میں روحانیت کے اس بلند مقام پر پہنچ چکا ہوں جہاں پہنچ کر انسان صرف و نحو کی پابندیوں سے بالکل بالاتر ہو جاتا ہے۔ بیشک میرے ظہور سے پہلے آپ لوگوں نے قرآنی آیات کو صرف و نحو کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا

تیسرا شعر:- لیکن اب میری امامت کے طفیل میں آیاتِ قرآنی اعراب کی پابندی سے آزاد ہو گئی ہیں چنانچہ آج کی تاریخ سے سمٰوٰتُ سمٰوٰتَ اور سمٰوٰتِ تینوں صورتیں جائز ہیں۔

واضح ہو کہ نحوی اعتبار سے صرف ایک صورت سمٰوٰت میں جائز ہے یعنی ت کے نیچے زیر۔

نظم کا مطلب تو ختم ہو گیا ناظرین کی آگاہی کے لئے اس قدر اور لکھے دیتا ہوں کہ اقبال نے باب کا نام محمد علی لکھا ہے لیکن میں نے اکثر کتابوں میں علی محمد پڑھا ہے۔ بہرحال یہ کوئی بات اہم نہیں کیونکہ وہ تو محض "دروازہ" تھا نہ اسے محمد سے سروکار تھا نہ علی سے۔ نہ وہ محمد علی تھا نہ علی محمد۔

نوٹ:- قرۃ العین طاہرہ - ایران کی مشہور شاعرہ اسی باب کی پیرو تھی - باب کو ۱۸۵۰ء میں بحکم شاہ ایران گولی کا نشانہ بنایا گیا۔

تقدیر

(ابلیس و یزداں)

ابلیس

اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بَیر
آہ! وہ زندانیٔ نزدیک و دور و دیر و زُود
حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود

یزداں

کب کھلا تجھ پر یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد؟

ابلیس

بعد! اے تیری تجلّی سے کمالاتِ وجود!

بزداں

(فرشتوں کی طرف دیکھ کر)

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے
کہتا ہے تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

—(:)—

شرح مشکلات

زمان و مکان کے مسئلہ کے بعد اقبالؔ کو تقدیر کے مسئلہ سے بہت زیادہ دلچسپی رہی چنانچہ انہوں نے ان دونوں اہم مسئلوں پر بہت کچھ لکھا ہے اسرار خودی مطبوعہ ۱۹۱۴ء سے لے کر ارمغان حجاز مطبوعہ ۱۹۳۸ء تک ہر کتاب میں ان دونوں مسئلوں پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے چنانچہ اس نظم میں انہوں نے شیخ اکبر حضرت محی الدین المعروف بابن عربی کی شہرۂ آفاق کتاب فصوص الحکم سے مسئلہ تقدیر سے متعلق کچھ مطالب اخذ کر کے اشعار کے لباس میں پیش کئے ہیں بنیادی تخیل تو شیخ کا ہے انداز بیان اقبالؔ کا ہے۔

نوٹ:۔ شیخ اکبرؒ دنیا کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کے خیالات کو ہر صدی میں صرف چند لوگوں نے سمجھا اگرچہ اقبالؔ شیخ اکبر کے

خیالات سے بکلی متفق نہیں تھے لیکن انہوں نے ان کی تصانیف کا مطالعہ بہت غور سے کیا تھا اور خود ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ دنیا میں چار آدمی ایسے ہیں کہ جو شخص ان میں سے کسی ایک کے طلسم میں گرفتار ہو جاتا ہے بمشکل ہی سے رہائی پاتا ہے میں نے سراپا اشتیاق بن کر پوچھا وہ کون کون ہیں؟ جواب دیا ابن عربی۔ شنکر آچاریہ۔ بیدل اور ہیگل۔

(ابلیس و یزداں)

پہلا شعر:۔ ابلیس یزداں سے کہتا ہے کہ اے خالقِ کائنات مجھے آدم سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ آدم جو زمان و مکان کی قید میں گرفتار ہے۔ بھلا وہ اس قابل ہی کہاں تھا کہ میں اس مٹی کے پتلے اس زندانی نزدیک و دور) سے دشمنی کرتا۔ اور نہ مجھ میں اس قدر جسارت ہو سکتی ہے کہ میں تیرے سامنے صاف لفظوں میں تیرے حکم کی تعمیل سے انکار کرتا۔ لیکن یہ انکار جسے اے خدا تو حرف استکبار سے تعبیر کرتا ہے[2]۔ اس لئے سرزد ہوا کہ تیری مشیت ہی یہ نہ تھی کہ میں آدم کو سجدہ کروں لہٰذا میں کسی طرح قابلِ

---

[1] وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ
اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدہ میں گر پڑے ابلیس کے سوا۔

[2] اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۔ اس نے انکار کیا اور تکبّر (غرور) کیا اور اس تکبر کی بنا پر کافروں میں شامل ہو گیا۔

سرزنش نہیں ہوں۔

(یزداں)

اس پر یزداں دریافت کرتا ہے کہ یہ راز کہ میری مشیت نہ تھی کہ تو سجدہ کرے تجھ پر کب کھلا؟ انکار سے پہلے یا بعد میں؟

(ابلیس)

ابلیس جواب دیتا ہے کہ اے قادرِ مطلق کہ تو وہ ذات ہے کہ تیری صفات کی تجلیات سے وجود (کائنات۔ ملائکہ۔ آفاق اور انسان وغیرہ) مرتبۂ کمال کو پہنچتا ہے۔ یہ راز مجھ پر انکار کے بعد واضح ہوا۔

(یزداں)

دوسرا شعر:۔ یزداں فرشتوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ابلیس کی فطرت کی پستی نے اُسے یہ دلیل سکھائی ہے کہ "میں انکار پر مجبور تھا کیونکہ تیری مشیت ہی یہ نہیں تھی کہ میں سجدہ کروں" اس کی یہ بات بالکل غلط ہے۔ ظالم اپنی آزادی کو مجبوری کا نام دے رہا ہے میں نے اس کو اس معاملہ میں آزادی دیدی تھی یعنی اسے اختیار بخشا تھا خواہ سجدہ کرے یا نہ کرے یہ ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود ہی دھوئیں سے تعبیر کر رہا ہے آگ کو دھواں کہہ رہا ہے۔ اختیار کو جبر سے تعبیر کر رہا ہے۔ یعنی سراسر غلط بیانی کر رہا ہے۔

اے روحِ محمدؐ!

شیرازہ ہوا ملّتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا، تیرا مسلمان کدھر جائے
وہ لذّتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد
اس کوہ و بیاباں سے حُدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

(٭)

شرح مشکلات

اس نظم میں علامہ اقبالؔ نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ پُرفتوح سے استغاثہ کیا ہے۔

پہلا شعر:- اے تاجدارِ مدینہؐ! آپ کی قوم کا شیرازہ بالکل بکھر چکا ہے اس لئے دنیا میں کوئی قوم اس کی عزّت نہیں کرتی اب آپ ہی فرمائیں کہ آپ کے یہ نالائق غلام کہاں چلے جائیں۔

دوسرا شعر:- مسلمانوں میں سرفروشی کا مادہ بالکل باقی نہیں

رہا۔ لہٰذا میں اب کس قوم کو جہاد کی تعلیم دوں۔ مسلمان تو نہ میری تعلیم کو سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت مسلمان بالکل بے سروسامانی کی حالت میں ہیں نہ ان کے پاس دولت ہے نہ تجارت ہے نہ علم ہے اور نہ ان کے پاس کسی قسم کی مادی طاقت ہے نہ روحانی قوت ۔ یہ بالکل صحیح ہے لیکن بہرحال وہ آپؐ کا کلمہ پڑھتے ہیں آخر وہ کس ملک میں چلے جائیں ؟

چوتھا شعر:۔ اب وقت آگیا ہے کہ آپؐ اس نافرمان اور نالائق قوم پر نگاہِ کرم فرمائیں اور اس کی دستگیری فرمائیں۔ یہ قوم لاکھ بری سہی لیکن آپؐ کی نام لیوا ہے۔ اور اللہ کے کلام پر عامل نہ سہی اس کی نگہبان تو ہے آخر یہ دنیا سے نیست و نابود تو ہو نہیں سکتی کیونکہ آپ کا پیغام ازلی اور ابدی ہے پس اللہ ان پر نگاہ کرم فرمائے اور دنیا میں ان کی باعزت زندگی کا کوئی انتظام فرمائے۔

میں نے حتی المقدور اس نظم کے مفہوم کو سلیس انداز میں بیان کر دیا ہے لیکن اگر ناظرین اس سوز و گداز سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں جو اس نظم میں ہے تو پھر اس کو اقبال ہی کے لفظوں میں پڑھیں جو سوز و گداز اس مصرع میں ہے۔ ع "اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے"

وہ میرے لفظوں سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔

(۞)

مدنیّتِ اسلام

بتاؤں تجھ کو مسلمان کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
طلوع ہے سنتِ آفتاب اس کا غروب
یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

شرح مشکلات اقبال نے اس فلسفیانہ نظم میں مسلمان کی آئیڈیل (مثالی) زندگی کا نقشہ کھینچا ہے اور فی الحقیقت یہ نظم بہت غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ اے مخاطب! کیا میں تجھے یہ بتاؤں کہ

ایک سچے مسلمان کی زندگی کیا ہوتی ہے؟ سُن! اس کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں۔

مسلمان کی زندگی نہایت اندیشہ اور کمال جنوں کا امتزاج ہوتی ہے یعنی اس کی زندگی میں علم اور عشق دونوں دوش بدوش نظر آتے ہیں وہ اپنی عقل کی تربیت بھی کرتا ہے..... اور اپنے قلب کی مخفی قوتوں کو بھی ابھارتا ہے بالفاظِ دگر وہ فکر اور تڑپ دونوں کا جامع ہوتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ وہ آفتاب کی طرح اگر اِدھر غروب ہوتا ہے تو اُدھر طلوع ہو جاتا ہے۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

وہ اپنی صفات کے لحاظ سے اقوامِ عالم کے مقابلہ میں یگانہ ہے اور اپنی گوناگوں کارفرمائیوں کے لحاظ سے زمانہ کی طرح مختلف شانیں رکھتا ہے یعنی مومن کو ایک حالت پر قرار نہیں ہے وہ ہر روز ترقی کی کوشش کرتا ہے اور مدارجِ عالیہ طے کرتا رہتا ہے۔

واضح ہو کہ اقبالؔ کے فلسفہ میں سکون موت کا دوسرا نام ہے چنانچہ پیامِ مشرق میں لکھتے ہیں

اگر امروز تو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

تیسرا شعر:۔ مومن کی زندگی میں نہ تو عصرِ حاضر کی سی عریانی فحاشی

اور بے حیائی پائی جاتی ہے اور نہ عہد کہن کی سی روایات پرستی اور ضعیف الاعتقادی نظر آتی ہے۔

چوتھا شعر: مسلمان کی زندگی کی بنیاد ابدی حقائق پر ہوتی ہے اور وہ زندگی کو حقیقی سمجھتا ہے یعنی وہ افلاطون کی طرح زندگی اور کائنات کو غیر حقیقی (UNREAL) نہیں سمجھتا۔

نوٹ: اقبالؔ نے اس شعر میں دنیائے فلسفہ کے سب سے بڑے مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات حقیقی ہے یا غیر حقیقی؟ دو ہزار سال سے اس مسئلہ پر طبع آزمائیاں ہو رہی ہیں لیکن ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ صداقت کس قول میں ہے؟ اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ

انکشافِ رازِ ہستی عقل کی حد میں نہیں
فلسفی یاں کیا کرے اور سارا عالم کیا کرے

افلاطون کا مسلک یہ ہے کہ ہماری خارجی دنیا نقل یا ظل یا پرتو ہے اس دنیا کی جو عالمِ مثال میں ہے اصلی یا حقیقی دنیا جو اس کی دسترس سے باہر ہے ہم اس کا ذہن میں تصور کر سکتے ہیں لیکن وہ خارج میں موجود نہیں ہے اور جو کچھ خارج میں نظر آتا ہے یہ نقل (COPY) یا ظل (SHADOW) یا پرتو (REFLECTION) یا عکس (IMAGE) ہے حقیقی دنیا کا۔

افلاطون کہتا ہے کہ اس عالمِ حسّی (SENSIBLE WORLD) کے علاوہ ایک عالم اور بھی ہے جسے وہ عالم مثال (WORLD OF IDEAS) سے تعبیر کرتا ہے کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے یہ حقیقی (REAL) نہیں ہے اس کی حقیقت یا اصل

اس عالم مثال میں ہے مثلاً آدمی کو لے لیجئے اصلی آدم عالم مثال میں ہے یہاں اس آدم کا ظل یا عکس ہے۔ مگر ہیچ

افلاطون کے اس خیالی فلسفہ نے آگے چل کر بڑے بڑے گل کھلائے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں کیونکہ میں اس جگہ فلسفہ افلاطون پر کوئی مقالہ نہیں لکھ رہا ہوں۔ وہ تو

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات

والا مضمون ہو گیا ہے۔ ورنہ اقبال کے اس مصرع

یہ زندگی ہے۔ نہیں ہے طلسم افلاطون

میں جو طلسم کا لفظ ہے وہ ناظرین کی سمجھ میں نہ آتا چنانچہ اب وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اقبال نے افلاطون کے فلسفہ کو "لفظ" طلسم سے کیوں تعبیر کیا ہے۔

بس اتنا لکھنا کافی ہے کہ آگے چل کر اس افلاطونی مسلک نے تہذیب و ثقافت پر جو مضر اثرات مرتب کئے اور مسلمانوں کو اس فلسفہ سے جو نقصان پہونچا اسی نے اقبال کو اس فلسفہ کی تردید پر آمادہ کیا چنانچہ انہوں نے اسرارِ خودی میں پوری قوت کے ساتھ افلاطونی فلسفہ کی تردید کی ہے اور اس کے علاوہ ہر کتاب میں مخفی طور پر اس فلسفہ کی خرابی کو واضح کیا ہے۔

غرض اقبال کہتے ہیں کہ مسلمان کی نظر میں دنیا اور اس کی زندگی حقیقی ہے دھوکہ فریب نقل۔ ظل یا مایا۔ نہیں ہے یہی زندگی اصلی اور حقیقی ہے یہی کائنات اصلی اور حقیقی ہے اس کے علاوہ اور کوئی کائنات ایسی موجود نہیں جس کی یہ کائنات نقل یا ظل ہو۔

قرآن مجید نے اس دنیا کو یا انسانی زندگی کو غیر حقیقی یعنی موہوم قرار نہیں دیا بلکہ حقیقی قرار دیا ہے۔

میں نے اس نکتہ کی اس قدر وضاحت اس لئے کی ہے کہ میں اقبالؔ کا وکیل اور شارح ہوں اور اقبالؔ نے ساری عمر افلاطونی فلسفہ کی تردید کی کیونکہ اس کو اسلامی تعلیمات کے خلاف یقین کرتے تھے اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس فلسفہ نے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو مفلوج کر دیا ہے۔ آخر میں اقبال مسلمانوں کی زندگی کے عناصر ترکیبی کا ذکر کرتے ہیں۔

پانچواں شعر:۔ کہ مسلمان کی زندگی میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال۔ عجم کا حسنِ طبیعت۔ اور عرب کا سوز درون اس کی تشریح یہ ہے کہ جس طرح روح القدس جمال یعنی نیکی۔ پاکیزگی اور خیر و برکت کا ذوق رکھتی ہے اسی طرح مسلمان بھی نیکی۔ پاکیزگی اور اچھی بات کی طرف راغب ہوتا ہے خلاصہ یہ کہ متقی ہوتا ہے۔

ایران کے لوگ جس طرح ذہنی اعتبار سے سرآوردہ ہیں اسی طرح مسلمان بھی علم و فن کا دلدادہ ہوتا ہے

اور عربوں نے جس طرح سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ یا جس طرح عربوں میں محبت اور ایثار کا مادہ ہے اسی طرح مسلمان کا دل بھی جذبۂ عشق رسولؐ سے سرشار ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان وہ ہے جو متقی ہو۔ طالب علم ہو اور عاشق رسولؐ ہو۔

نوٹ:۔ روح القدس کے دو معنیٰ ہیں۔

۱۔ عیسائیوں کی اصطلاح میں روح القدس تین خداؤں میں کا تیسرا خدا ہے جو باپ اور بیٹے سے صادر ہوتا ہے۔

۲ مسلمانوں کی اصطلاح میں روح القدس تائید غیبی یا توفیق الٰہی کو کہتے ہیں چنانچہ قرآن حکیم میں وارد ہے کہ وَاَیَّدْنَاہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اور ہم نے روح القدس سے اس کی تائید کی۔

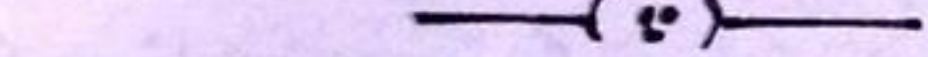

امامت

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنۂ ملّتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے



شرح مشکلات | اس دلکش نظم میں اقبالؔ نے امامت کی حقیقت بیان کی ہے۔ کہتے ہیں کہ۔

پہلا شعر:۔ تو مجھ سے دریافت کرتا ہے کہ امامت کی حقیقت کیا ہے؟ میں تیرے حق میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تجھے بھی میری طرح فہم حقائق سے بہرہ ور کر دے۔ سُن! تیرا صحیح اور سچا امام وہ ہے جس میں حسب ذیل صفات پائی جائیں۔

دوسرا شعر:۔ وہ تجھے حاضر و موجود سے بیزار کر سکے یعنی تجھے عصر حاضر اور اس کی خرابیوں سے متنفر کر سکے اس کے علاوہ تجھ کو تیری موجودہ غیر اسلامی زندگی سے بھی بیزار کر سکے۔ حاضر و موجود سے مراد ہے۔ موجودہ غیر اسلامی ماحول۔

تیسرا شعر:۔ وہ تجھے یہ سمجھا سکے یا اس حقیقت کبریٰ کو تیرے دل و دماغ میں اتار سکے کہ محبوب حقیقی سے ملاقات کا آسان ترین طریقہ شہادت ہے۔ لہٰذا وہ تجھ کو شہادت کا اس قدر تمنائی بنا دے کہ تجھے جینا دوبھر ہو جائے۔[1]

چوتھا شعر:۔ اور تجھے اس حقیقت سے آگاہ کر سکے کہ اس غلامی سے تیرا کس قدر نقصان ہو رہا ہے یعنی تو سراسر گھاٹے میں ہے کیونکہ غلامی میں

---

[1] اس شعر کا اسلوب بیان اور طرز ادا ایسی دلکش ہے کہ صرف صاحب ذوقِ سلیم ہی اس کی داد دے سکتا ہے۔

تو اپنی خودی کی تربیت نہیں کر سکتا اور اس طرح وہ تیرے اندر غیر اسلامی نظام کا تختہ الٹ دینے کا جذبہ پیدا کر دے اور تیرے اندر شانِ فقر پیدا کر سکے تاکہ تو تلوار کی طرح باطل کو کاٹ کر رکھ دے اور ہر طاغوت کا مقابلہ ڈٹ کر کر سکے۔

پانچواں شعر:۔ یہ تو ہوئیں حقیقی اور سچے امام کی صفات یعنی مسلمانوں کا امام وہ ہے جو ان میں جہاد کی روح پیدا کر سکے اور ان کے دل میں اس صداقت کو اتار دے کہ اسلام ملوکیت کا شدید دشمن ہے اسلامی نظام میں سلاطین اور آمرین (Dictators) کی مطلق گنجائش نہیں ہے اور جو شخص مسلمانوں کو اللہ اور رسول کے نافذ کردہ قانون کے بجائے اپنے قانون کی اطاعت پر مجبور کرے وہ اسلام کا دشمن ہے مسلمانوں کا دشمن ہے اور اس کے خلاف جہاد کرنا لازم ہے لیکن اگر کوئی شخص مسلمانوں کی امامت کا مدعی ہو اور اس کا طرزِ عمل یا تعلیم ایسی ہو کہ وہ مسلمانوں کو سلاطین کا پرستار بنانا چاہتا ہو اور یہ کہتا ہو کہ انگریزوں کے خلاف جہاد بالسیف جائز نہیں ہے تو وہ شخص مسلمانوں کا امام نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی امامت ملّت اسلامیہ کے حق میں ایک فتنہ ہے۔

نوٹ:۔ اللہ مسلمانوں کو ایسے ائمہ سے محفوظ رکھے۔

—(٭)—

فقر و راہبی

کچھ اور چیز ہے شاید تیری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
سکوں پرستیٔ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
پسند روح و بدن کی ہے وا نمود اس کو
کہ ہے نہایتِ مومن خودی کی عریانی
وجود صیرفیٔ کائنات ہے اس کا
اسے خبر ہے یہ باقی ہے اور وہ فانی
اسی سے پوچھ کہ پیشِ نگاہ ہے جو کچھ
جہاں ہے یا کہ فقط رنگ و بوئی طغیانی
یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

شرحِ مشکلات

اس نظم میں اقبالؔ نے فقر اور رہبانیت کا فرق واضح کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فقر ایک اسلامی اصول ہے

اور رہبانیت ایک غیر اسلامی اصول ہے۔

پہلا شعر:۔ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! اگر تو فقر اور راہبی کو ایک ہی بات سمجھتا ہے تو پھر تو مسلمان نہیں ہے بلکہ کسی اور مذہب کا پیرو ہے کیونکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے فقر اور رہبانیت ایک دوسرے کی ضد ہے چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں لَا رُھْبَانِیَۃَ فِی الْاِسْلَامِ اب دونوں میں فرق دکھاتے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ فقیر وہ ہے جو راہبوں کی عزلت گزینی اور گوشہ نشینی سے سخت بیزار ہو۔ فقیر کی زندگی تو سراپا ہنگامہ اور سراسر انقلاب ہوتی ہے[1] اس کی کشتی ہمیشہ طوفان کا مقابلہ کرتی ہے۔

تیسرا شعر:۔ فقیر (راہبوں کے اصولِ حیات کے خلاف) تو ہمیشہ اپنی روح اور اپنے بدن کی میدانِ جنگ میں نمائش کرتا رہتا ہے یعنی وہ راہبوں کی طرح جنگلوں میں خلوت کی زندگی بسر نہیں کرتا۔ فقیر روح اور بدن کی نمود پہ مجبور ہے اس لئے کہ

ع کہ ہے نہایتِ مومن خودی کی عریانی

یعنی مومن کی معراج یہ ہے کہ اس کی خودی اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ عریاں ہو جائے۔

---

[1] چنانچہ سلطان ٹیپو شہیدؒ جب تک زندہ رہا۔ کافروں سے مسلسل لڑتا رہا یعنی اپنی اسلامی خودی کا جلوہ دنیا کو دکھاتا رہا۔

نوٹ:۔ تہذیب مغرب کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے جسم کو عریانی پر مائل کرتی ہے اور تہذیب اسلام یعنی فقر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کی روح کو عریانی کی طرف راغب کرتی ہے۔

عریانی کا مفہوم یہ ہے کہ فقر خودی کے محاسن کی نمائش کرتا ہے جس طرح کفر جسم کے محاسن کی نمائش کرتا ہے۔ یورپ میں جو کافر عورتیں ہیں وہ عریانی کی طرف مائل ہیں اس کی وجہ یہی تو ہے کہ وہ اپنے جسم کی خوبصورتی کی نمائش چاہتی ہیں اسی طرح فقیر اپنی خودی کے کمالات کی نمائش چاہتا ہے۔ الغرض مومن کے روحانی کمالات کی انتہا یہ ہے کہ اس کی خودی اپنی پوری قوت کے ساتھ منظر عام پر آجائے اور وہ منظر عام عموماً میدانِ جہاد ہی ہوتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ فقیر کی شخصیت کائنات کی ہر شئے کو پرکھنے کی کسوٹی ہوتی ہے اس کے دو معنیٰ ہیں۔ پہلا معنیٰ یہ ہے کہ فقیر کی شخصیت معیار خیر و شر بن جاتی ہے[1]۔ نیک کام یا نیکی وہ ہے جسے فقیر یا مومن نیکی قرار دے (نہ وہ جسے انگریز یا دوسرے کفار نیکی قرار دیں) دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ صرف فقیر یا مومن ہی اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ اس عالمِ رنگ و بو میں کون سی چیز باقی یعنی لائق اختیار ہے اور کون سی چیز فانی یعنی اس لئے قابلِ ترک ہے دنیا میں لوگ جس غلطی میں مبتلا ہیں وہ یہ ہے کہ باقی اور فانی میں امتیاز نہیں کر سکتے اسی لئے

---

[1] لوگ کہتے ہیں۔ بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو۔
اقبال کہتے ہیں۔ بجا کہے جسے مومن اسے بجا سمجھو۔

اکثر مسلمان اپنی جہالت کی بنا پر باقی کو چھوڑ کر فانی اشیاء کے حصول میں اپنی زندگیاں برباد کر دیتے ہیں لیکن فقیر یا مومن جانتا ہے کہ سرکاری عہدے دولت ثروت۔ عورت۔ باغات اور محلات یہ سب فانی ہیں اس لئے اس لائق نہیں کہ ان کو مقصود حیات بنایا جائے۔

پانچواں شعر:۔ صرف فقیر ہی تجھ کو بتا سکتا ہے کہ یہ جو کچھ تجھے نظر آتا ہے یہ جہان (بمعنی پائدار ہستی) ہے یا فقط رنگ و بو کی طغیانی ہے یعنی حسن و جمال نسواں۔ دولت۔ محلات۔ باغات۔ خطابات اور جاگیریں یہ سب محض فانی اور عارضی چیزیں ہیں بلکہ فریب نظر ہیں ان میں سے کسی کو ثبات و قرار نہیں ہے۔

چھٹا شعر:۔ مسلمانوں نے جب سے یہ فقر کھو دیا وہ دنیا میں بالکل ذلیل و خوار ہو گیا۔ نہ اس کے پاس دولتِ سلمانی رہی۔ نہ دولت سلیمانی ہی رہی۔

دولتِ سلمانی سے مراد ہے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی سی پاکیزہ اسلامی سیرت یعنی تقویٰ۔ اور دولت سلیمانی سے مراد ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سی سلطنت اور حکومت۔

غزل

تیری متاعِ حیات، علم و ہنر کا سرور
میری متاعِ حیات، ایک دلِ ناصبور
معجزۂ اہلِ فکر، فلسفۂ پیچ پیچ
معجزۂ اہلِ ذکر موسیٰؑ و فرعون و طور
مصلحتاً کہہ دیا میں نے مسلماں تجھے
تیرے نفس میں نہیں، گرمیٔ یوم النشور
ایک زمانے سے ہے چاک گریباں مرا
تو ہے ابھی ہوش میں میرے جنوں کا قصور
فیضِ نظر کے لئے ضبطِ سخن چاہئے
حرفِ پریشاں نہ کہہ اہلِ نظر کے حضور
خوارِ جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور

(٭)

شرح مشکلات

یہ دلکش غزل حقائق و معارف سے لبریز ہے۔

پہلا شعر:۔ فرماتے ہیں کہ تو (مغرب زدہ مسلمان)

فلسفہ اور سائنس کی لذّت اور سرور کو اپنی متاعِ حیات سمجھتا ہے لیکن میں (سچا مسلمان) اپنے دل کو جس میں سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے اپنی زندگی کی پونجی یقین کرتا ہوں۔

دوسرا شعر:۔ اہلِ فکر (جو عقل کو رہنما سمجھتے ہیں) جو معجزہ دنیا کو دکھا سکتے ہیں وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ ایسا پیچیدہ فلسفہ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں جو نہ تو پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی کرتا ہے۔ نہ مشکلاتِ زندگی میں رہنمائی کرتا ہے لیکن اہلِ ذکر (جو عشق کو رہنمائی سمجھتے ہیں) جو معجزہ دنیا کو دکھا سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک اللہ کے بندہ نے فرعون جیسے صاحبِ سطوت بادشاہ کو شکست دیدی تھی اور کوہ طور پر اللہ سے ہمکلامی کا شرف حاصل کیا تھا۔

تیسرا شعر:۔ اے کالج کے نوجوان! میں نے تجھے مصلحتاً مسلمان کہہ دیا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تو مسلمان نہیں ہے کیونکہ مسلمان کی شناخت یہ ہے کہ اس کے نفس میں تو قیامت کی گرمی ہوتی ہے اور تیرا دل تو برف کی قاش ہے۔

نوٹ:۔ گرمی سے مراد۔ دین کے لئے غیرت اور حمیت ہے۔

چوتھا شعر:۔ اے مسلمان! میں تو مدّتوں سے ملّت اسلامیہ کی تباہی پہ توجہ کر رہا ہوں اور غم کے مارے دیوانہ ہو گیا ہوں لیکن تو بدستور عیش و عشرت کر رہا ہے تو اس میں میرے جنون کا کیا قصور ہے؟ یعنی اسلام کا کیا قصور؟ اسلام تو غیرت ملّی کا درس دیتا ہے لیکن اگر تو اس درس سے

کوئی فیض حاصل نہ کرے تو یہ اسلامی تعلیمات کا قصور تو نہیں ہو سکتا ہے۔

پانچواں شعر:- اے مسلمان! اگر تو بزرگوں سے کچھ فیض حاصل کرنا چاہتا ہے تو ان کی خدمت میں ادب کے ساتھ حاضر ہو اور بہت ہی ادب کے ساتھ گفتگو کر (کالج کی تعلیم نے تجھ کو آداب بزرگانِ دین سے بے گانہ کر دیا ہے) کیونکہ بزرگوں کے سامنے مہمل اور غیر مربوط یا مادہ پرستانہ اور دنیاوی گفتگو کرنی بالکل نازیبا ہے۔ ان کے پاس دینی باتوں کے علاوہ بات مناسب نہیں ہے

چھٹا شعر:- آخر میں علامہ اقبالؔ ایک مژدۂ جاں فزا سناتے ہیں کہ وہ قوم دنیا میں کبھی خوار نہیں ہو سکتی جس کے عشق میں بہادری اور فقر میں غیرت کا رنگ ہو۔ عشق سے مراد عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور فقر سے مراد وہی ذکر و فکر کا اختلاط ہے جس کا بیان اس سے پہلے مفصل ہو چکا ہے۔

(٭)

تسلیم و رضا

ہر شاخ سے یہ نکتۂ پیچیدہ ہے پیدا
پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا
ظلمت کدۂ خاک پہ شاکر نہیں رہتا
ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشو و نما کا
فطرت کے تقاضوں پہ نہ کر راہِ عمل بند
مقصود ہے کچھ اور ہی تسلیم و رضا کا
جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

(٭)

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبالؔ نے تسلیم و رضا کی حقیقت واضح کی ہے کہ اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ انسان عمل سے غافل ہو جائے یا کوشش سے باز آجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ عام طور سے مسلمانوں میں تسلیم و رضا کا یہ مفہوم جاگزیں ہو گیا ہے کہ بس اللہ کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کر دو اور خود کوئی کوشش نہ کرو۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ تسلیم و رضا کا مفہوم یہ ہے کہ انسان ہر معاملہ میں اپنے مقدور کے مطابق کوشش کرے اور جب

حتی المقدور کامیابی کے تمام ذرائع جمع کرلے تو حصول مقصد کے لئے جدوجہد کرے اس کے بعد نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں چھوڑ دے۔ اگر ناکامی ہو تو نیچے مسلمان کی طرح مایوس یا رنجیدہ نہ ہو بلکہ اللہ کی مشیّت کے سامنے سر تسلیم خم کردے یعنی اس کی مرضی نہ تھی کہ کامیابی ہو۔

پہلا شعر:۔ پودوں کو نشو ونما پر غور کرنے سے یہ نکتہ سمجھ میں واضح ہو سکتا ہے کہ نباتات کو بھی یہ احساس ہے کہ فضا بہت وسیع ہے اس لئے ہمیں نشو ونما کے لئے یعنی اپنے پھیلنے اور شاخوں کو بڑھانے کا موقع حاصل ہے۔

دوسرا شعر:۔ چنانچہ کوئی دانہ زمین کے اندر پڑے رہنے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ ہر دانہ میں زمین سے باہر نکلنے اور پھلنے پھولنے کا جذبہ کارفرما ہے اور وہ برابر عمل میں مصروف رہتا ہے یعنی کوئی دانہ یہ نہیں کہتا کہ مجھے عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر خدا کی مرضی ہوگی تو مجھے نشوونما حاصل ہو جائیگا۔

تیسرا شعر:۔ پس اے انسان! تو نباتات سے سبق سیکھ تیری فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ تو سرگرم عمل رہے اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے کوشش کرتا رہے تسلیم ورضا کا مقصود یہ نہیں کہ تو ہاتھ پاؤں توڑ کر حجرہ میں بیٹھ جائے بلکہ اس بلند روحانی اصول کا فلسفہ یہ ہے کہ تو ہر معاملہ میں پہلے اپنے سے کوشش کر پھر نتیجہ خدا کے ہاتھ میں چھوڑ دے یعنی سر تسلیم خم کر مگر عمل کرنے کے بعد۔

چوتھا شعر:۔ یاد رکھ کہ اگر تیرے اندر ترقی کرنے کا جذبہ موجزن ہے تو عمل کے لئے میدان کافی وسیع ہے۔ اے اللہ کے بندے! یقین رکھ کہ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔

نکتۂ توحید

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے

وہ رمزِ شوق کہ پوشیدہ لَا اِلٰہ میں ہے
طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہئے

سرورِ حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہئے

جہاں میں بندۂ حر کے مشاہدات ہیں کیا
تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہئے

مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہئے

—(❁)—

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبالؔ نے توحید کے فضائل اور اس پر عامل ہونے کے نتائج کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے اس نظم میں حقائق نگاری اور شاعری دونوں کا ایک خوشگوار امتزاج نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ میں اس نظر کا مفہوم تو اپنے لفظوں

میں بیان کر سکتا ہوں. لیکن نثر میں اس کی دلکشی اور طرز ادا کو ظاہر نہیں کر سکتا۔

پہلا شعر:۔ فرماتے ہیں کہ نکتۂ توحید کوئی ایسا پیچیدہ منطقی مسئلہ نہیں ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ یا تو سمجھ نہیں سکتا اس کا بیان بھی آسان ہے مثلاً اس بات کو سمجھنے کے لئے نہ منطق درکار ہے نہ فلسفہ ہی اور نہ علم کلام. کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کائنات کا نہ کوئی معبود ہے نہ فرماں روا نہ حاکم نہ آمر۔ نہ خالق ہے نہ مالک. نہ رازق ہے نہ دستگیر. نہ مشکل کشا ہے نہ حاجت روا۔ اس کے سوا نہ کوئی شخص مجھے نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان. اسی کے حکم سے تو پیدا ہوا ہے اور اسی کے حکم سے تو وفات پائے گا اس کا کوئی شریک نہیں. نہ ذات میں نہ صفات میں. نہ اختیار میں اور نہ حکمرانی میں. نہ عبادت میں سب اس کے محتاج ہیں لیکن وہ کسی کا محتاج نہیں بلکہ وہ ہر قسم کے احتیاج سے پاک ہے اور کوئی اس کا مدمقابل نہیں ہے۔

یہ اسلامی عقیدۂ توحید کا خلاصہ ہے اور اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو سکتی. اس کے سمجھنے کے لئے کسی ڈگری یا علمی فضیلت یا فلسفہ دانی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کے سامنے اس عقیدہ کو پیش کیا تھا وہ کبھی مدرسہ کے فارغ تھے اور نہ کسی یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے نہ منطق جانتے تھے نہ فلسفہ سے آگاہ تھے اس کے باوجود وہ لوگ بآسانی اس نکتہ کو سمجھ گئے اور انہوں نے اس کی بدولت دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

لیکن ہائے رے موجودہ زمانے کے مسلمان! کہ تیرے دماغ میں تو ایک دو خدا نہیں رکھیں حضرت خواجہ عبدالقادر جیلانی خدا ہیں تو کہیں خواجہ اجمیری کہیں خواجہ ہجویری خدا ہیں تو کہیں خواجہ نظام الدین دہلوی بلکہ ہر ہر شہر اور ہر گاؤں اور دیہات میں بزرگانِ دین خدا بنے ہوئے ہیں اور ان کی قبریں رکوع وسجود سے آراستہ رہتی ہیں ہر قسم کے اغراض وحاجات انہیں سے مانگے جاتے ہیں اتنے ہی پر بس نہیں بلکہ دل ودماغ میں اور بھی سیکڑوں ہزاروں بت جاگزیں ہیں۔ بالفاظ دگر تیرا دماغ مجسم بت خانہ بنا ہوا ہے۔ مثلاً حُبِّ جاہ کا بت۔ حصولِ زر کا بت۔ حصولِ مناصب کا بت وغیرہ وغیرہ۔ الغرض جب تیرے دماغ کی یہ کیفیت ہے تو توحید کو نہ میں سمجھا سکتا ہوں نہ تو سمجھ سکتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ کلمۂ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میں رمز شوق پوشیدہ ہے یعنی جب مسلمان اس کلمۂ طیبہ کے مفہوم پر غور کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ چونکہ کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ہستی اس لائق نہیں کہ اس کو اپنا معبود یا مسجود بنایا جائے۔ نیز یہ کہ اللہ ہی کی وہ ذات ہے جو ہر قسم کے عیب۔ نقصان۔ نقص۔ کمزوری۔ ضعف۔ برائی اور احتیاج سے پاک اور مُنزّہ ومُبرّا ہے اور ہر قسم کے کمالات۔ محاسن اور خوبیوں اور نیکیوں کا منبع ہے۔ اس لئے اللہ کے سوا کوئی ہستی اس قابل نہیں کہ اُسے اپنا مقصود ومطلوب اور محبوب بنایا جائے۔ اور جب یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے تو بندہ کے دل میں اس سے محبت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اسی جذبہ کو اقبالؔ نے "رمز شوق" سے تعبیر کیا ہے لیکن اگر کوئی شخص توحید کے

اس دلکش پہلو کو نظر انداز کر کے ظاہر پرست علماء و فقہا کی طرح صرف منطقی طور پر خدا کو ایک مان لے اور اس سے محبت کا جذبہ اپنے دل میں پیدا نہ کرے تو وہ اس "رمز شوق" کو کیا سمجھ سکتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ جب ایک مومن جذبۂ عشق الٰہی سے سرشار ہو کر میدان جنگ میں اللہ کے نام کو بلند کرنے کے لئے اور کفر کو مٹانے کے لئے جہاد کرتا ہے تو اس کو اس فعل میں ایسی لذت حاصل ہوتی ہے کہ تمام دنیا کی لذتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں لیکن اگر کسی شخص میں جہاد فی سبیل اللہ کا حوصلہ ہی نہ ہو یعنی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت ہی نہ ہو تو وہ اس لذت کا احساس کیسے کر سکتا ہے اور وہ اس سرور کی کیا قدر کر سکتا ہے؟

چوتھا شعر:۔ جو شخص اللہ کی محبت میں فنا ہو کر حقیقی حریت کے مقام پر سرفراز ہو جاتا ہے وہ اس کائنات کی بڑی سے بڑی طاقت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور دنیا کے بڑے سے بڑے سلاطین کو اپنے سامنے ہیچ سمجھتا ہے بلکہ وہ مشاہدہ کرتا ہے کہ اللہ کے سوا مجھ پر کوئی حکمرانی کے لائق ہی نہیں یہ ساری کائنات میری خادم ہے لیکن جو شخص اپنے ہی جیسے انسانوں کا غلام ہو اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہو وہ بندۂ حر کے مشاہدات سے کیسے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے؟

پانچواں شعر:۔ مقام فقر (جس کی تشریح قبل ازیں ہو چکی ہے) بادشاہی سے بدرجہا زیادہ بلند ہے کیونکہ وارث فقر دراصل خلیفۃ اللہ علی الارض ہوتا ہے اور دنیاوی بادشاہ اس کے سامنے لرزہ براندام رہتے ہیں

لیکن کسی شخص کی طرزِ حیات گدایانہ ہو یعنی اگر وہ دوسرے انسانوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہو اور ان کو اپنا حاجت روا سمجھتا ہو تو وہ مقامِ فقر کی بلندی اور عظمت کا کیا اندازہ کر سکتا ہے؟

الہام اور آزادی

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام
ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز
اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے ایسی
ہو جاتی ہے خاکِ چمنستان شرر آمیز
شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار
کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز
اس مردِ خود آگاہ و خدا مست کی صحبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

شرح مشکلات اس دلفریب نظم میں اقبالؔ نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ صرف بندۂ حُر (مومن) کا الہام انسانوں کو فائدہ پہونچاتا ہے جو شخص غیر اللہ کا غلام ہو۔ اگر وہ صاحب الہام ہونے کا مدعی ہو تو اس کا الہام انسانوں کو نفع کے بجائے نقصان پہنچاتا ہے بلکہ وہ ایک رہزن ہے جو مسلمانوں کی متاعِ ایمان کو لوٹنا چاہتا ہے۔

پہلا شعر:۔ اگر مردِ مومن۔ صاحب الہام ہو یعنی مجدّد یا مصلح ہونے کا مدعی ہو تو اس کی صداقت کا معیار یہ ہے کہ اس کی نگاہ مسلمانوں کی قوتِ فکر اور قوتِ عمل کے لئے فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اور اس کی صحبت میں بیٹھنے سے دل میں دین کے لئے غیرت اور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پہ مر مٹنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ وہ کمزور (بلبل صفت) انسانوں میں قتال (شاہین) کی اُمنگ پیدا کر دیتا ہے یعنی مسلمانوں کی ذہنیت میں انقلاب برپا کر دیتا ہے اس کی تلقین سے غیر اللہ کا خوف دلوں سے نکل جاتا ہے یعنی وہ مسلمانوں کو مجاہد فی سبیل اللہ بنا دیتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ مختصر یہ کہ اس مردِ خدا آگاہ اور خدا مست کی صحبت مسلمانوں کو دنیا اور دین دونوں میں سروری عطا کر دیتی ہے گداؤں کو جمشید اور پرویز کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ لیکن محکوم کے الہام سے اللہ ہر مسلمان کو محفوظ

رکھے کیونکہ وہ چنگیز اور ہلاکو خاں کی طرح قوموں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص خود کافروں کی غلامی سے نہیں نکل سکتا بلکہ ان کی تعریف کرتا ہے وہ دوسروں کو ان کی غلامی سے کب اور کیونکر رہائی دلا سکتا ہے۔

ع او خویشتن گم است کرا رہبری کند

جان و تن

عقل مدّت سے ہے اس پیچاک میں الجھی ہوئی
روح کس جوہر سے خاکِ تیرہ کس جوہر سے ہے
میری مشکل ہستی و شور و سرور و درد و داغ
تیری مشکل ہے مے سے ہے ساغر کہ مے ساغر سے ہے
ارتباطِ حرف و معنی ؟ اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

شرح مشکلات یہ ایک مشکل فلسفیانہ نظم ہے اور انہیں نظموں کی بنا پر میں نے مقدمہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ضربِ کلیم میں شاعری کم ہے فلسفہ زیادہ ہے چنانچہ اس نظم کو دیکھنے سے یہ حقیقت بالکل واضح

ہو جاتی ہے اور اسی لئے ہم اقبالؔ کو فلسفی شاعر نہیں بلکہ شاعر فلسفی کہتے ہیں یعنی ایسا فلسفی جس نے شعر کو اپنے فلسفہ کے اظہار کا ذریعہ بنا ہو اور فلسفی شاعر وہ ہے جس کا اپنا کوئی فلسفہ نہ ہو لیکن وہ فلسفیانہ خیالات نظم کرتا ہو جیسے فارسی میں بیدلؔ۔ عربی میں ابو العلا معریٰ۔ اور انگریزی میں کالرج (Coleridge) اور براؤننگ (Browning) اور سنسکرت میں راجہ بھرتری ہری۔

پہلا شعر:۔ یہ نظم بہت تفصیل طلب ہے لیکن میں نے یہ شرح کالج کے طلبہ کی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر لکھی ہے۔ اگر پوری وضاحت کی جائے تو پھر اس کے لئے ایک حاشیے کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ جب سے فلسفہ کا آغاز ہوا اس وقت سے انسان برابر اس مسئلہ پر غور کر رہا ہے کہ (۱) ۔ روح کس جوہر سے ہے۔ (۲) ۔ خاک تیرہ کس جوہر سے ہے۔ ؟ (۳) ۔ اور ان دونوں میں جو ارتباط و اختلاط پایا جاتا ہے اس کی نوعیت کیا ہے ؟ جیسا کہ میں اس شرح میں کئی جگہ اشارہ کر چکا ہوں یہ اور اسی قسم کے دوسرے مسائل عقل کی دسترس سے بالاتر ہیں۔ عقل صرف محسوسات میں چل سکتی ہے اور روح بالاتفاق حواس کی گرفت سے باہر ہے اور جدید تحقیقات کی رو سے مادہ بھی مادی نہیں ہے بلکہ تموّجات برقی کا نتیجہ ہے اور برق کی ماہیت مجہول الکنہ ہے یعنی عقل میں نہیں آسکتی۔ اللہ لبس باقی ہوس۔

دیگر فلاسفہ کی طرح اقبال نے بھی اس مسئلہ پر طبع آزمائی کی ہے جس کی تفصیل تو ان کی مایۂ ناز مگر بدقسمت تصنیف "اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید" میں مل سکتی ہے۔ یہاں صرف اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ اقبال

کی رائے میں روح اور مادہ میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ مادہ جدید طبیعات کی رو سے اب کسی جامد یا ٹھوس چیز کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی اصل وہ برقی لہریں ہیں جن کو ہم توانائی (ENERGY) کا منبع قرار دے سکتے ہیں اور "توانائی" مادی یعنی ٹھوس چیز نہیں ہے یعنی مادہ کی اصل غیر مادی ہے۔

چنانچہ جے جے ٹامسن نے سب سے پہلے سالماتی نظریہ کو باطل کیا اور ثابت کیا کہ سالمہ (ATOM) جسے حکمائے قدیم ناقابلِ تقسیم کہتے تھے رقیق ذرات (CORDUSCLES) سے مرکب ہے اور یہ ذرات برقی نقاط سے مرکب ہیں جن کو طبیعات کی اصطلاح میں (ELELTRCALOYNTS) کہا جاتا ہے اور بجلی کے یہ تہایت لطیف اور رقیق نقطے جو بغیر خوردبین کے نظر نہیں آسکتے کوئی ٹھوس یا جامد چیز نہیں ہیں بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ توانائی کا مظہر ہیں۔

ان نقطوں کی یہ کیفیت ہے کہ غیر محسوس اور غیر مرئی نقطے بھی بسیط نہیں ہیں بلکہ مرکب ہیں یہ الیکٹران اور پروٹان سے مرکب ہیں اور ان کی باہمی نسبت کی یہ کیفیت ہے کہ الیکٹران (Elaclyon) ہر وقت نہایت سرعت کے ساتھ جس کا اندازہ عقل نہیں کرسکتی۔ پروٹان (Pyolon) کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور ان الیکٹرانس میں اس بلا کی طاقت اور توانائی ہے کہ عقل اس کا تصور ہی نہیں کرسکتی مثلاً جسے ہم لوگ سرخ رنگ کہتے ہیں یہ رنگ جن برق پاروں کی گردش سے پیدا ہوتا ہے ان کی سرعت کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک سکنڈ میں اپنے مرکز کے گرد چار سو کھرب مرتبہ گردش کرتے ہیں۔ اب ناظرین خود فیصلہ کریں کہ کیا وہ ایک سکنڈ کے $\frac{1}{400}$ کھرب کا تصور کرسکتے ہیں۔

اس بات کا جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ برقی نقطے مختلف سائز کے ہوتے ہیں سب سے چھوٹا سالمہ، ہائیڈروجن سالمہ (Hydrogen Atom) ہے اس کی ترکیب صرف ایک پروٹان (نقطہ ماسکہ) اور ایک الیکٹران (برق پارہ) سے ہوئی ہے اور یہ اکیلا برق پارہ اس اکیلے پروٹان کے گرد رقص پیہم کرتا رہتا ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں یہ گردشِ پیہم کہاں سے آئی؟ اور سب سے بڑا سالمہ، یورینیم سالمہ کہلاتا ہے جس کا نقطۂ ماسکہ ۲۳۸ ر پروٹانوں سے مرکب ہے اور ٹھیک اتنے ہی الیکٹران (برق پارے) اس نقطے کے گرد گھومتے رہتے ہیں اور یہ سالمہ بھی آنکھ سے نظر نہیں آسکتا۔

پروفیسر رودرفرڈ (Rutherford R) بھی یہی لکھتا ہے کہ سالمہ ایک مثبت (Positive) مرکز یا نقطہ ماسکہ ہے جس کے گرد ایک یا زیادہ منفی برق پارے گردش کرتے رہتے ہیں اور مادہ کوئی جامد ٹھوس متحد الاجزاء چیز نہیں ہے بلکہ ایسی ترکیب یافتہ شے ہے جس میں خلا ہے اور برق پارے منتشر نظر آتے ہیں۔

الغرض جدید سائنس کے انہیں انکشافات کو دیکھ کر اقبال نے یہ نظریہ قائم کیا کہ مادہ مادّی نہیں بلکہ اس کی اصل غیر مادی ہے یعنی روح چنانچہ اپنی مذکورہ بالا کتاب "تشکیل جدید" میں وہ لکھتے ہیں کہ جسے تم مادہ سمجھتے ہو وہ بھی روح ہی کی ایک شکل ہے جو زمان و مکان کی قید میں رہ کر اپنے مقصد کے حصول میں مصروف ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ روح اور بدن میں رشتہ کیا ہے؟ اس کا جواب

اقبال نے یہ دیا ہے کہ بدن کی اصل مادّہ ہے اور مادہ کی اصل روح ہے اوپر ثابت ہو چکا ہے کہ مادہ مادّی چیز نہیں ہے اور اقبال کی رائے میں مادہ بھی روح ہے یا روح کی ایک شکل ہے۔ ان دونوں میں اصل کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ فرق اگر ہے تو شکل یا صورت کا ہے اس کو اقبال نے اخگر کی مثال سے بخوبی واضح کیا ہے۔

آپ ایک دہکتا ہوا "انگارا" لے لیجئے اور اپنے سامنے رکھئے تھوڑی دیر کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وہ راکھ میں پوشیدہ ہو گیا ہے یہ راکھ کہیں باہر سے یا کسی اور جگہ سے لا کر آپ نے اس انگارے پر نہیں ڈالی بلکہ وہ خاکستر اس انگارے سے ہی پیدا ہوئی ہے یا اس کی شکل ہے یعنی وہ انگارہ ہی راکھ میں تبدیل ہو گیا ہے اور جب آپ راکھ ہٹائیں گے تو اندر سے انگارا نکل آئے گا راکھ کی اصل وہی آگ یا انگارہ ہے جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے اسی طرح روح قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے یعنی جسم بھی اصل کے لحاظ سے روحانی ہی ہے (Mallor in also spiritualising Staff in Spell der Cultur -)

اب نظم کو پڑھ لیجئے۔

دوسرا شعر:۔ عقل انسانی مدت سے اس الجھن میں گرفتار ہے کہ روح کی اصل کیا ہے؟ میں جس مسئلہ پر غور کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ مستی و شور و سرود و درد و داغ ان روحانی کیفیات کی اصل کیا ہے؟ ان میں سے کوئی چیز ٹھوس نہیں۔ پھر بھی عقل انسانی ان کے وجود سے انکار

نہیں کر سکتی اور آج کل کے مغرب زدہ لوگ اس الجھن میں گرفتار ہیں کہ مے سے ہے ساغر، کہ ساغر سے ہے ؟ یعنی جسم مادہ کی اصل روحانی ہے یا روح کی اصل مادی ہے ؟

تیسرا شعر:۔ میرے نزدیک جان و تن میں وہی ارتباط ہے جو حرف و معنی میں نظر آتا ہے یعنی تن روح کی خارجی شکل ہے جس طرح لفظِ محبت۔ جذبۂ محبت کی جو نہ خارج میں موجود ہے نہ موجود ہو سکتا ہے خارجی شکل یعنی اظہار کا ذریعہ ہے جذبۂ محبت کا جو مفہوم ذہن میں ہے اس مفہوم کو ہم لفظ محبت سے ادا کرتے ہیں یہ لفظ اس غیر مادی مفہوم کی خارجی شکل ہے۔

محبت غیر محسوس ہے لفظ محبت محسوس ہے اور محبت کا مظہر ہے اسی طرح روح غیر محسوس ہے۔ تن محسوس ہے اور روح کا مظہر ہے جس طرح لفظ محبت غیر محسوس جذبۂ محبت کے اظہار کا ذریعہ ہے اسی طرح تن یا جسم غیر محسوس روح کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ معنی نہ ہو تو لفظ بیکار ہے۔ روح نہ ہو تو جسم بیکار ہے خاکستر اخگر ہی کی ایک شکل ہے اسی طرح جسم و روح ہی کی ایک شکل ہے۔

نوٹ:۔ اقبال نے اس نظریہ کو بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی غیر فانی فلسفیانہ نظم "گلشن رازِ جدید" میں بھی پیش کیا ہے لکھتے ہیں۔

تن و جان را دو تا گفتن کلام است
تن و جان را دو تا دیدن حرام است

یعنی عرف عام میں یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ جسم اور روح دو چیزیں ہیں لیکن ان کو دو مختلف الاصل چیزیں نہیں یقین کر سکتے۔ دو کہہ سکتے ہو دو سمجھ نہیں سکتے ان کو دو کہنا تو جائز ہے لیکن دو سمجھنا ناجائز ہے اسی لئے اقبال انسان کو ایک وحدت تسلیم کرتے ہیں اس میں روح اور مادہ کا امتیاز تسلیم نہیں کرتے اسلام دینِ وحدت ہے اس لئے اللہ بھی ایک۔ کائنات بھی ایک انسان بھی ایک۔ نہ اللہ میں دوئی کی گنجائش ہے نہ انسان میں۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اسلام۔ دین فطرت ہے اس نے ابتدا سے وحدت کی تعلیم دی۔ یہ دوئی کی تعلیم تو ایران میں پیدا ہوئی جس کی ابتدا "مجوسیت" در زرتشتیت سے ہوئی اور ایک عرصہ کے بعد مانی نے اس تعلیم کو دوبارہ زندہ کر کے ثنویت (Dualism) کے رنگ میں پیش کیا جسے فلسفہ میں ثنویت مانوی (Manichaean Dualism) کہتے ہیں۔ جان و تن یعنی روح اور مادہ کا امتیاز اسی مسلک کی بدولت پیدا ہوا اسلام نے جس طرح دیگر غلط عقائد کا ابطال کیا ہے اس ثنویت پر بھی ضرب کاری لگائی ہے۔

مانی کے فلسفہ کو چوتھی صدی میں مسیحیت نے قبول کر لیا اور مسیحیت کے واسطے سے یہ عقیدہ یورپ میں پہنچ گیا اور سارا یورپ اس کا قائل ہو گیا چنانچہ اسی ثنویت کی تعلیم کے زیر اثر مسیحی یورپ میں زندگی کے ہر شعبہ میں دوئی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ مثلاً دین اور دنیا۔ مذہب اور سیاست۔ روح اور مادہ۔ دنیاوی زندگی اور دینی زندگی۔ دینی طبقہ اور دنیاوی طبقہ۔ یعنی پادریوں کا طبقہ اور عوام کا طبقہ۔ اِس امتیاز سے پاک اور ناپاک کا

امتیاز بھی پیدا ہوگیا یعنی روح پاک ہے۔ مادہ ناپاک ہے۔ تجرّد کی زندگی پاک ہے تاہّل کی زندگی ناپاک ہے۔ دین پاک ہے دنیا ناپاک ہے۔ مذہب پاک ہے۔ سیاست ناپاک ہے (اسی لئے مذہب کو سیاست سے جدا کر دیا) عقبیٰ پاک ہے دنیا ناپاک ہے۔ دیندار طبقہ پاک ہے دنیادار طبقہ ناپاک ہے — (کلیسا نے انسانوں کو دو گروہوں میں منقسم کر دیا۔ پادری اور غیر پادری)

اسلام نے ثنویت اور مسیحیت کے ان تمام امتیازات کو مٹا دیا اور کہا کہ دنیا اور دولتِ دنیا۔ بہت اچھی ہے اگر اللہ کے نام کو بلند کرنے کے لئے حاصل کی جائے۔ الغرض ثنویت نے جس قدر غلط امتیازات پیدا کر دئے تھے جن کا ابھی ذکر ہوا اسلام نے ان سب کو مٹا دیا یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست دو مختلف چیزیں نہیں ہیں بلکہ اسلام مذہب اور سیاست دونوں کا جامع ہے۔

اب اس جگہ مجبوراً قلم روکتا ہوں اور اس طول کلام کی معافی چاہتا ہوں۔

ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

لاہور و کراچی

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا آخَرْ

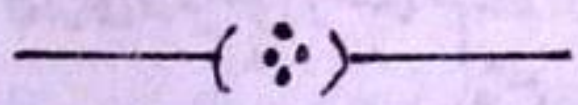

شرح مشکلات

پہلا شعر:۔ غیور مسلمان صرف اللہ پر نظر رکھتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے کچھ طلب نہیں کرتا اور نہ توقع رکھتا ہے۔ نیز موت سے بالکل نہیں ڈرتا کیونکہ موت انقطاع حیات کا نام نہیں بلکہ حقیقی اور اصلی گھر کی طرف واپس جانے کا نام ہے (قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حقیقی اور اصلی زندگی صرف دارِ آخرت ہی کی ہے۔ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ)

دوسرا شعر:۔ بھلا نصاریٰ ان شہیدوں کا خون بہا کر کیا دے سکتے ہیں جبکہ ان کا خون بلحاظ قیمت حرم سے بھی بڑھ کر ہے۔

تیسرا شعر:- افسوس اے مسلمان! تو قرآن مجید کی اس تعلیم سے بیگانہ ہو گیا کہ "اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو مت پکارو" بس تو اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کر کہ تو خود دشمنانِ دین سے انتقام لے سکے

نبوّت

میں نہ عارف نہ مجدّد نہ محدّث نہ فقیہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوّت کا مقام
ہاں مگر عالمِ اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیرِ فلکِ نیلی فام
عصرِ حاضر کی شبِ تار میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہِ تمام
وہ نبوّت ہے مسلماں کے لئے برگ حشیش
جس نبوّت میں نہیں قوّت و شوکت کا پیام

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے بھولے بھالے مسلمان کو نبوت کی پہچان بتائی ہے اقبالؔ کو اس بات کی ضرورت

اس لئے پیش آئی کہ انگریزوں نے مسلمانانِ ہند کے دل و دماغ سے جہاد کا جذبہ فنا کرنے کی غرض سے ایک شخص کو ایسے مواقع بہم پہونچا دیئے کہ وہ نبوت کا دعویٰ کر سکے اور کوئی مسلمان اس سے باز پرس نہ کر سکے۔ اسی لئے عارف اللہ آبادی نے یہ دو شعر سپردِ قلم کئے تھے۔

گورمنٹ کی خیر یارو مناؤ　　گلے میں جو آئیں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسّر　　اَنَا الحَقّ کہو اور پھانسی نہ پاؤ

چنانچہ اس شخص نے اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے ساری عمر جہاد کے خلاف اپنے قلم اور اپنی زبان سے کام لیا اور مسلمانوں کو جہاد کا خیال ترک کر دینے اور انگریزوں کی غلامی پر قناعت کرنے کے سلسلہ میں اس قدر کتابیں لکھیں اور شائع کیں کہ بقول نبی مذکور "اگر ان کو جمع کیا جائے تو پچاس الماریاں بھر جائیں گی۔" اس "خود کاشتہ پودے" نے مسلمانوں سے یہ کہا کہ انگریز اولوالامر ہیں ان کی اطاعت بروئے قرآن واجب ہے۔ یہ حکومت ہم پر بڑی مہربان ہے ہم اس عادل گورنمنٹ کے زیرِ سایہ بہت خوش ہیں۔ ہمیں جو آسائش اس حکومت میں نصیب ہے وہ دنیا میں کہیں نصیب نہیں ہو سکتی۔ غرضکہ یہ نبیِ قادیان ساری عمر دشمنانِ اسلام انگریزوں کی مدح سرائی کرتا رہا اور اللہ کے بندوں کو غلامی کا درس دیتا رہا۔ اس لئے اقبالؔ نے مجبور ہو کر اس طلسم کو توڑا۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ نہ عارف ہوں۔ نہ مجدد ہوں نہ محدّث ہوں۔ نہ فقیہ ہوں۔ اور نہ مقامات اور کمالاتِ نبوّت

سے واقف ہوں۔

دوسرا شعر:۔ ہاں۔ مگر عالم اسلام کی ملّی تاریخ سے آگاہ ہوں اور ضمیر فلک (آسمانی کتابوں کی تعلیمات) سے بھی کچھ شناسائی رکھتا ہوں۔

تیسرا شعر:۔ میں نے موجودہ زمانہ کی تاریک رات میں یہ حقیقت دیکھی ہے اور یہ حقیقت چاند کی طرح روشن ہے کہ

چوتھا شعر:۔ جس نبوت میں قوت و شوکت کا پیام نہیں وہ نبوت مسلمان قوم کے حق میں بھنگ کے پتوں سے زیادہ وقیع نہیں ہو سکتی یعنی میں نے دنیا کے گذشتہ انبیاء اور رسولوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا ہے اور مجھے یہ حقیقت چاند کی طرح چمکتی نظر آتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی اور ہر رسول نے مسلمانوں کو حکومت اور سروری کا پیام دیا ہے۔ تاریخ عالم میں کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس نے مسلمانوں کو کافروں کی غلامی میں زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہو یا غلامانہ زندگی سے مطمئن رہنے کا سبق پڑھایا ہو یہ سعادت صرف ہندی نبی کے حصہ میں آئی ہے۔

نوٹ:۔ برگ حشیش میں حسن صبّاح کے طریق کار کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یہ مکّار اور عیّار دشمنِ دین و ملّت اپنے پیروؤں کو بھنگ کا شربت پلا کر اس جنت میں بھیجا کرتا تھا جس میں اس نے جا بجا اور سر کاشیا۔ آرمینیہ اور کردستان کی حسین ترین عورتیں ان نوجوانوں کو پھانسنے کے لئے جمع کی تھیں یہ جنت قلعہ الموت میں تھی اور یہ شخص فرقۂ اسمٰعیلیہ کا داعی گذرا ہے۔

آدم

طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن
زمانہ صبحِ ازل سے رہا ہے محوِ سفر
مگر یہ اس کی تگ و دَو سے ہو سکا نہ کہن
اگر نہ ہو تجھے اُلجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انساں نہ روح ہے نہ بدن

(:)

شرح مشکلات یہ بھی بہت مشکل فلسفیانہ نظم ہے اس میں پہلی غور طلب بات یہ ہے کہ اقبالؔ نے آدم کو "طلسمِ بود و عدم" سے تعبیر کیا ہے اس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ آدم کا وجود حقیقی یا بقول حجۃ الاسلام۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ[1] (بانیٔ دارالعلوم دیوبند) خانہ زاد نہیں ہے یعنی

---

[1] واضح ہو کہ مولانا مرحوم کی ذات جامع کمالات صوری و معنوی ہی نہ تھی بلکہ قدرتِ الٰہی کا زندہ نشان تھی۔ انہوں نے ایک طرف ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کیا۔ دوسری طرف تصاریٰ۔ آریہ سماج اور سرسیّد کے عقائد باطلہ کا

(بقیہ آگے صفحہ ۲۱۱ پر)

آدم اپنے موجود ہونے میں دوسرے کا محتاج ہے اس کی ماہیت عدم ہوتی ہے اس لحاظ سے آدم عدم کا مصداق ہے لیکن وہ کسی کے موجود کر دینے سے موجود ہو گیا اس لئے وہ بود کا مصداق ہے یعنی اس میں عدم اور بود دونوں شانیں موجود ہیں اس لئے اقبال نے اس کو "طلسم بود و عدم" سے تعبیر کیا ہے یعنی ایسی ہستی کہ ماہیت کے لحاظ سے تو اس پر عدم کا اطلاق ہوتا ہے لیکن موجود ہے اس لئے وجود (بود) کا اطلاق بھی ہو سکتا ہے اب چونکہ وجود (بود) اور

(بقیہ صفحہ ۲۱۰ کا)

البطال کیا۔ تیسری طرف دیوبند میں مدرسہ قائم کر کے ہندوستان میں اسلام کی بقا کا انتظام کیا۔ ۱۸۷۸ء میں دیانند بانی آریہ سماج کو شاہجہانپور کے مناظرہ میں ایسا لاجواب کر دیا کہ پھر اسے مقابلہ میں آنے کی جرأت ہی نہ ہوئی اس ایک مرد مومن نے یکہ و تنہا تمام دشمنان اسلام کا مقابلہ کیا اور سب کو شکست دی۔ تقریر۔ خطابت۔ مناظرہ۔ تحریر۔ تصنیف۔ درس و تدریس۔ وعظ و ارشاد اور حقائق بیانی کے لحاظ سے انیسویں صدی میں بلا مبالغہ حجۃ الاسلام تھے۔ جس طرح علوم ظاہری میں فرید الدہر تھے اسی طرح علوم باطنی میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکہ معظمہ کے خلفاء میں سے تھے۔ میرے اندر منطق اور فلسفہ کا ذوق حضرت ہی کی کتابوں کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ اور میں نے ان کی تصانیف سے اس قدر استفادہ کیا ہے کہ مدۃ العمر بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس مرد مومن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عدم ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لئے وجودِ آدم بلا مبالغہ ایک طلسم ہے کہ ہے بھی اور نہیں بھی۔

اب اس کو دوسری طرح سمجھاتا ہوں

۱۔ یہ مسلّم ہے کہ کائنات موجود ہے اس لئے وجود ہے۔ اس لئے وجود ثابت ہو گیا۔

۲۔ اب وجود کی عقلاً تین قسمیں ہو سکتی ہیں۔

(ا) واجب الوجود یعنی ایسا وجود جس کا نہ ہونا محال ہو اس کو ضروری الوجود بھی کہتے ہیں۔ (انگریزی میں Necessary Being) کہتے ہیں فلسفہ اسلام میں اس کا مصداق ایک سے زیادہ نہیں ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے بس وہی اکیلا واجب الوجود ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے موجود ہونے میں کسی کا محتاج نہیں ہے یعنی وجود اس کا خانہ زاد ہے فلسفۂ اسلام میں واجب کو قدیم کہتے ہیں اور مسلمان حکما یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ باقی ساری کائنات حادث ہے۔

(ب) ممکن الوجود یعنی ایسا وجود جس کا ہونا اور نہ ہونا دونوں ممکن ہو انگریزی میں اسے (Contingent Being) کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ممکن الوجود اپنے وجود میں دوسرے کا محتاج ہوتا ہے جس طرح واجب کی حقیقت یا ماہیت وجود ہے ممکن کی ماہیت عدم ہے ممکن جب موجود ہو گا تو کسی کے موجود کرنے سے موجود ہو گا وہ خود موجود نہیں ہو سکتا یعنی وجود اس کا خانہ زاد نہیں ہے بلکہ کسی غیر کا عطا کردہ ہے۔

(ج) ممتنع الوجود. یعنی ایسا وجود جس کا ہونا محال ہو انگریزی میں اُسے (Impossible Being) کہتے ہیں جیسے شریک باری تعالیٰ یعنی دوسرا خدا۔

اب مجھے یقین ہے کہ بات بالکل صاف ہوگئی ہوگی، آدم چونکہ ممکن الوجود ہے اس لئے وہ طلسم بود و نبود کا مصداق ہے۔ ماہیت کے لحاظ سے عدم ہے لیکن اس کے باوجود موجود ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ نے اسے معدوم سے موجود کر دیا۔

پہلا شعر:۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ آدم کا وجود یا اس کا موجود ہونا بلاشبہ خدائے تعالیٰ کا راز ہے جس کو کوئی انسان نہیں کھول سکتا یعنی کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ آدم کیسے موجود ہو گیا۔

دوسرا شعر:۔ اگرچہ زمانہ ابتدا سے محوِ سفر ہے لیکن آدم اس کی تگ و دو سے پرانا نہیں ہو سکا۔ یعنی پیدائش بنی آدم کا سلسلہ اسی طرح جاری ہے اگر ایک آدم معدوم ہو جاتا ہے تو دوسرا آدم موجود ہو جاتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں سچی بات کہہ دوں تو شاید تو پریشان ہو جائے یا کسی الجھن میں گرفتار ہو جائے لیکن اگر تو حقیقت کا جویا ہے تو پھر میں تجھے صاف لفظوں میں بتا دوں کہ

ع وجودِ حضرتِ انساں نہ روح ہے نہ بدن

یعنی بظاہر تو انسان روح اور بدن کے مجموعہ کا نام ہے لیکن انسان

کا وجود یعنی اس کی ماہیت نہ روح ہے نہ بدن۔ بلکہ عدم ہے اور اس کا وجود محض اللہ کی صفتِ خالقیت کا پرتو ہے جس کی حقیقت اور ماہیت تو عدم محض ہے لیکن جب عدم پر اس کی صفت خالقیت کی تجلی ہوئی تو عدمات کو خلعتِ وجود حاصل ہو گیا یعنی اللہ کی صفت خالقیت نے محض اپنی نوازش سے بلا استحقاق عدمات محضہ کو خلعتِ وجود عنایت فرمایا اسی لئے اسلامی فلسفہ یہ ہے کہ اگر ذات باری اپنی صفتِ قیومیّت کی تجلّی کو ایک سکنڈ کے لاکھویں حصّے کے لئے بھی روک لے تو ساری کائنات فنا ہو جائے یعنی اپنی اصل حقیقت یا ماہیت کی طرف لوٹ جائے یعنی معدوم ہو جائے۔ پھر اس مصرع کو پڑھو۔

ع وجود حضرت انساں نہ روح ہے نہ بدن

یعنی انسان کا وجود نہ روح یا نفس ناطقہ ہے نہ بدن ہے نہ ان کا مجموعہ ہے بلکہ انسان کا وجود محض ظلی یا طفیلی ہے۔ محض اللہ کے رحم و کرم کا ظہور ہے اس نے اپنی قدرت کاملہ اور مشیت قاہرہ کی بدولت ہمیں عدم محض سے خلعت وجود عنایت کر دیا ہماری حقیقت صرف اتنی ہے کہ اس نے ہمیں معدوم سے موجود کر دیا اور جب چاہے گا اس کائنات کو پھر معدوم کر دے گا اور جب چاہے پھر موجود کر دے گا۔ وجود حضرت انسان نہ روح ہے نہ بدن "بلکہ اس کی صفتِ خالقیت کا کرشمہ ہے جب وہ کسی چیز کے موجود کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ "موجود ہو جا پس وہ موجود ہو جاتی ہے۔ (کُنْ فَیَکُوْنُ) کا یہی مطلب ہے یعنی اس

کی مشیت میں یہ طاقت ہے کہ جو کام انسان وسائل اور آلات سے کرتا ہے اللہ محض اپنی مشیت سے کر سکتا ہے۔

مکّہ اور جنیوا

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ عالم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم
مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیت آدم

شرح مشکلات

اس مختصر میں اقبال نے حکمت افرنگ اور حکمتِ قرآن کے مقصد و موازنہ کیا ہے اور اسلام کے نقطۂ نگاہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے

پہلا شعر۔ فرماتے ہیں کہ اگرچہ موجودہ دور میں افراد درکنار اقوام آپس میں ملنے لگیں۔ لیکن [illegible] کے باوجود وحدت نوعِ انسانی ظہور میں نہ آسکی۔

دوسرا شعر:۔ یاد رکھو! حکمتِ افرنگ کا مقصد یہ ہے کہ قوموں میں تفریق پیدا کی جائے اور اس کو برقرار رکھا جائے یعنی مغربی سیاست کا نصب العین یہ ہے کہ قوموں میں اعلیٰ اور ادنیٰ کے امتیازات پیدا کئے جائیں اس کے برعکس اسلامی سیاست کا نصب العین یہ ہے کہ تمام امتیازات کو مٹا کر وحدتِ نسلِ انسانی قائم کی جائے یعنی سب انسان ایک باپ کی اولاد ہیں اور اس لئے سب برابر ہیں۔

اسلام دنیا میں اصول وحدت کا تنہا علمبردار ہے اس کی بنیادی تعلیمات یہ ہیں کہ خالق کائنات ایک ہے۔ ساری کائنات ایک ہے اس ساری کائنات کے لئے رسول یا رہنما ایک ہے۔ ضابطۂ حیات ایک ہے یعنی (قرآن کریم سے) انسان ایک ہیں یعنی سب برابر ہیں۔ گورے کو کالے پر۔ سیّد کو شیخ پر عربی کو عجمی پر۔ بادشاہ کو گدا پر۔ بحیثیت انسان کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ فضیلت کا صرف ایک معیار ہے اور وہ ہے تقویٰ۔

تیسرا شعر:۔ اسی لئے مکہ معظمہ یعنی اسلام نے خاکِ جنیوا یعنی اقوام مغرب کو یہ پیغام دیا کہ جمعیت اقوام سے جمعیت آدم بدرجہا بہتر ہے پس اگر تم واقعی بنی آدم کی بہتر چاہتے ہو تو جمعیت اقوام (LEAGUE OF) کے بجائے جمعیتِ آدم قائم کرو۔ یعنی یہ کوشش کرو کہ دنیا سے انسانوں کے بنائے ہوئے تمام امتیازات مٹ جائیں اور رنگِ مساوات قائم ہو جائے جو امن و امان اور فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔

واضح ہو کہ اقوام یورپ نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد جنیوا (GENEVA)

میں ایک مجلس بنام "مجلس اقوام عالم" قائم کی تھی جس کا ظاہری مقصد تو بہت اچھا تھا (یعنی دنیا میں امن قائم کرنا) لیکن دراصل اس کا مقصد اس کے برعکس تھا یعنی کمزور قوموں کو نہایت چابک دستی کے ساتھ اپنا غلام بنانا۔ اقبالؔ نے ۱۹۲۳ء میں اس مجلس پر نہایت عمدہ تبصرہ کیا تھا۔

من ازیں پیش ندانم کہ کفن دزدان چند
بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند[1]

یعنی یہ مجلسِ اقوام دراصل چند کفن چوروں کی مجلس ہے جو انہوں نے قبور (کمزور اقوام) کی تقسیم باہمی کے لئے بنائی ہے چنانچہ جو اقبالؔ نے کہا تھا وہی ہوا کہ یہ انجمن دنیا میں امن قائم نہ کر سکی اور اس کی ناکامی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس انجمن کے ارکان نے مساواتِ نسلِ انسانی کا اصول تو تسلیم ہی نہیں کیا جس پر امن عالم کا انحصار ہے۔

اب دوسری جنگ عظیم کے بعد ان کفن چوروں نے یو این او بنائی ہے یعنی اقوام عالم لیکن یہ انجمن بھی ناکام رہے گی بلکہ تیسری جنگِ عظیم کا پیش خیمہ بن جائے گی اور جب تک دنیا اسلام کے اصول سہ گانہ حرّیت۔ اخوّت اور مساوات کو تسلیم نہیں کرے گی اس عذاب سے نجات نہیں پا سکتی۔

---

[1] یعنی میں اس انجمن کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ یورپ کے کفن چوروں نے مل کر ایک انجمن بنائی ہے تاکہ وہ قبروں (ایشیا کی مردہ قوموں) کو آپس میں تقسیم کر سکیں۔

اے پیرِ حرم

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا
کہہ جاتا ہوں میں سوزِ دروں میں ترے اسرار
مجھ کو بھی صلہ دے مری آشفتہ سری کا

(*)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے علماء اور صوفیائے اسلام سے خطاب کیا ہے اور ان کو ان کا مذہبی فرض یاد دلا رہے ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ اے پیرِ حرم اب خانقاہی کے طریقے چھوڑ دے

اور میرے پیغام کے مفہوم کو سمجھ! "طریقِ خانقاہی" اقبال کی خاص اصطلاح ہے چنانچہ بال جبریل میں لکھتے ہیں۔

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

اس سے مراد ہے وہی تن آسانی اور بے عملی جس نے مسلمانوں کو غلام بنا دیا وہی موت کا ڈر اور جہاد کے تصوّر سے لرزہ براندام ہو جانا جس نے ہمیں ذلیل کر دیا۔

دوسرا شعر:۔ اے حضرات علما اور صوفیا! آپ حجروں سے باہر نکلئے اور اپنی قوم کے نوجوانوں کو خود شکنی اور خود نگری کا درس دیجئے یعنی ان کو اسلام کے حقائق سے آگاہ کیجئے تاکہ وہ اپنے عیوب کی اصلاح کر سکیں اور اپنی خودی کی حفاظت کر سکیں ان دو باتوں کے بغیر وہ ترقی نہیں کر سکتے۔

تیسرا شعر:۔ تعلیم و تہذیب مغرب نے انہیں فیشن کا دلدادہ اور آرام طلب بنا دیا ہے۔ بلکہ ان کا سارا وقت عورتوں کی طرح بناؤ سنگار میں صرف ہو جاتا ہے لہذا آپ صاحبان انہیں سمجھائیں کہ وہ اپنے اندر مردوں کے صفات پیدا کریں نیز انہیں محنت، مشقت اور جہاد فی سبیل اللہ کی طرف مائل کریں۔

چوتھا شعر:۔ چونکہ وہ دو سو سال سے انگریزوں کی غلامی میں مبتلا ہیں اس لئے وہ آزردہ اور دل شکستہ ہو چکے ہیں آپ حضرات

قرآن اور حدیث سے ان کے اس مرض کا مداوا کریں انہیں اللہ اور اس کے رسول کا پیغام سنائیں اور یہ بتائیں کہ اگر وہ اللہ کے دین کی مدد کریں گے تو اللہ ان کی مدد کرے گا۔

پانچواں شعر: میں نے قوم کی محبت کے جذبہ سے متاثر ہو کر آپ صاحبان کے مرتبہ اور مقام کو واضح کر دیا ہے پس آپ مجھے اس جذبہ کا یہ صلہ دیں کہ حجروں سے نکل کر میدان عمل میں آجائیے۔

(٭)

مہدی

قوموں کی حیات ان کے تخیّل پہ ہے موقوف
یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرغِ چمن کو
مجذوبِ فرنگی نے باندازِ فرنگی
مہدی کے تخیّل سے کیا زندہ وطن کو
اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار
تو میدنہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو
ہو زندہ کفن پوش تو میّت اسے سمجھیں
یا چاک کریں مردِ کِ ناداں کے کفن کو

(٭)

شرح مشکلات

یہ نظم بہت غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اقبالؔ مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تم مہدی کے ظہور کے تو منتظر ہو لیکن مہدی کے تخیّل سے بیزار ہو۔ یہ بہت عجیب بات ہے تم کہتے ہو کہ امام مہدی آئیں گے تو مسلمانوں کو سروری حاصل ہو گی اور وہ اسلام کا نام دنیا میں بلند کریں گے بہت خوب! مجھے اس سے انکار نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ تم ان کے آنے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے کیوں بیٹھے ہو؟ یعنی ظہور مہدی کے یہ معنی کب ہیں کہ مسلمان عمل سے بیگانہ ہو جائیں؟ وہ جب آئیں گے ہم ان کا صدق دل سے خیر مقدم کریں گے لیکن جب تک وہ ظاہر ہوں ہمیں برابر جد و جہد اور جہاد میں مصروف رہنا چاہیئے۔

اقبالؔ مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ ظہور مہدی کے انتظار کے ساتھ ساتھ مہدی کے تخیل کو بھی مدنظر رکھو یعنی مہدی کے مفہوم پر غور کرو کہ مہدی وہ بندۂ حق اور امام برحق ہو گا جو اسلام کے نام کو دنیا میں سربلند کرے گا پس لازم ہے کہ ہر مسلمان اس رتبہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ کیوں نہ ہر مسلمان اپنے اندر وہ خوبیاں اور نیکیاں اور صفات عالیہ پیدا کرے کہ ان کی بنا پر اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو مہدی کے مرتبہ پر فائز کر دے؟ آخر مہدی آسمان سے تو آئے گا نہیں۔ اللہ تعالیٰ ملّت اسلامیہ ہی میں سے کسی فرد کو اس منصب رفیع پر سرفراز فرمائے گا تو کیوں نہ ہر مسلمان اس عزت کے حصول کے لئے کوشش کرے۔؟

پہلا شعر:۔ علامہ فرماتے ہیں کہ قوموں کی زندگی یعنی ترقی اور عظمت افراد یا مال کی کثرت پر موقوف نہیں بلکہ ان کے تخیل پر منحصر ہے اگر کوئی قوم کوئی بلند تخیل یا نصب العین اپنے سامنے رکھے گی تو یقیناً سربلندی حاصل کرے گی اور جس قوم کے تخیلات پست اور ادنیٰ قسم کے ہوں گے وہ قوم بھی پست رہے گی۔ الغرض یہ ایک قانون فطرت ہے کہ جیسا تخیل ویسی قوم نیز یہ ذوق (نصب العین) قوم کے افراد کو ادب یعنی ترقی کے راستے سکھاتا ہے اور جد وجہد کی طرف مائل کرتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ چنانچہ جرمنی کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ نیٹشے (NIETZSCHE) نے اپنی قوم کے سامنے مغربی انداز میں مہدی کا تخیل پیش کیا یعنی اس جرمن فلسفی نے مہدی کے تخیل کو فوق البشر (SUPERMAN) کے نام سے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ بہت جلد تمہارے اندر ایک فوق البشر (غیر معمولی طاقتوں والا انسان) ظاہر ہونے والا ہے اس تخیل کی بدولت جرمن قوم کا ہر فرد فوق البشر بننے کی کوشش میں مصروف ہو گیا اور ایک صدی کے اندر اندر جرمن قوم دنیا کی اقوام کی پہلی صف میں آگئی۔

تیسرا شعر:۔ اے مسلمان! تو مہدی کا تو منتظر ہے لیکن اس کے تخیل سے بیزار ہے یعنی اس کے مفہوم پر غور نہیں کرتا تو ختن کو آہوئے مشکیں سے تو میدمت کر یعنی تو قوم کو مہدی کے وجود سے محروم مت کر اگر کوئی زندہ شخص جو حرکت اور جد وجہد کر سکتا ہے۔ کفن پوش ہو کر چارپائی پر لیٹ جائے جیسے مردہ پڑا ہوتا ہے تو کیا عقلمند آدمی اسے فی الحقیقت مردہ قرار دے گا یا اس مردکِ

نادان کے کفن کو چاک کر کے پھینک دے گا ؟ اسی طرح اللہ نے ملت اسلامیہ کے ہر فرد کو ترقی کا موقع دیا ہے۔ ہر مسلمان خلیفۃ اللہ بن سکتا ہے۔ ہر مسلمان بشرطیکہ وہ کوشش کرے اور امامت کی شرائط پوری کرے مسلمانوں کا امام بن سکتا ہے پس مسلمان کا مہدی کے انتظار میں عمل صالح اور جدوجہد سے بیگانہ ہو جانا ایسا ہی افسوسناک ہے جیسا کہ کوئی زندہ آدمی کفن پہن کر مردہ بن کر لیٹ جائے۔

مردِ مسلمان

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چاروں عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن، نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن
بنتے ہیں مری کارگۂ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان



شرح مشکلات اس نظم میں علّامہ اقبال نے مردِ مومن کی نمایاں صفات بیان کی ہیں۔

پہلا شعر:۔ مومن ہر وقت تقویٰ اور پاکیزگی میں ترقی کرتا رہتا ہے وہ اپنی حالت پر قانع نہیں رہتا اُسے ہر لحظہ ترقی کی خواہش رہتی ہے اور وہ اپنے اقوال اور اعمال سے اللہ اور کلام اللہ کی حقانیت کے دلائل پیش کرتا رہتا ہے یعنی اس کے اقوال اور اعمال کو دیکھ کر دنیا اللہ کی ہستی پر ایمان لاتی ہے۔

اس کی مثال ہندوستان کے صوفیائے کرام کی زندگیوں کے مطالعہ سے بخوبی مل سکتی ہے۔ چنانچہ ان کی صحبت کے اثر سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں غیر مسلم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے۔

دوسرا شعر:۔ حقیقی معنی میں مسلمان بننے کے لئے چار باتیں

ضروری ہیں یعنی انسان اس وقت مسلمان بنتا ہے جب اس کی زندگی سے چار باتیں ظاہر ہوں وہ اللہ کے دشمنوں کو مرعوب کر سکے وہ خطا کاروں کو معاف کر سکے وہ پاکیزہ زندگی بسر کرے اور صاحب حکومت ہو۔ کسی کا غلام نہ ہو۔

تیسرا شعر:۔ مومن اگرچہ انسان ہوتا ہے لیکن اس میں فرشتوں کی سی پاکیزگی پائی جاتی ہے اور وہ وطن دوست تو ہوتا ہے لیکن وطن پرست نہیں ہوتا وہ اپنے دین کے لئے اپنا وطن ترک کر سکتا ہے لیکن اپنے وطن کے لئے اپنے دین کو ترک نہیں کر سکتا۔

چوتھا شعر:۔ مومن بظاہر تو قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے لیکن درحقیقت وہ خود قرآن ہوتا ہے یعنی اس کی پوری زندگی قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے۔

پانچواں شعر:۔ اس کے ارادے اور خیالات قدرت کے مقاصد کی کسوٹی ہوتے ہیں یعنی قدرت کیا چاہتی ہے اس کا جواب اس کے ارادوں سے مل سکتا ہے بالفاظ دگر وہ وہی کرتا ہے جو قدرت چاہتی ہے وہ دنیا میں بھی حق و باطل کی میزان ہے اور قیامت میں بھی۔ یعنی حق وہ ہے جسے مومن حق سمجھے اور حق قرار دے۔ اسی نکتہ کو اقبال نے بال جبریل میں یوں بیان کیا ہے۔

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

چھٹا شعر:۔ مومن زخمیوں، مسکینوں اور غمزدوں کے حق میں مونس اور ہمدرد ہوتا ہے اور ظالموں اور زبردستوں کے حق میں طوفان اور بلائے بے درماں ہوتا ہے۔

دراصل یہ نظم وہ آئینہ ہے جس میں ہم اپنی صورت دیکھ کر یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ ہم مسلمان کس حد تک مسلمان ہیں۔

ساتواں شعر:۔ مومن کی زندگی فطرت کے نغموں کی طرح دلکش ہوتی ہے اور اس میں فطرت کے قوانین کے ساتھ ایسی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جیسی سورۂ رحمٰن کی آیتوں میں نظر آتی ہے یہ اشارہ ہے اس آیت کی طرف جو اس سورہ میں مختلف آیتوں کے ساتھ آتی ہے یعنی فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ؟

آٹھواں شعر:۔ میں اپنی شاعری میں قرآن مجید کے حقائق و معارف بیان کرتا ہوں۔ اے مخاطب! تو ذرا غور کر۔ اور دیکھ تو سہی ان میں سے کون سا نکتۂ معرفت تیرے دل کو بھاتا ہے جو تجھے پسند آئے اسی کو اختیار کرلے یقیناً تیرا مقدر سنور جائے گا۔

نوٹ:۔ یہ شعر تلازمۂ تصورات اور شاعرانہ رعایتِ لفظی کی نہایت عمدہ مثال ہے جس سے اقبال کی قادر الکلامی ثابت ہوتی ہے چونکہ پہلے مصرع میں انہوں نے اپنے اشعار کو "انجم" قرار دیا ہے۔ (یہاں انجم استعارہ ہے جس سے شعر مراد ہے) اس لئے دوسرے مصرع میں "مقدر کا ستارہ" لائے ہیں جس سے لطفِ کلام دوبالا ہوگیا ہے۔ مقدر کا ستارہ وہ علم نجوم کی اصطلاح ہے

(RULINGSTAR) یعنی وہ ستارہ جو انسان کے مقدر پر حکمراں ہوتا ہے دوسرا اور شاعر کا اصلی مطلب یہ ہے کہ تو ان اشعار میں سے جس شعر کو اپنے لئے منتخب کرلے گا وہی تیرے مقدر کا ستارہ بن جائے گا یعنی اس پر عمل کرنے سے تیرا نصیبہ جاگ اٹھے گا۔

پنجابی مسلمان

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت
کرلے کہیں منزل تو گذرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا
ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیّاد لگادے
یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے پنجاب کے مسلمانوں کی ذہنیت پر تبصرہ کیا ہے میں ان اشعار کا مطلب تو لکھے دیتا ہوں۔ لیکن اس بات کا فیصلہ کہ یہ تبصرہ کس حد تک صحیح اور برمحل ہے خود ناظرین پر چھوڑے دیتا ہوں۔

پہلا شعر:۔ اقبال فرماتے ہیں کہ پنجابی مسلمان مذہب کے باب میں بہت جلد پسند واقع ہوا ہے اگر وہ کسی عقیدہ کو آج قبول کرتا ہے تو چار روز کے بعد اسے ترک کر دیتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اس کی طبیعت میں تحقیق کا مادہ بہت کم ہے یعنی مذہبی مسائل کی تحقیق سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے ہاں اگر کوئی شخص پیر و مرشد ہونے کا دعویٰ کرے تو بلا تامل اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور چونکہ اس میں تحقیق کا مادہ بہت کم ہے اس لئے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ شخص اس لائق بھی ہے یا نہیں۔

تیسرا شعر:۔ اگر کوئی شخص قرآن و حدیث میں تاویلات رکیکہ کے ذریعے سے اپنا دعویٰ ثابت کر دے تو چونکہ وہ مادّہ تحقیق سے عاری ہوتا ہے اس لئے بہت جلد اس شخص کی خود ساختہ تاویلات پر ایمان لے آتا ہے اور آنکھ بند کر کے جماعتِ صالحین میں داخل ہو جاتا ہے۔

آزادی

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد



شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں کو کس قسم کی آزادی عطا فرمائی ہے اس نظم میں طنز کا رنگ بہت نمایاں ہے۔

پہلا شعر:۔ اقبال کہتے ہیں کہ انگریزوں نے مسلمانوں کو اس قدر آزاد کر دیا ہے کہ کسی شخص میں یہ جرأت نہیں کہ کسی مسلمان کو ٹوک سکے مثلاً کوئی شخص کسی مسلمان سے یہ دریافت نہیں کر سکتا کہ تم نماز کیوں

نہیں پڑھتے؟ روزے کیوں نہیں رکھتے؟ زکوٰۃ کیوں نہیں دیتے؟ شراب کیوں پیتے ہو؟ جوّا کیوں کھیلتے ہو؟ الغرض ہر مسلمان حریت افکار کی نعمت سے مالامال ہے۔

دوسرا شعر:۔ مثلاً اُسے پوری آزادی ہے کہ اگر اس کا دل چاہے تو مسجد کو آتشکدہ بنادے یا اسے گرجا میں تبدیل کردے یا اس میں کسی انگریز کا بت نصب کردے۔

تیسرا شعر:۔ چونکہ اسے فکر (خیالات) کی پوری آزادی حاصل ہے اس لئے وہ اگر چاہے تو آیات قرآنی کی من مانی تاویلات کرسکتا ہے یعنی ان کا وہ مطلب بیان کرسکتا ہے جو اس کی ذاتی رائے کے مطابق ہو انگریزوں نے اسے اس حد تک آزاد کردیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو نبوت کا دعویٰ بھی کرسکتا ہے اور نبی کو خدا کے درجے میں پہونچا سکتا ہے اور نئی شریعت ایجاد کرکے اپنے کو مجدّد بن سکتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ الغرض مملکتِ ہند میں مجھ کو عجب تماشا نظر آرہا ہے وہ یہ کہ اسلام تو محبوس ہے لیکن مسلمان آزاد ہے۔

نوٹ:۔ یہ نظم چونکہ ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی تھی اس لئے اس میں "مملکت ہند" کا لفظ لکھا ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

مغوی تو ملیں گے تمہیں شیطان سے بہتر
ہادی نہ ملے گا کوئی قرآن سے بہتر

اشاعتِ اسلام فرنگستان میں

ضمیر اس مدنیّت کا دیں سے ہے خالی
فرنگیوں میں اخوّت کا ہے نسب پہ قیام
بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں
قبولِ دینِ مسیحی سے برہمن کا مقام
اگر قبول کرے دینِ مصطفیٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

(❖)

شرح مشکلات اقبال نے اس نظم میں فرنگیوں کی ذہنیت آشکارا کی ہے کہ

پہلا شعر:۔ انگریزوں کی پوری زندگی کا نظام دین سے خالی ہے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی نگاہ میں اخوّت کی بنیاد مذہب پر نہیں ہے بلکہ نسب یا نسل پر ہے۔

دوسرا شعر:۔ مثلاً منگولی نسل کا آدمی۔ آریائی نسل کے آدمی کا بھائی نہیں بن سکتا۔ یا مثلاً اگر کوئی برہمن مسیحی مذہب قبول کرے تو انگریز کی نگاہ میں اس کا مرتبہ وہی رہے گا جو تبدیل مذہب سے پہلے تھا۔

تیسرا شعر:۔ اسی طرح اگر انگریز اسلام قبول کرلے تو وہ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی ہندوستان کے مسلمان کو اپنا بھائی نہیں سمجھ سکتا۔

لا والّا

فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا
سفر خاکی شبستاں سے نہ کر سکتا اگر دانہ
نہادِ زندگی میں ابتدا لا انتہا اِلّا
پیامِ موت ہے جب لا ہوا الّا سے بیگانہ
وہ ملّت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لب ریز اس ملّت کا پیمانہ

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے کلمۂ توحید لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی ایک نئے انداز سے تفسیر کی ہے اس کلمۂ طیبہ کے دو حصے ہیں لَا اِلٰہَ اور اِلَّا اللّٰہُ اور اقبال اختصاراً ان کو لا اور الّا سے تعبیر کرتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ جس طرح دانہ اگر شبستان خالی (بطن زمین) سے سفر کرکے اوپر نہ آتا تو فضائے نور میں شاخ پتے اور پھول و پھل نمودار

نہ ہوتے۔

دوسرا شعر:۔ اسی طرح اگر انسان لا کی تاریکی (شبستان خاکی) سے نکل کر الّا اللہُ کی روشنی (فضائے نور) میں نہ آئے تو ترقی نہیں کر سکتا بلکہ اگر لا۔ الّا سے بیگانہ ہو جائے یعنی اگر ایک شخص صرف لا اِلٰہ پہ اکتفا کرے تو یقیناً یہ قیام اس کے لئے پیام موت ثابت ہوگا۔

تیسرا شعر:۔ اسی طرح اگر کوئی قوم مرتبۂ لا الٰہ سے آگے نہ بڑھے یعنی انکار معبودانِ باطلہ کے بعد اقرار معبود برحق نہ کرے تو یقین کر لو کہ اس ملّت کا پیمانۂ حیات لبریز ہو چکا ہے یعنی وہ قوم دنیا میں ترقی نہیں کر سکتی کیونکہ زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ظلمت لا کے بعد وادیٔ الّا اللہُ میں بھی قدم رکھے۔ باطل خداؤں کے انکار کے بعد سچے خدا کی ہستی کا بھی اقرار کرے۔

اُمرائے عرب سے

کرے یہ کافرِ ہندی بھی جرأتِ گفتار
اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس اُمّت کو
وصالِ مصطفویؐ، افتراقِ بولہبی
نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے عالمِ عربی

۵ بھوپال (شیش محل) میں لکھے گئے

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ان اُمرائے عرب سے خطاب کیا جو سحر کساحرانِ فرنگ سے مسحور ہو کر حقائق اسلام سے بیگانہ ہو چکے ہیں انگریزوں نے ترکوں کا اقتدار ختم کرنے کے لئے عربوں کو ورغلایا کہ ہم تمہیں ترکانِ جفا پیشہ سے آزادی دلا سکتے ہیں اور دنیائے عرب پہ تمہیں حکمراں بنا سکتے ہیں اس لئے تم ترکوں کے خلاف بغاوت کرو اور ہمارے علَم کے نیچے ان سے لڑو۔ عربوں کی المناک داستان سے قطع نظر کر کے اس حقیقت پر غور کیجئے جو اقبال نے بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افسوس عربوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ عالم عربی (WORLD (ARAB صرف عرب فلسطین۔ شام اور عراق کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تمام ملک جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھتے ہیں عالم عربی میں داخل ہیں۔ اب نظم کا مطلب بیان کرتا ہوں۔

پہلا شعر:۔ اگر امرائے عرب مجھ سے ناراض نہ ہوں تو میں ایک بات ان سے کہوں۔

دوسرا شعر:۔ افسوس! آپ لوگ اس حقیقت کو فراموش کر چکے ہیں کہ دنیا میں سب سے پہلے مسلمانوں ہی کو یہ نکتہ سکھایا گیا تھا کہ اب دنیا میں صرف دو قومیں ہوں گی مسلم اور غیر مسلم اور دو عالم ہوں گے عالم اسلام یا دنیائے مصطفویؐ۔ اور عالم کفر یا دنیائے بولہبی۔ اس تعلیم کی بنیاد یہ ہے کہ وصال یعنی اتحاد اور اخوت یہ تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا ثمرہ ہے اور افتراق یعنی اقوامِ عالم کا مختلف طبقات میں منقسم ہو جانا یہ کفر کی تعلیم کا نتیجہ

ہے بالفاظ دگر امت میں اتحاد پیدا کرنا اسلامی تعلیم ہے اور امت میں افتراق پیدا کرنا یہ سراسر بولہبی یا کافرانہ تعلیم ہے۔

تیسرا شعر:۔ پس عالم عربی کا وجود جغرافیائی حدود یا مخصوص طبقات ارضی پر موقوف نہیں بلکہ محمد عربی سے ہے عالم عربی۔ عالم عرب (ARAB WORLD) وہ نہیں جہاں عرب آباد ہیں۔ بلکہ وہ تمام ممالک جہاں مسلمان رہتے ہیں۔ عالم عربی میں داخل ہیں اس لئے ترکی۔ افغانستان۔ ایران ترکستان و پاکستان اور بلوچستان بھی عالم عربی میں داخل ہیں پس تم نے ترکوں کے خلاف بغاوت نہیں کی بلکہ ملّت اسلامیہ میں افتراق پیدا کر کے اور کافروں کا آلۂ کار بن کر ابولہب کا طریقہ اختیار کر لیا۔

نوٹ:۔ ترکوں اور ملّتِ اسلامیہ سے غدّاری کا نتیجہ سب عرب ممالک (مثلاً حجاز۔ شام۔ فلسطین۔ شرق اردن اور عراق) اچھی طرح رہے ہیں۔

احکامِ الٰہی

پابندیٔ تقدیر کہ پابندیٔ احکام
یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مردِ خردمند
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

شرحِ مشکلات اس نظم میں اقبال نے ایک عجیب و غریب نکتہ بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مومن تقدیر کا پابند نہیں۔ بلکہ احکام الٰہی کا پابند ہے۔

پہلا شعر:۔ یہ مسئلہ کہ مومن تقدیرِ الٰہی کا پابند ہے یا احکام الٰہی کا۔ چنداں مشکل نہیں ہے میں دو لفظوں میں سمجھا سکتا ہوں سنو!

دوسرا شعر:۔ تقدیر تو ایک آن یا ایک دن میں سو مرتبہ بدل سکتی ہے۔ تقدیر کا پابند ابھی ناخوش ہے۔ تھوڑی دیر میں خوش ہو جاتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ بات کیا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ تقدیر کے پابند تو فقط جمادات اور نباتات ہیں اور مومن تو فقط احکامِ الٰہی کا پابند ہے یعنی جمادات اور نباتات کی زندگی کی جو تقدیر اللہ نے معین فرمادی ہے (تقدیر بمعنی اندازہ یا طریق) اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مثلاً۔

(ا۔ پہاڑ کی تقدیر یہ ہے کہ وہ ایک جگہ قائم رہے۔

(ب۔ ہوا اور پانی کی تقدیر یہ ہے کہ حرکت کرتے رہیں۔

(ج۔ شبنم کی تقدیر یہ ہے کہ اوپر سے نیچے گرتی رہے۔

(د۔ تیتر کی تقدیر یہ ہے کہ شاہین کی خوراک بنتا رہے۔

(ہ۔ آگ کی تقدیر یہ ہے کہ نیچے سے اوپر کو جاتی رہے۔

لیکن مومن کا حال جمادات و نباتات اور عناصرِ کائنات سے بالکل مختلف ہے وہ کسی خاص تقدیر کا پابند نہیں بنایا گیا۔ اگر مومن احکام الٰہی یعنی شریعت محمدیہ ﷺ کی کامل اطاعت پر کمربستہ ہو جائے۔ اور پھر اپنے طرزِ حیات سے کامل اطاعت کا ثبوت دیدے۔ (مطیع کامل بن جائے) تو اللہ تعالیٰ اس کی تقدیر بدل سکتا ہے بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ اللہ نے بارہا اس کی تقدیر بدل دی ہے یعنی بدر کے میدان میں بظاہر تو یہ نظر آرہا تھا کہ کہاں تین سو تیرہ (۳۱۳) آدمی جن کے پاس ہتھیار بھی پورے نہیں تھے اور کہاں ایک ہزار (۱۰۰۰) آدمی جو ہر قسم کے اسلحہ سے آراستہ تھے۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ کفارِ مکہ مٹھی بھر مسلمانوں پر غالب آجائیں گے لیکن جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سجدہ میں یہ عرض کی کہ تھا اے اللہ! یہ کمزور بندے تیرے نام کو بلند کرنے کے لئے یہاں آئے

ہیں انہیں فتح عنایت کر۔ تو اللہ نے ان لوگوں کی تقدیر بدل دی۔

الغرض۔ اقبال اس حقیقت کو ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ جمادات اور نباتات اگر کوشش کریں تو بھی اپنی تقدیر نہیں بدل سکتے کیونکہ وہ تقدیر کے پابند ہیں لیکن مسلمان اگر کوشش کرے یعنی احکام الٰہی کی پابندی کرے تو اللہ اس سے خوش ہو کر اس کی تقدیر بدل سکتا ہے۔

نوٹ:۔ مسلمان کی ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی کی پابندی تو کرتے نہیں اور دعا یہ مانگتے ہیں کہ اے اللہ! ہماری تقدیر بدل دے حالانکہ یہ بات سنت اللہ کے خلاف ہے۔ تقدیر صرف احکام الٰہی کی پابندی سے بدل سکتی ہے کاش مسلمان یہ سوچیں کہ جب ہم نہ تو نباتات کی طرح تقدیر کی پابندی کرتے ہیں اور نہ انسان کی طرح احکامِ الٰہی کی پابندی کرتے ہیں تو اللہ اپنا فضل و کرم ہم پر کیسے نازل فرما سکتا ہے۔

علامہ اقبال کی تعلیم یہ ہے کہ اگر مسلمان اطاعت احکام الٰہی میں کمال حاصل کر لیں تو اپنی تقدیر خود بنا سکتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو قبول فرمایا کرے گا۔

(٭)

موت

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے
مہ و ستارہ مثالِ شرار دو یک دو نفس
مئے خودی کا ابد تک سُرور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ موت جس سے لوگ اس قدر خوف زدہ ہیں۔ دراصل زندگی کی اعلیٰ منازل میں سے ایک منزل کا نام ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے دوران گفتگو میں مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ موت بھی زندگی ہی کی ایک شان ہے موت کا مطلب یہ ہے کہ نفس کا تعلق جسم سے منقطع ہو جاتا ہے نہ یہ کہ نفس پر فنائے کلی طاری ہو جائے یا وہ نیست و نابود ہو جائے فرماتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ اگر کسی شخص نے دنیاوی زندگی میں اپنے دل

کو زندہ کر لیا ہو یعنی اپنی خودی کو اطاعتِ احکام الٰہی کی بدولت مرتبۂ کمال تک پہنچا دیا ہو تو اس کا دل لحد میں بھی زندہ رہتا ہے بلکہ مزید روحانی ترقی کے لئے بیتاب رہتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ چاند۔ ستارے۔ اجرام فلکی۔ نباتات حیوانات ان کی زندگی بیشک مختصر ہوتی ہے لیکن انسانی خودی اگر پختہ یعنی مستحکم ہو جائے تو پھر ابدی ہو جاتی ہے اور خودی کو یہ استحکام عشقِ الٰہی سے نصیب ہو سکتا ہے

تیسرا شعر:۔ موت کا فرشتہ تیرے جسم کو ضرور چھوتا ہے یعنی نفس کو جسم سے جدا کر دیتا ہے اور یہی مفہوم ہے اس آیت کا۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ ہر نفس موت کا ذائقہ ضرور چکھے گا لیکن تیرے وجود کے مرکز یعنی خودی پر موت یعنی فنا طاری نہیں کرتا۔ پس اگر مومن اس حقیقت سے آگاہ ہو جائے تو وہ موت سے خوف زدہ ہو جانے کے بجائے تبسم کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا۔ کیونکہ اسے یقین ہے کہ موت میری خودی کو فنا نہیں کر سکتی اسی مطلب کو اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے۔

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

(۰)

قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ
وہی زمیں وہی گردوں ہے قم باذنِ اللّٰہ
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے قم باذنِ اللّٰہ
غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے قم باذنِ اللّٰہ

شرح مشکلات اس عنوان کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ کے حکم سے کھڑا ہو جا یعنی زندہ ہو جا۔ اس نظم میں اقبال نے بڑی عمدگی کے ساتھ مسلمان کو سرگرم عمل ہونے کی تلقین کی ہے۔

پہلا شعر:- اے مسلمان! یہ سچ ہے کہ جہاں دگرگوں ہے یعنی حالات سازگار نہیں ہیں اور تو مشکلات میں گھرا ہوا ہے لیکن پرواہ مت کر ہمت سے کام لے اور سرگرم عمل ہو جا۔ دنیا کے حالات بیشک تیرے موافق نہیں ہیں لیکن اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر حالات بدل گئے ہیں تو کیا ہوا زمین و آسمان تو وہی ہیں یعنی قوانین فطرت تو نہیں بدلے۔ اللہ کا قانون ،

یہ ہے کہ جو شخص خدا کی راہ میں کوشش کرتا ہے خدا ضرور اس کی مدد کرتا ہے پس تو ہمت سے کام لے اور سرگرم عمل ہو جا۔

اللہ کا قانون مذکورہ بالا اس آیت سے مستنبط ہے ۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔ اور جو لوگ ہماری رضا جوئی کے لئے یعنی ہماری پسندیدہ راہوں پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں ہم یقیناً ان کو اپنی راہیں دکھا دیتے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ جس خون نے نوائے اَنَا الْحَقْ کو آتشیں کر دیا تھا تیری رگوں میں بھی وہی خون گردش کر رہا ہے پھر تو کیوں نا امید اور مایوس ہے؟ پس اللہ کا نام لے کر سرگرم عمل ہو جا۔

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ حسین بن منصور حلاّج روحانیت کے بلند مقام پر پہنچ گیا تھا۔ اے مسلمان! تو بھی اس مقام پر پہنچ سکتا ہے۔

انا الحق کی تشریح :۔ یہ کلمہ ہماری ادبیات میں بہت مشہور ہے تاہم اس کی تشریح ضروری خیال کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ حسین بن منصور حلاّج نے جو صرف منصور کے نام سے مشہور ہے ایک خاص جذبہ سے مغلوب ہو کر انا الحق کہہ دیا تھا۔ علماء نے اس کلمہ سے وہی معنی مراد لئے جو لفظوں سے ظاہر ہوتے ہیں یعنی میں حق (خدا) ہوں اور ان پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے خدائی کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ اس الزام کی پاداش میں انہیں قتل کرا دیا گیا تھا۔ بعد ازاں بعض بزرگوں نے منصور حلاّج کے اس قول کی تاویل کی اور ان کو اہل اللہ میں شمار کیا۔ مثلاً شیخ اکبر ابن عربیؒ اور مولانا

رومؒ نے اور ہندوستان کے دو مشہور بزرگوں حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ۔ اور حضرت مجدد الف ثانی سرہندی نے اس قول کی تاویل کی ہے۔

مولانا روم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انا الحق کا مطلب یہ ہے کہ میں کچھ نہیں ہوں۔ عدم محض ہوں۔ حقیقی وجود صرف خدا ہی کا ہے۔

اسی طرح حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے لکھا ہے کہ انا الحق کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں خدا ہوں بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ میں نیست ہوں اور صرف انا یعنی (وجود حق) حق ہے۔

ہمارے زمانہ میں اقبال نے بھی اپنے مذاق کے مطابق اس قول کی تاویل کی ہے۔ چنانچہ گلشن راز جدید میں لکھتے ہیں کہ

بخود گم بہر تحقیق خودی شو
انا الحق گو و صدیق خودی شو

یعنی خودی کی معرفت حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ میں گم ہو جا۔ اور انا الحق کہہ دے اور اس طرح خودی کی حقانیت کا اثبات کر دے جیسا کہ اقبال نے خود مجھ سے کہا تھا۔ انا الحق کا مطلب یہ ہے کہ اَنا حق ہے باطل نہیں ہے۔

میں نے یہ تصریح اس لئے کی ہے کہ ناظرین کو یہ معلوم ہو جائے کہ اقبال کو اس قول کی تاویل کی جرأت اس لئے ہو سکی کہ ان سے پہلے بعض بزرگوں نے اس کی تاویل کی ہے۔

تیسرا شعر:- اے مسلمان! اگر تیرے مذہبی عقائد یا شعور میں پراگندگی اور بے ربطی پیدا ہوگئی ہے تو رنجیدہ مت ہو۔ یہ سب فرنگی تعلیم کا قصور ہے پس تو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بخش تعلیمات سے اس بے ربطی کو دور کر دے اور کلمۂ توحید سے اس "افسوں" کو بے کار اور باطل کر دے اور اللہ تعالیٰ کا نام لے کر سرگرمِ عمل ہو جا۔



حصہ دوم

تعلیم و تربیت

مقصود[۵]

(سپنوزا)

نظر حیات پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند
حیات کیا ہے؟ حضور و سرور و نور و وجود

(فلاطوں)

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند
حیات ہے شبِ تاریک میں شرر کی نمود

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

۵ ریاض منزل (دولت کدہ سر راس مسعود) بھوپال میں لکھے گئے۔

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے اپنے پیش کردہ مقصود کا موازنہ دنیا کے دو مشہور حکیموں کے پیش کردہ مقصود سے کیا ہے پہلے سپنوزا کی تعلیم پیش کی ہے پھر افلاطون کی اور آخر میں اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔

اس نظم میں تین شعر ہیں اور ہر شعر میں ایک فلسفی کے خیالات کا نچوڑ پیش کیا ہے جب تک ان تینوں حکیموں کے فلسفہ سے پورے طور پر آگاہی نہ ہو نہ شعروں کا مطلب پورے طور پر سمجھ میں آسکتا ہے نہ اقبال کی ژرف نگاہی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ شرح اس تفصیل کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کتاب میں تو صرف اشعار کی شرح پر اکتفا کروں۔ اور ان حکماؑ کے فلسفہ کی تفصیل ایک جداگانہ کتاب میں لکھوں جس میں صرف یہی تین شعر ہوں۔ ناظرین کی آگاہی کے لئے اسپنوزا اور افلاطون کے مختصر سوانح حیات درج کئے دیتا ہوں۔

حکیم اسپنوزا۔ یہودی الاصل تھا ۱۶۳۲ء میں ہالینڈ (Holland) میں پیدا ہوا ابتدا میں مذہبی تعلیم حاصل کی لیکن فلسفہ کے مطالعہ کے بعد یہودی مذہب سے برگشتہ ہو گیا۔ چنانچہ ۱۶۵۶ء میں علمائے یہود نے اس کو جماعت

نوٹ:۔ میں نے اسپنوزا کی زندگی اور اس کے فلسفہ پر ایک مفصل مضمون لکھا تھا جو رسالہ معارف ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا اور افلاطون کے فلسفہ پر میرا ایک مضمون ہمایوں ۱۹۲۵ء میں اور دوسرا مضمون شاہکار ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا۔

سے خارج کر دیا انجام کار اس نے ہیگ (Thou Hague) میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور بقیہ عمر اسی شہر میں بسر کر دی۔ وہ عینکوں کے شیشے پالش کر کے اپنی روزی کماتا تھا اور خلوت میں فلسفیانہ تصانیف میں علم الاخلاق (ETHIES) سب سے زیادہ مشہور ہوئی اسی کتاب میں اس نے اپنا فلسفہ مدوّن کیا تھا جو وحدۃ الوجود پر مبنی ہے ۱۶۷۷ء میں وفات پائی۔

افلاطون ملک یونان میں ۴۲۷ ق م میں پیدا ہوا تھا۔ پہلے مختلف استادوں سے فنون لطیفہ (شاعری مصوّری اور موسیقی) اور فلسفہ حاصل کیا پھر ۴۲۷ ق م میں سقراط کی شاگردی اختیار کی ۴۹۹ ق م میں سقراط کی وفات کے بعد مصر اور دیگر ممالک کا سفر کیا اگرچہ وہ بہت بڑا فلسفی اور منطقی تھا لیکن شاعری اور تصوّف کا بھی ذوق رکھتا تھا ۵۴۷ ق م میں وفات پائی۔

اس کی تمام تصانیف ہم تک پہنچی ہیں ان میں سے مکالمات (Thou Dialogues) اور جمہوریت (Thalosubblic) بہت مشہور ہیں۔

اس کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دنیا جو آنکھوں سے نظر آتی ہے غیر حقیقی (Mural) ہے اسی لئے فانی بھی ہے اور ناقص بھی۔ اصلی یا حقیقی دنیا نگاہوں سے مخفی ہے اور یہ دنیا اسی کا ظل یا عکس ہے۔

پہلا شعر:۔ پہلے شعر میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ اسپنوزا کی رائے میں انسان کا مقصود یا نصب العین (Jalaos) حیات ہے اور

حیات کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ ذی حیات یعنی انسان کو خدا کی ہستی کا احساس ہو جائے اور اس احساس سے اسے روحانی لذت یعنی سرور حاصل ہو (یہ سرور ایک مستقل چیز ہے اور انسان اسی حالت سرور میں ابد تک رہے گا۔)

دوسرا شعر:۔ افلاطون کہتا ہے کہ حیات شب تاریک میں شرر کی نمود سے زیادہ نہیں ہے بس اس کی حقیقت اتنی ہی ہے جیسے اندھیری رات میں کوئی چنگاری ایک لمحہ کے لئے چمک کر فنا ہو جائے یعنی حیات کوئی مستقل چیز نہیں ہے اس لئے حیات انسان کا مقصود نہیں ہو سکتی بلکہ دانشمند وہ ہے جو موت کو مقصود بنائے کیونکہ موت کے بعد انسان اس غیر حقیقی دنیا سے رہائی پا کر حقیقی دنیا میں ہو جائے گا۔

تیسرا شعر:۔ اقبال کہتے ہیں کہ انسان کا مقصود نہ زندگی ہے نہ موت۔ بلکہ خودی ہے یعنی اللہ نے انسان کو اس غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ اطاعتِ احکام الٰہی یا اتباع شریعت کی بدولت اپنی خودی کی مخفی قوتوں کو بروئے کار لا کر خلافت الٰہیہ کا مستحق بن سکے جو شخص ان مخفی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا وہ اپنی تخلیق کے منشا سے بیگانگی کا ثبوت دیتا ہے پس اس کی زندگی اور موت یا اس کا وجود اور عدم دونوں یکساں ہیں اللہ نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرتے تاکہ فلاح پائے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا وہ فلاح پا جائے گا) اس پر دال ہے پس اصلی مقصود فلاح ہے اور یہ منحصر ہے تزکیۂ نفس پر جسے اقبال اپنی اصطلاح میں استحکام خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔

زمانہ حاضر کا انسان

عشق ناپید و خرد مے گردش صورت مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے موجودہ زمانہ کے تعلیم یافتہ انسان کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے کہ عقلی اعتبار سے تو اس نے بہت ترقی کر لی ہے لیکن روحانی اعتبار سے کوئی ترقی نہیں کی۔ کہتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ موجودہ زمانہ کے تعلیم یافتہ انسان میں عشق کا جذبہ بالکل ناپید ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی عقل اس کے حق میں موجبِ عذاب بن گئی ہے پس اسے لازم ہے کہ وہ اپنی عقل کو دل کے تابع بنا کر اسے اپنے حق میں

مفید بنائے اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔

اقبالؔ کا فلسفہ یہ ہے کہ صرف وہ عقل انسان کے لئے مفید ہو سکتی ہے جو اس کے دل کے تابع ہو۔ چنانچہ پیامِ مشرق میں لکھتے ہیں۔

نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

یعنی محض عقل کی بدولت تو نے جو کچھ سمجھا ہے وہ سب غلط ہے اگر تو حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو اپنی عقل کو عشق کے تابع کر دے۔

واضح ہو کہ مشہور جرمن فلسفی کانٹ (Kant) بھی یہی کہتا ہے کہ محض عقل حقائق اشیاء کا ادراک نہیں کر سکتی وہ صرف مظاہر کو جان سکتی ہے۔

دوسرا شعر:۔ چنانچہ موجودہ زمانہ کا انسان ستاروں کی گذرگاہیں تو معلوم کر رہا ہے لیکن خود اپنے افکار کی حقیقت سے واقف نہیں ہے یعنی کائنات کا علم تو حاصل کر رہا ہے لیکن اپنی حقیقت سے بے خبر ہے۔

تیسرا شعر:۔ اور فلسفیانہ مسائل میں اس قدر الجھا ہوا ہے کہ آج تک یہ نہ معلوم کر سکا کہ وہ طریق زندگی کون سا ہے جس پر چلنے سے اُسے اطمینانِ قلب حاصل ہو سکتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ اس نے سورج کی شعاعوں کو تو اپنے قابو میں کر لیا ہے لیکن اس کی زندگی بدستور سابق تاریک ہے یعنی سائنس میں بہت کچھ ترقی کر لی ہے لیکن اپنے نفس کی اصلاح کی طرف سے بالکل غافل ہے۔

(٭)

اقوامِ مشرق

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق اُن کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیّت کہ جو ہے خود لبِ گور

(٭)

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے ایشیا کی قوموں کی کوتاہ بینی پر ماتم کیا ہے جو مغربی تہذیب کو اپنے مرض کی دوا سمجھ کر بے سوچے سمجھے اس کی تقلید کر رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ جن لوگوں کی آنکھیں غلامی اور تقلید کی وجہ سے اندھی ہو گئی ہیں ان کو واضح حقائق بھی نظر نہیں آسکتے۔

دوسرا شعر:۔ وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ بھلا وہ مغربی تہذیب جو خود دم توڑ رہی ہے دوسروں کو کس طرح زندہ کر سکتی ہے یعنی جو تہذیب مغربی اقوام کو تباہی سے نہیں بچا سکی وہ ہمیں کسی طرح فائدہ پہنچا سکتی ہے۔؟

آج کل ترکی، مصر، شام۔ ایران، عرب۔ ہند اور پاکستان سب ممالک مغربی تہذیب کے اصول اختیار کر رہے ہیں اور اتنا غور نہیں کرتے کہ اس تہذیب

کی بنیاد تو لادینی پر ہے لہٰذا یہ تہذیب مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

آگاہی

نظر سپہر پہ رکھتا ہے جو ستارہ شناس
نہیں ہے اپنی خودی کے مقام سے آگاہ
خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکتِ صبح و شام سے آگاہ
وہی نگاہ کے ناخوب و خوب سے محرم
وہی ہے دل کے حلال و حرام سے آگاہ

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے صحیح شعور کی حقیقت واضح کی ہے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ جو شخص حصول سائنس کو مقصدِ حیات سمجھتا ہے وہ اپنی خودی کے مقام سے واقف نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے وہ اس بات سے واقف ہو جائے کہ سب سے بڑا سیارہ کون سا ہے اور وہ زمین سے کس قدر دور ہے لیکن علم ہیئت اس کو خودی کی معرفت عطا نہیں کر سکتا۔

دوسرا شعر:۔ دنیا کی حقیقت سے وہی شخص آگاہ ہو سکتا ہے

جو پہلے اپنی خودی اور اس کی حقیقت اور رفعت و عظمت سے آگاہ ہو جائے۔

تیسرا شعر:۔ نیز وہی شخص اس حقیقت سے واقف ہو سکتا ہے کہ انسان کے لئے کون سی چیز مفید اور جائز ہے اور کون سی چیز مضر اور ناجائز ہے اور جب تک ایک شخص کو ان باتوں سے آگاہی حاصل نہ ہو وہ حقیقی معنیٰ میں انسان نہیں بن سکتا۔

مصلحینِ مشرق

میں ہوں نومید تیرے ساقیانِ سامری فن سے
کہ بزمِ خاوراں میں لے کے آئے ساغرِ خالی
نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں
پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

شرحِ مشکلات

اس نظم میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ مشرقی ممالک خصوصاً اسلامی ممالک اور غیر منقسم ہندوستان میں جو مصلحین پیدا ہوئے اُن سے مجھے یہ توقع نہیں کہ مشرقی قوموں اور مسلمانوں کی کوئی قرار واقعی اصلاح کر سکیں گے۔

پہلا شعر:۔ جس طرح وہ ساقی جو بزم میں خالی بوتلیں لے کر آئے اہل بزم کو شراب نہیں پلا سکتا اسی طرح یہ مصلحین بھی نرے جادوگر ہیں ان کے پاس اصلاح قوم کا کوئی پروگرام نہیں ہے اور یہ تو محض مغربی اقوام کے مقلد ہیں اور قوم کو نفع کے بجائے نقصان پہنچاتے ہیں

دوسرا شعر:۔ جس طرح سامری نے ایک بچھڑا بنا کر اپنی قوم کو گمراہ کر دیا تھا اسی طرح یہ لوگ مصلحین کے لباس میں بجلی کی طرح ظاہر ہوتے ہیں اور غیر اسلامی اصول قوم کے سامنے پیش کر کے اسے گمراہ کرتے ہیں اور چونکہ قوم جاہل ہے اس لئے ان کی باتوں میں آجاتی ہے۔

مغربی تہذیب

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

شرح مشکلات

اس نظم میں علامہ اقبال نے مغربی تہذیب پر تنقید کی ہے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:- اس تہذیب کی روح پاکیزہ نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تہذیب سراسر لادینی پر مبنی ہے اور چونکہ ایسا ہے اس لئے یہ تہذیب انسانوں کو روحانیت اور اخلاق حسنہ سے بیگانہ بنا دیتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب انسان کی روح ناپاک ہو تو اس میں نہ پاک ضمیر پیدا ہو سکتا ہے نہ بلند خیال ہی پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ذوقِ لطیف پیدا ہو سکتا ہے۔

دوسرا شعر:- جو قومیں اس تہذیب کی حامل ہیں ان میں یہ تمام خوبیاں ناپید ہیں اور آج کل دنیا جس مصیبت میں مبتلا ہے اور جس تباہی کی طرف جا رہی ہے وہ اس تہذیب کا لازمی نتیجہ ہے۔

اَسرارِ پیدا

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
ناچیز جہانِ مہ و پروین ترے آگے
وہ عالمِ مجبور ہے تو عالمِ آزاد
موجوں کی تپش کیا ہے فقط ذوقِ طلب ہے
پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خداداد

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دَم ہے اگر تُو تو نہیں خطرۂ اُفتاد

(:)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے بعض حقائق و معارف بیان کئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ جس قوم کے نوجوان اپنی خودی کو فولاد کی طرح مضبوط بنالیں اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی یہ ایک دلپذیر اسلوب بیان ہے اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کہ شمشیر اسی قوم کے حق میں مفید ہو سکتی ہے جس کے نوجوان پہلے اپنی خودی کو مستحکم بنالیں یعنی کسی نصب العین کے حصول کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرلیں اور اگر ان کے اندر یہ جوہر پیدا نہ ہو سکے تو پھر شمشیر یعنی آلاتِ حرب بالکل بیکار ثابت ہوں گے۔ کامیابی دراصل مذکورہ بالا جذبہ کی بنا پر حاصل ہوتی ہے نہ کہ محض سامانِ جنگ کی بدولت۔

دوسرا شعر:۔ اے مخاطب! یہ دنیا اور اس کے عناصر ترکیبی سب تیرے سامنے ہیچ ہیں کیونکہ یہ سب اجرام فلکی زمین و آسمان۔ چاند سورج جمادات اور نباتات مجبور ہیں ان کو اپنی مرضی سے زندگی بسر کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے مثلاً آگ کو یہ اختیار نہیں کہ جلانا چھوڑ دے لیکن تو خلیفۃ اللہ ہے تجھ کو اللہ نے وہ نعمت عطا کی ہے جو کائنات میں کسی کو عطا نہیں

کی اور وہ نعمت آزادی یا اختیار ہے تجھ کو یہ اختیار ہے کہ اگر تو چاہے تو اپنی خودی کو بلند کر سکتا ہے اس قدر بلند کہ خلافتِ الٰہیہ کے مقام پر فائز ہو سکتا ہے پس تو اس نعمت کی قدر کر اور اس مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کر۔

تیسرا شعر:۔ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ اور ہر چیز میں کوئی نہ کوئی نعمت یا دولت پوشیدہ رکھی ہے اور اس سے مقصد یہ ہے کہ انسان اس کے حصول کی کوشش کرے بمثلاً اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے صدف کے اندر موتی پنہاں کر دیا ہے اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ موجوں کی طرح اپنے اندر ذوق طلب پیدا کرے اور یہ نعمت یا دولت حاصل کرے پس انسان کو موجوں سے جد و جہد کا سبق سیکھنا چاہیئے۔

چوتھا شعر:۔ اب اگر تجھے یہ اندیشہ لاحق ہو کہ مسلسل کوشش سے شاید میں تھک جاؤں گا تو شاہین کی زندگی سے سبق سیکھ! آج تک کسی نے کسی شاہین کو مسلسل پرواز کی بنا پر تھک کر گرتے ہوئے نہیں دیکھا کیوں؟ اس لئے کہ وہ طاقتِ پرواز آتے ہی اڑنا شروع کر دیتا ہے اور کثرت و شدتِ پرواز سے اپنے اندر اس قدر طاقت پیدا کر لیتا ہے کہ تھکن اس کے پاس نہیں آسکتی اسی طرح تو رات دن کوشش کئے جا اسی کوشش سے تیرے اندر سعیٔ پیہم کی طاقت پیدا ہو جائے گی۔

(۴)

سلطان ٹیپو کی وصیّت

تو رہ نوردِ شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشین ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمیٔ محفل نہ کر قبول
صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

(٭)

شرح مشکلات اس ولپذیر نظم میں علّامہ اقبال نے سلطان شہیدؒ کی سیرت بیان کی ہے اور ان اصولوں کی وضاحت کی ہے جن پر یہ مردِ مومن ساری عمر کاربند رہا۔

واضح ہو کہ اقبال کو سلطان ٹیپو شہید سے بہت عقیدت تھی چنانچہ

انہوں نے اپنے شاہکار (اور اسی لئے غیر معروف) جاوید نامہ میں چند سطریں نہیں بلکہ آٹھ صفحے اس مرد مجاہد کے ذکر جمیل کی نذر کئے ہیں۔

مسلمان اس نامور فرزند اسلام کی سیرت سے اس لئے بے خبر ہیں کہ وہ انگریزوں کا جانی دشمن تھا اور اس کی شہادت کے بعد یہ دشمن اسلام گروہ ہندوستان پر قابض ہوگیا اس لئے اسے ہندوستان کی تاریخ میں اس مرد مومن کا تذکرہ ایسے نفرت انگیز پیرایہ میں کیا کہ پڑھنے والوں کو اس سچے مسلمان سے عقیدت تو درکنار نفرت ہوگئی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ اس مرد حُر کا وجود کفر کے سیلاب کے مقابلہ میں ایک بند تھا۔ افسوس کہ ۱۷۹۹ء میں یہ بند ٹوٹ گیا۔ اور کفار فرنگ کا سیلاب ملک پر محیط ہوگیا۔ میں اپنے دعوے کے اثبات میں حسب ذیل حقائق پیش کرتا ہوں۔

۱۔ شہادتِ سلطان ٹیپو ۱۷۹۹ء

۲۔ پورے دکن پر اقتدار ۱۸۰۰ء

۳۔ کرناٹک پر قبضہ ۱۸۰۰ء

۴۔ روہیلکھنڈ اور مشرقی یوپی پر قبضہ ۱۸۰۱ء

۵۔ دلّی پر قبضہ ۱۸۰۳ء

۶۔ ہلکر کی شکست اور وسط ہند پر اقتدار ۱۸۰۵ء

۷۔ کاٹھیاواڑ اور گجرات پر اقتدار ۱۸۰۷ء

۸۔ راجپوتانہ پر اقتدار ۱۸۱۷ء

۹۔ مرہٹوں کا خاتمہ ۱۸۱۸ء

یعنی بتیس سال کی قلیل مدت میں پنجاب کے علاوہ سارا ہندوستان یونین بینک کے سایۂ بوم پایہ کے نیچے آگیا۔

سلطان ٹیپو کا اصلی نام فتح علی خاں تھا۔ ۱۷۵۱ء میں پیدا ہوا شجاعت اور مردانگی۔ دلیری اور جانبازی۔ یہ خوبیاں اس کی سرشت میں داخل تھیں چنانچہ سلطان ٹیپو کے باپ نے ۱۷۶۶ء میں اپنی فوج میں ایک رجمنٹ کا افسر بنا دیا۔ اور اس لبطل جلیل نے ۱۷۶۷ء میں جبکہ اس کی عمر صرف سولہ سال کی تھی۔ مرہٹوں کے مقابلہ میں پہلی کامیابی حاصل کی ۱۷۹۹ء میں ۴ مئی کو میر صادق اور دوسرے غدّارانِ مملکت کی بدولت میدان جنگ میں شہادت حاصل کی۔ گویا ہندوستان میں مسلمانوں کی سطوت کا خاتمہ ہوگیا۔

اسی دن رات کے نو بجے انگریزوں نے سلطان ٹیپو شہید کی نعش بہت تلاش کے بعد کشتوں کے انبار میں سے نکالی تو دیکھا کہ شمشیر آبدار اسی طرح اس مرد مجاہد کے ہاتھ میں ہے۔ چونکہ اس کا قبضہ خون آلودہ تھا اس لئے بصد مشکل معشوق کو عاشق سے جدا کیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کارکنان قضا و قدر نے اس رات سلطان ٹیپو کے ہاتھ سے تلوار نہیں لی۔ بلکہ مشرق میں مسلمانوں کے ہاتھ سے تلوار لے لی اور یہ میرے ہی جذبات نہیں ہیں اس زمانہ کے مسلمانوں نے بھی سلطان کی شہادت کو مسلمانوں کی حکومت کے خاتمہ سے تعبیر کیا تھا۔ چنانچہ ایک شاعر نے سلطان ٹیپو کی تاریخ شہادت کو جس مصرع سے نکالی ہے وہ میرے دعوے پر شاہد ہے۔

ع خرد گفت تاریخ "شمشیر گم شد"

۱۲۱۴ھ

"شمشیر گم شد" کے اعداد سے تاریخ شہادت نکلتی ہے اور تاریخ مشرق گواہ ہے کہ مسلمانوں کی تلوار واقعی گم ہوگئی اور اس سے بھی زیادہ افسوس یہ ہے کہ وہ گم شدہ تلوار ابھی تک نہیں ملی۔ غور سے دیکھا جائے تو اقبال کا پیغام اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ مسلمان اس شمشیر جگر دار کو پھر کہیں سے ڈھونڈھ نکالیں۔

پہلا شعر:۔ اے مسلمان! تو اللہ کا عاشق ہے اور مقصد حیات اس تک پہنچتا ہے اس لئے تو "منزل" قبول نہیں کر سکتا۔ یعنی دنیا سے دل نہیں لگا سکتا اور اس دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت یا لذّت تجھ کو راہِ حق سے باز نہیں رکھ سکتی۔

دوسرا شعر:۔ تو ہر دم ترقی کی کوشش کر اور باطل کا مقابلہ کر۔ اگر دنیا تجھے عافیت اور سکون کی طرف بلائے تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی مت دیکھ مومن عیش کی زندگی کے لئے نہیں پیدا ہوا۔

تیسرا شعر:۔ تو دنیا کی فانی دلچسپیوں میں منہمک ہو کر اپنے مقصد حیات سے غافل مت ہو۔ تو محفل گداز ہے یعنی عیش و عشرت کا دشمن ہے اس لئے ان چیزوں کی طرف توجہ مت کر۔ تو تجھے میدان جہاد سے باز رکھ سکتی ہیں مثلاً دولت۔ عورت اور دنیاوی شوکت وغیرہ۔

چوتھا شعر:۔ اسلامی تعلیمات نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ اپنے دل کو عقل کے تابع نہیں کرنا چاہئے کیونکہ عقل تو یہی کہتی ہے۔ کہ میدانِ جنگ میں جان کا خطرہ ہے حالانکہ مسلمان کا فرض منصبی تو جہاد فی سبیل اللہ

ہے اور جہاد تام ہی اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈالنے کا ہے۔

پانچواں شعر:۔ باطل کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ طاقتور انسان یا قوم کی اطاعت بھی کرو اور حق کی تلقین یہ ہے کہ خدا کے علاوہ اور کسی کی اطاعت مت کرو۔ چونکہ تو حق پرست ہے اس لئے حق کے ساتھ باطل کو شامل مت کر یعنی اللہ کے سوا اور کسی کی اطاعت مت کر۔

نوٹ:۔ سلطان ٹیپو شہیدؒ کی زندگی اور اشعار کی جیتی جاگتی تصویر تھی اس نے انگریزوں کی غلامی پر موت کو ترجیح دی کیونکہ مسلمان اللہ کے علاوہ اور کسی کا غلام نہیں ہو سکتا۔ کاش یہ نکتہ نظام علی خاں۔ غلام حیدر آباد اور محمد علی۔ غلام کرناٹکی کی سمجھ میں بھی آجاتا تو ہندوستان کی تاریخ آج بالکل مختلف ہوتی۔ واحسرتا۔!

(٭)

غزل

نہ ہیں اعجمی، نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی!
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی
تو مری نظر میں کافر میں تری نظر میں کافر
ترا دیں نفس شماری، مرا دیں نفس گدازی
تو بدل گیا تو بہتر کہ بدل گئی شریعت
کہ موافقِ تدبر واں نہیں دینِ شاہبازی

ترے دشت و در میں مجھ کو وہ جنوں نظر نہ آیا
کہ سکھا سکے خرد کو رہ و رسمِ کارسازی
نہ جدا رہے نوا گر تب و تابِ زندگی سے
کہ ہلاکیٔ امم ہے یہ طریقِ نے نوازی

(٭)

شرح مشکلات اس غزل میں علامہ اقبال نے بعض حقائق و معارف بیان کئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ جب تک انسان اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتا اس کا زاویۂ نظر محدود ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو مختلف ملکوں سے منسوب کرتا ہے۔ لیکن جب وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ اللہ ساری کائنات کا خالق اور رب ہے اور سب لوگ ایک آدم کی اولاد ہیں تو اس کا زاویۂ نگاہ آفاقی ہو جاتا ہے۔ پھر وہ عراقی یا ہندی یا حجازی کے امتیازات سے بالاتر ہو جاتا ہے اس کی نظر میں عجمی بھی اللہ کی مخلوق ہے اور انسان ہے اور ایرانی بھی وہ پھر مختلف قوموں میں کوئی امتیاز نہیں کرتا اور سب سے محبت کرتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اے مخاطب! تو زندگی کا مقصد یہ سمجھتا ہے کہ انسان جتنے زیادہ دنوں تک زندہ رہ سکے۔ اتنا ہی اچھا ہے لیکن میں زندگی کا مقصد یہ سمجھتا ہوں کہ انسان جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول رہے اور طول حیات کی تمنا نہ کرے اسی لئے میں تیری نظر میں کافر ہوں اور تو میری نظر میں کافر ہے

تیسرا شعر:۔ اسلام تو انسان کو شاہباز بنانا چاہتا ہے لیکن اس دورِ غلامی میں دین اسلام کا مفہوم ہی بدل گیا ہے اب شریعت اسلامی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کمزور بن جائے پس اچھا ہوا کہ تو بھی بدل گیا کیونکہ باز کی زندگی۔ چکور کی زندگی سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ تیتر بھلا باز کی زندگی کیسے اختیار کر سکتا ہے؟

چوتھا شعر:۔ اے مسلمان! تیری زندگی میں مجھے عشق کا وہ جذبہ نظر نہیں آتا جو تیری عقل کی اصلاح کر سکے اور جب تک عقل انسانی عشق کے تابع نہ ہو وہ انسان کے حق میں مفید نہیں ہو سکتی۔

پانچواں شعر:۔ اگر شاعر اپنے کلام میں زندگی کے حقائق پیش نہیں کرتا تو اس کی شاعری قوم کے حق میں ہلاکت کا پیغام بن جاتی ہے۔ انیسویں اور موجودہ صدی کی اردو شاعری پر نگاہ ڈالنے سے اس شعر کی صداقت واضح ہو سکتی ہے۔ اور افسوس یہ ہے کہ مسلمان قوم ابھی تک اسی مہلک قسم کی شاعری میں مبتلا ہے۔

(٭)

بیداری

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے برّندہ و بَرّاق!
اس کی نگہِ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار
ہر ذرّہ میں پوشیدہ ہے جو قوّتِ اشراق!
اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندۂ آفاق ہے، وہ صاحبِ آفاق!
تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی
وہ پاکیٔ فطرت سے ہوا محرمِ اعماق!

(:)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ جب کسی انسان کی خودی بیدار ہو جاتی ہے یعنی اسے معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو اس بیداری یا شعور یا آگاہی یا وقوف سے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں اور اس شخص کی زندگی میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ جو شخص اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے وہ کبھی باطل یا کفر سے نہیں ڈرتا بلکہ اس میں باطل کو فنا کرنے کے لئے تلوار کی سی تیزی

پیدا ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس کا وجود باطل شکن اور کفر پاس بن جاتا ہے

دوسرا شعر:۔ وہ کائنات کی ہر شے سے واقف ہو جاتا ہے

ہر ذرّہ میں ایک قوّت پوشیدہ ہے جو ابھرنا اور طلوع ہونا چاہتی ہے مردِ مومن اس پوشیدہ قوت سے بھی واقف ہوتا ہے۔ القصّہ اسرار و رموز کائنات اس پر منوّر ہو جاتے ہیں اور بغیر کتابوں کا مطالعہ کئے وہ عالم بن جاتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں (تجھے اور مجھے) اس مردِ خدا سے کوئی نسبت ہی نہیں اور ہم اس کے مقام کی بلندی کا تصوّر ہی نہیں کر سکتے جس طرح اندھا گلاب کے رنگ کا تصور نہیں کر سکتا اور بہرا موسیقی کی دلکشی کا تصور نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زمان و مکان کی قید میں ہیں اور وہ زمان و مکان پر حکمران ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ یہ اقبال کا محبوب موضوع ہے اور انہوں نے اس نکتہ کو ہر ممکن طریق سے ادا کیا ہے۔ افسوس کہ میں ان کی کتابوں سے مثالیں دے کر اس شرح کو ضخیم اور دشوار بنانا مناسب نہیں سمجھتا لیکن ناظرین کو یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ کلام اقبال کو صرف ریڈیو پر سن لینا کافی نہیں ہے اُسے سمجھنے کی بھی کوشش کرنی چاہئے اقبال کا پیغام یہ ہے کہ مسلمان اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ دین اسلام ان کو زمان و مکان پر قدرت عطا کر سکتا ہے۔

بشرطیکہ مسلمان اسلام کو دین (ضابطۂ حیات) سمجھ کر اُسے اپنی زندگی

کے ہر شعبہ میں حاکم تسلیم کرلیں لیکن ہمارا حال تو یہ ہے کہ جب مسجد میں گئے تو اللہ سے اقرار کرلیا کہ ہم تیرے سوا نہ کسی کی اطاعت کرتے ہیں اور نہ کسی سے امداد طلب کرتے ہیں (اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنَ) اور جب باہر نکلے تو فوراً اپنے طرز عمل سے اس قول کی تردید کردی۔ اندریں حالات ہمیں حکومت اور طاقت حاصل ہوگی یا ذلت اور مسکنت؟ غور سے دیکھو کیا یہ صریح منافقانہ روش نہیں ہے؟ بس اقبال یہی چاہتے ہیں کہ تم اپنے قول اور فعل میں مطابقت پیدا کرلو۔ پھر دیکھو تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ اس قدر فضل کرے گا کہ تم دنیا تو کیا چیز ہے زمان و مکان پر حکومت کرسکو گے۔

افسوس کہ مسلمان اس طرف توجہ ہوتے نہیں۔ غیر ضروری باتوں میں اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔

چوتھا شعر:۔ کہتے ہیں کہ تو بالکل مردہ ہے تجھ میں حقائق کائنات کا علم حاصل کرنے کی طلب بھی پیدا نہیں ہوئی اور مرد مومن تقویٰ کی بنا پر اعماق حیات زندگی کی گہرائیوں تک سے واقف ہوجاتا ہے یعنی وہ تو کامیاب ہوگیا اور تجھ میں کامیابی و کامرانی کی آرزو و خواہش بھی پیدا نہیں ہوئی۔

(۞)

خودی کی تربیت

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شبیب و شبانیٔ شب و روز

شرح مشکلات

پہلا شعر:۔ اگر انسان اپنی خودی کی تربیت کرے یعنی سچے دل سے اتباعِ شریعت کرنے لگے تو اس میں اس قدر طاقت پیدا ہو سکتی ہے کہ انسان جو مٹی سے بنا ہے۔ باطل کو پھونک سکتا ہے یعنی مٹی میں آگ کی صفت پیدا ہو سکتی ہے۔

دوسرا شعر:۔ یاد رکھو! اللہ کے انعامات کا مستحق بننے کا طریقہ ایک ہی ہے اور وہ شروع سے یکساں چلا آرہا ہے۔

ع ہوائے دشت و شبیب و شبانیٔ شب و روز

(۱۔ ہوائے دشت لفظی معنیٰ جنگل کی فضا یا صحرا کا ماحول مراد ہے پاکیزہ زندگی (کیونکہ ہوائے دشت عموماً صاف ہوتی ہے)

(ب ۔ شعیب نام ہے ایک نبی کا۔ مراد ہے مرشد یا خدا رسیدہ انسان۔ بہت ہی نیک اور شریف آدمی۔

(ج ۔ شبانی۔ بھیڑیں چرانا۔ مراد ہے۔ مرشد کی خدمت کرنا یا اطاعت کرنا۔ یا فرمانبرداری میں منہمک رہنا۔

اب سوال یہ ہے کہ زمانہ میں کتنے مسلمان ہیں جو شہروں کے ناپاک اور غلیظ ماحول سے بچنا چاہتے ہیں یا اس گندے ماحول سے بچ کر پاکیزہ ماحول یعنی علما اور صلحا کی صحبت میں رہنا چاہتے ہیں؟ پھر کتنے مسلمان ہیں جو کسی مرشد کامل کی صحبت میں رہنا چاہتے ہیں؟ صحبت تو بڑی چیز ہے کتنے مسلمان ہیں جن کے دل میں مرشد کی تلاش کی آرزو پیدا ہوتی ہے؟ اور یہ مسلّم ہے کہ خودی کی پرورش اور تربیت مرشد کے بغیر ناممکن ہے۔ صحابہ کرامؓ اگر ۱۳ سال تک ایک مرشد کامل کی صحبت نہ اٹھاتے اور صحبت کی بدولت اپنی خودی کی تربیت نہ کرتے تو ۲ھ میں کفر کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے؟ بلکہ صحبت کا شرف حاصل نہ ہوتا تو انہیں مسلمانوں پر یہ فضیلت کیسے حاصل ہوتی مثلاً ان میں بہت سے اُمّی محض تھے پھر انہیں امام رازیؒ پر کیسے تفوق حاصل ہو گیا۔؟

قصہ مختصر جب تک مسلمان اس نکتہ کو حرزِ جان نہیں بنائیں گے ان کی ترقی کی کوئی صورت نہیں ہے کیا خوب فرمایا حکیم سعدیؒ نے۔

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

آزادیٔ فکر

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

(٭)

شرح مشکلات اقبال کہتے ہیں کہ آج کل حرّیتِ فکر کا بہت چرچا ہے جسے دیکھو آزادیٔ فکر کا وکیل بنا ہوا ہے اور پوری قوت کے ساتھ کہتا ہے کہ آزادیٔ فکر ہمارا پیدائشی حق ہے مطلب اس سے یہ ہوتا ہے کہ اس دَور میں ہر شخص کو غور و فکر۔ سوچ و بچار اور اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی ہونی چاہیئے۔

پہلا شعر:۔ اقبال کہتے ہیں کہ بلاشبہ آزادیٔ فکر بہت اچھی بات ہے لیکن جن لوگوں کو تفکّر یعنی فکر کرنے کا طریقہ نہیں آتا۔ جو تدبّر یعنی غور و فکر کے مبادی سے بھی واقف نہیں ہیں اگر وہ اپنے ناقص اور خام خیالات لوگوں کے سامنے پیش کر دینا شروع کر دیں گے تو خود بھی تباہ ہوں گے اور وہ دوسروں کو بھی تباہ کریں گے۔ کیونکہ اندھا اندھوں کو راستہ نہیں دکھا سکتا۔

دوسرا شعر:۔ فکر اگر خام ہو اگر کسی انسان نے مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی فکر (عقل) کو پختہ نہیں کیا تو وہ قرآن مجید کا مطلب بھی غلط سمجھے گا اور حدیث کا مفہوم بھی اس پر واضح نہیں ہوگا پس وہ لوگوں کو بھی غلط راستہ پر چلائے گا اور خود بھی غلط راستہ پر چلے گا۔ اور اقبال کہتے ہیں کہ اگر کسی انسان کو حیوان بنانا چاہتے ہیں تو جس شخص کی فکر ابھی خام ہو۔ اسے آزادئ افکار عطا کر دیجئے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ موٹر چلانی اچھی بات ہے لیکن جس شخص کو چلانے کا طریقہ نہیں آتا وہ اگر موٹر چلائے گا تو موٹر بھی ٹوٹ جائے گی اور خود اس کی ہڈیاں بھی چور چور ہو جائیں گی پس جس طرح موٹر بھی چلانا ایک فن ہے سوچنا بھی تو ایک فن ہے اور بغیر استاد نہ وہ آسکتا ہے نہ یہ۔

خودی کی زندگی

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر!
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر!
نہنگِ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد
نہنگ مُردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر!

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ اگر خودی زندہ ہو جائے تو کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں اور انسان کی زندگی میں کیا انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ اگر کسی شخص کی خودی زندہ ہو جائے یعنی اطاعت یا اتباعِ شریعت کی بدولت مرتبہ کمال کو پہنچ جائے تو اسے فقیری میں بھی بادشاہی کا لطف حاصل ہو سکتا ہے صاحب فقر کا مرتبہ سنجر اور طغرل سے کسی طرح کم نہیں ہوتا واضح ہو کہ سنجر اور طغرل ترکوں کے سلجوقی خاندان میں دو نہایت زبردست اور مشہور بادشاہ گذرے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ اگر خودی زندہ ہو جائے تو انسان معجزے دکھا سکتا ہے اس کے سامنے سمندر بھی پایاب ہو جاتا ہے (اشارہ ہے حضرت موسیٰؑ کی طرف جن کے روحانی تصرف سے بحر قلزم پایاب ہو گیا تھا) اور پہاڑ جو نہایت سخت چیز ہے ریشم کی طرح نرم ہو جاتا ہے یعنی دشوار کام آسان ہو جاتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ مثال کے طور پر دیکھ لو نہنگ اگر زندہ ہے تو سمندر میں بھی آزاد ہے اور اس کی موجوں کو چیر کر جدھر چاہے جا سکتا ہے لیکن اگر وہ مردہ ہو جائے تو سمندر کی موج در کنار وہ سراب کی موج کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا یعنی ریت میں بھی حرکت نہیں کر سکتا ہے اسی طرح انسان کی زندگی در اصل اس کی خودی کی بیداری سے عبارت ہے اگر خودی مردہ ہے تو وہ انسان بھی مردہ ہے گو بظاہر زندہ نظر آتا ہے۔

گرچہ کالج کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

حکومت

ریاض منزل (دولت کدہ سر راس مسعود) بھوپال میں لکھے گئے۔

ہے مریدوں کو تو حق بات گوارا لیکن
شیخ و ملّا کو بری لگتی ہے درویش کی بات

قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار
بحث میں آتا ہے جب فلسفۂ ذات و صفات

گرچہ اس دیر کہن کا ہے یہ دستور قدیم
کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات

قسمتِ بادہ مگر حق ہے اسی ملّت کا
انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے استعارے اور مجاز کے رنگ میں اور اپنے مخصوص انداز میں حکومت کے حصول کا طریقہ بتایا ہے۔ (بادہ و مینا سے حکومت مراد ہے)

پہلا شعر:- عام مسلمان تو میری باتوں کو غور سے سن سکتے ہیں لیکن صوفی اور حنفی ملّا میری سچی باتوں کو پسند نہیں کرتے۔ یہاں صوفی سے مراد ہے وہ شخص جو مسلمانوں کو غیر اسلامی تصوّف کی تعلیم دیتا ہے اور غیر اسلامی تصوّف سے میری مراد ہے ہر وہ تعلیم جو مسلمانوں کو عمل سے بیگانہ بنا دے یا اس کی قوت عمل کو کمزور کر دے۔ اسی طرح حنفی ملا سے مراد ہے وہ تنگ نظر و قدامت پرست اور مقلد کور مذہبی پیشوا جو اپنے ماحول اور حالات حاضرہ سے بے خبر حجرہ میں بیٹھا ہوا مسلمانوں کے اندر فروعی اختلافات کو تقویت دیتا رہتا ہے دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی لیکن وہ ابھی تک اس بحث میں الجھا ہوا ہے کہ آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ کہی جائے۔ مقلد کور حنفی ملّا کہتا ہے کہ آہستہ کہی جائے جو سنت کے خلاف ہے۔

اقبال کی رائے میں مسلمانوں کی پستی کے ذمہ دار تین گروہ ہیں۔ اوّل وہ امراء جو عیّاشی و بدکاری میں مصروف رہتے ہیں اور قوم کے سامنے برا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ دوّم وہ صوفی جو خانقاہوں میں اللہ کی اطاعت کے بجائے اپنی اطاعت کا سبق دیتے ہیں اور ان میں غیر اسلامی خیالات پیدا کرتے ہیں جن کا لازمی نتیجہ کاہلی بے عملی اور جہاد سے گریز ہے۔ سوّم وہ علما جو مدرسوں میں مسلمانوں

کو غیر شرعی یا فروعی مسائل میں اُلجھا کر ایک طرف مقاصدِ حیات سے غافل کرتے ہیں تو دوسری طرف ان میں اختلاف و افتراق پیدا کرتے ہیں۔

اقبال نے یہ کوئی نئی تشخیص نہیں کی ہے ان سے مدّتوں بلکہ صدیوں پہلے ایک شاعر نے صرف ایک ہی عربی شعر میں مسلمانوں کے مرض کی یہی تشخیص واضح طور پر بیان کر دی ہے۔

وَمَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ
وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَّ رُھْبَانُھَا

اور دین اسلام کی تخریب نہیں کی مگر ان تین گروہوں نے۔ ملوک۔ علماءِ سوء یعنی بدعتی علماء اور رہبان یا صوفیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ ان تینوں طبقات نے مل کر دین اسلام کو بالکل مسخ کر دیا۔ اور غیر شرعی مسائل کو جس کا قرآن و حدیث سے کوئی تعلق اور لگاؤ نہیں اسے دین بنا دیا۔

دوسرا شعر:۔ اب اقبال یہ بتاتے ہیں کہ صوفی اور حنفی ملّا کا تصور کیا ہے؟ یعنی اقبال جو ان دونوں سے ناراض ہیں تو کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاہل صوفی اور تنگ نظر حنفی ملّا دونوں ایک ہزار سال سے مسلمانوں کو خالص توحید سے ہٹا کر ذات و صفات باری تعالیٰ کے پیچیدہ اور لایحل مسائل میں اُلجھائے ہوئے ہیں اور اس غلط بلکہ گمراہ کن روش کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کردار یعنی عمل اور جہاد سے بیگانہ ہو گئی ہے۔

اور یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جو قوم بھی ذات و صفات باری تعالیٰ

کی بحث میں گرفتار ہو جائے گی وہ عمل صالح اور جدّ وجہد سے بیگانہ ہو جائیگی تاریخِ عالم سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

(ا) ۔ جب اہل یونان۔ ذات وصفات باری تعالیٰ کی بحثوں میں مبتلا ہوئے تو رومیوں کے غلام بن گئے۔ ۵۳۹ء کا واقعہ ہے۔

(ب۔ جب اہل ایران۔ ان مباحث میں گرفتار ہوئے تو عربوں کے غلام بن گئے۔ یہ واقعہ ۶۳۸ء میں ہوا۔

(ج) ۔ جب اہل ہند۔ ان بحثوں میں منہمک ہوئے تو ترکوں کے غلام بن گئے اور یہ ۱۲۰۶ء میں ہوا۔

(د۔ جب رومی عیسائی۔ ان مسائل میں الجھے تو مسلمانوں کے غلام بن گئے۔ اور یہ واقعہ ۱۲۵۳ء میں پیش آیا۔

(ہ ۔ جب مسلمان۔ ان مسائل میں گرفتار ہوئے تو انگریزوں کے غلام بن گئے اور ایسا ۱۸۰۳ء میں ہوا۔

اگر ان تاریخی شواہد کی تفصیل بیان کروں تو یہ شرح اچھی خاصی تاریخ کی کتاب بن جائے گی اس لئے تاریخ داں حضرات کے لئے صرف سنہ عیسوی درج کر دی ہے۔

اسی حقیقت۔ بلکہ قانون قدرت کو مدّ نظر رکھ کر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو وصیت فرمائی تھی کہ دیکھو! میں تمہیں متنبہ کئے دیتا ہوں تم ہرگز اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی کو نہ شریک کرنا اور نہ اس کے متعلق بحث ومباحثہ کرنا۔ تم سے پہلے اگلی قومیں اسی بحث

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں انسانوں کو شریک کرنے میں منہمک ہو جانے کی بدولت ہلاک ہو گئیں (یعنی دوسروں کی غلام ہو گئیں) اور ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کے فلسفہ میں انہماک بھی یقیناً بربادی کا پیغام ہے کیونکہ انسان ان مسائل کو عقل کے ذریعہ سے سلجھا ہی نہیں سکتا۔ اس نکتہ کو اکبر الہ آبادی نے یوں بیان کیا ہے۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

پس تم اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ کرو اور فلسفیانہ طرز پر غور وفکر مت کرو۔ بلکہ اس کی مخلوقات اور مصنوعات یعنی کائنات میں غور کرو۔ اللہ ذکر کے لئے ہے اور کائنات فکر کے لئے ہے۔ اللہ کا ذکر کرو (یعنی ذکر کے تین معنی ہیں (۱) زبان سے ذکر کرنا۔ (۲) دل میں دھیان کرنا (۳) اطاعت کرنا) کائنات میں غور وفکر کرو اور یہی طریقہ تمہیں کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ جس دن سے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کو پسِ پشت ڈالا تو ان کا زوال شروع ہو گیا واضح ہو کہ ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کے فلسفہ میں ان مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔

۱۔ ذات باری تعالیٰ کی حقیقت کیا ہے۔ ؟

۲۔ ذات۔ ماہیت۔ حقیقت اور وجودِ باری تعالیٰ میں کیا فرق ہے؟

۳۔ ذات باری تعالیٰ کا صفات سے کیا علاقہ ہے؟ آیا وہ صفات ذات سے جدا ہیں یا عین ذات ہیں؟

واضح ہو کہ یہ مسائل دراصل ابلیس کے ایجاد کردہ ہیں چنانچہ ارمغان حجاز میں ابلیس اپنے مشیروں کو مشورہ دیتا ہے کہ تم مسلمانوں کو ہر وقت ان مسائل میں الجھائے رکھو۔

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عینِ ذات

۴۔ صفات کل کتنی ہیں؟ ان میں سے اصلی کون سی ہیں؟ اور فروعی کون سی ہیں۔؟

۵۔ صفات اگر غیر ذات ہیں تو خدا مرکب ہو جائے گا اور اگر عین ذات ہیں تو صفات کا وجود کالعدم ہو جائے گا۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو ذات سے پیدا کیا یا صفات کے ذریعہ سے؟ اگر بذریعہ ذات پیدا کیا تو صفات بیکار ہو گئیں اور اگر بذریعہ صفات پیدا کیا تو یہ ذریعہ و واسطہ کس قسم کا ہے؟ واسطہ فی الثبوت ہے یا واسطہ فی الاثبات؟ مسائل تو بہت سے ہیں۔ میں نے نمونتہً چھ مسئلے لکھ دیئے ہیں اور لکھنے سے مقصد یہ ہے کہ کوئی انسان عقل کی مدد سے ان کا جواب نہیں دے سکتا اور اسی لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں غور کرنے سے منع فرمایا تھا چنانچہ دیکھ لیجئے ہم مسلمان ہو کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے سرتابی کر رہے ہیں اور اقوامِ مغرب کافر ہو کر حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کے ارشاد پر عمل کر رہی ہیں۔

آج یورپ اور امریکہ کے علما اور حکما اس مسئلے میں بحث نہیں کر رہے ہیں کہ ذات وصفات باری میں باہمی علاقہ کیا ہے؟ بلکہ فطرت کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کر رہے ہیں یعنی ایٹم بم کے بعد اب ہائیڈروجن بم بنا رہے ہیں۔

واضح ہو کہ اقوام مغرب ذکر تو نہیں کرتیں لیکن فکر ضرور کرتی ہیں اور وائے بر حال ما کہ ہم مسلمان ہو کر نہ ذکر کرتے ہیں نہ فکر۔

سوال یہ ہے کہ ترکی۔ مصر۔ طرابلس۔ مراکو۔ حجاز۔ فلسطین۔ یمن شام۔ لبنان۔ اردن۔ عراق۔ ایران۔ افغانستان۔ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں نے گذشتہ تین سو سال میں کوئی چیز کیوں نہیں ایجاد کی؟ کوئی مشین کیوں نہیں بنائی؟ کوئی جزیرہ کیوں نہیں دریافت کیا؟ کوئی آلہ کیوں نہیں بنایا؟ کوئی عنصر کیوں نہیں دریافت کیا؟ کوئی علمی انکشاف کیوں نہیں کیا؟ کوئی سائنٹیفک تحقیق کیوں نہیں کی؟ الغرض مادّی اعتبار سے تمدن کی ترقی میں کوئی حصّہ کیوں نہیں لیا؟ ان سوالات کا جواب ناظرین پر چھوڑتا ہوں یقیناً وہ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ اگرچہ شروع سے اس دنیا کا طریقہ یہ ہے کہ یہاں کسی حکمراں۔ خاندان یا سلطنت یا کسی فرد کی حکومت کو ثبات نہیں ہے لیکن یہ یقینی بات ہے کہ بادہ (حکومت) اسی قوم کا حق ہے جس کے

نوجوان جدوجہد کرتے ہیں بلکہ سر ہتھیلی پہ رکھ کر میدانِ جنگ میں جا سکتے ہیں[1]۔

ہندی مکتب

اقبال! یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منوّر
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات

---

[1] میکدہ - خاندان - ساقی - حکمراں - مینا - حکومت -

شرح مشکلات اگرچہ اقبال نے یہ نظم ۱۹۳۵ء میں لکھی تھی لیکن ہنوز "یاسی" نہیں ہوئی بلکہ آج کل کے حالات میں تو "سہ آتشہ" ہو گئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ اے اقبال! ہندوستان کے کالجوں کے طلبہ کے سامنے علمِ خودی کا نام مت لے کیونکہ کالجوں کے طلبہ کے لئے یہ درس موزوں ہی نہیں ہے۔

دوسرا شعر:۔ محمولوں (غلاموں) کی نظر سے باز (آزاد قوم) کے احوال اور مقامات پوشیدہ ہی رہیں تو بہتر ہے کیونکہ محکوم قوم کے افراد حکمراں قوم کے جذبات اور تصورات کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔

تیسرا شعر:۔ مثال کے طور پر محکوم اور حاکم کے تصوّرِ زمان میں بھی فرق ہوتا ہے چونکہ محکوم رات دن حاکم کے ظلم و ستم سہتا رہتا ہے اس لئے زندگی کے ماہ و سال اسے بہت طویل معلوم ہوتے ہیں (جس طرح عاشق کو فراق کی رات طویل معلوم ہوتی ہے) اور حاکم چونکہ ہر وقت خوش رہتا ہے اس لئے خوشی کی گھڑیاں اسے بہت مختصر معلوم ہوتی ہیں اسی نکتہ کو کسی ہندی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے۔

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کے گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے

چوتھا شعر:۔ آزاد حکمراں قوم کا ہر لحظہ یا ہر دن اس کے استحکام میں اضافہ کرتا رہتا ہے لیکن محکوم کا ہر لحظہ یا ہر روز اس کے لئے ایک نئی مصیبت لاتا ہے اور اس پر اخلاقی موت طاری کرتا رہتا ہے یعنی دن (زمان) تو ایک

ہی ہے لیکن وہی دن آزاد کے حق میں پیام عبدیت اور وجہ استقامت بن جاتا ہے اور وہی دن محکوم کے حق میں مصائب ناگہانی کا موجب بن جاتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ آزاد کے تصورات اور خیالات حقیقت پسندی کی روشنی سے منوّر ہوتے ہیں یعنی وہ حقائق کی دنیا میں رہتا ہے اور حقائقِ حیات کا مقابلہ کرتا ہے لیکن محکوم کے خیالات اور افکار محض خرافات اور توہّمات کا انبار ہوتے ہیں جنہیں حقیقت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

مثلاً آزاد قوم کے افراد یہ سوچتے ہیں کہ ممکن ہے کہ ہمسایہ ملک ہم پر چڑھائی کر دے کیونکہ اس کا رویہ تین سال سے معاندانہ ہے اس لئے ہمیں رات دن اس کے دفاع کی وفاع کی تیاری میں مشغول رہنا چاہئے لیکن محکوم قوم کے افراد یہ سوچتے ہیں کہ مرتی جیتی دنیا ہے خدا معلوم پار سال زندہ رہیں یا نہ رہیں۔ لاؤ آج رات چار دوستوں کو گھر بلا کر قوالی اور گانا بجانا تو سن لیں۔

چھٹا شعر:۔ محکوم اور حاکم یا غلام اور آزاد میں چوتھا اور سب سے نمایاں فرق یہ ہوتا ہے کہ غلام قوم کے افراد کو ہر وقت پیروں کی کرامات کی دھن لگی رہتی ہے اور اگر کسی زندہ پیر کی کرامات مشاہدہ میں نہیں آتیں تو اولیائے گذشتہ ہی کی کرامات کا تذکرہ کر کے اپنے دل کو خوش کر لیتے ہیں لیکن آزاد قوم کا ہر فرد بجائے خود ایک زندہ کرامات ہے۔

نوٹ:۔ میں نے اس نظم میں آزاد سے آزاد اور حکمراں قوم یا قوم کا فرد مراد لیا ہے۔ لیکن آزاد سے مومن بھی مراد ہو سکتا ہے کیونکہ مسلمان اگر مومن ہو جائے تو وہ غلام نہیں رہ سکتا۔ چونکہ ایمان اور غلامی ایک دوسرے کی

ضد ہیں اس لئے ایک شخص میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں میرے عقیدے کی رو سے مرد مومن کا غلام ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کسی دروازہ کا بیک وقت کھلا بھی ہونا اور بند بھی ہونا! مومن یا آزاد ہوگا یا آزادی کے لئے جدوجہد کرتا ہوگا (خواہ غازی ہو یا شہید) تیسری کوئی صورت از روئے قرآن اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔

اگر تیسری کوئی صورت جائز ہوتی، تو سلطان ٹیپو شہید بھی اس صورت سے استفادہ کر سکتا تھا۔ لیکن افسوس کہ قرآن میں تیسری صورت مذکور نہیں ہے اور اس آیت مبارکہ کی موجودگی میں ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ آپ فرما دیجئے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت یعنی میرا جینا اور مرنا سب اللہ ہی کے لئے ہے یعنی اگر میری زندگی میں کوئی ساعت ایسی آجائے جب میں غیر اللہ کے لئے زندگی بسر کروں یعنی غیر اللہ کی اطاعت کروں تو وہ زندگی کافرانہ زندگی ہو جائے گی۔

ساتواں شعر:۔ اس لئے محکوم کے حق میں درس خودی کے بجائے وہی تعلیم اچھی بلکہ موزوں ہے جو آج کل کالجوں میں دی جا رہی ہے یعنی موسیقی۔ مصوّری اور سائنس وغیرہ۔

تربیت

زندگی کچھ اور شئے ہے، علم ہے کچھ اور شئے
زندگی سوزِ جگر ہے، علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سُراغ
اہلِ دانش عام ہیں، کم یاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

(❖)

شرحِ مشکلات اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ تعلیم اور تربیت میں کیا فرق ہے نیز یہ کہ دونوں میں کیا رشتہ ہے خلاصہ اس نظم کا یہ ہے کہ تربیت کے بغیر محض کتابی علم ناقص ہوتا ہے کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ زندگی یعنی تربیت اور علم دونوں میں بہت فرق ہے۔ علم یہ ہے کہ دماغ روشن ہو جائے اور انسان مختلف علوم سے آگاہ ہو جائے۔ تربیت یہ ہے کہ دل روشن ہو جائے! اور انسان اس طرح زندگی

بسر کرے کہ خلافتِ الٰہیہ کے مقام پر فائز ہو سکے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بہت سے لوگ ایسے گذرے ہیں جو علم کے اعتبار سے بہت بڑے تھے لیکن ان کی زندگی پاکیزہ نہیں تھی اور اللہ کی محبت سے ان کا سینہ بالکل خالی تھا۔ اقبال نے پاکیزہ زندگی کو "سوزِ جگر" سے تعبیر کیا ہے۔

دوسرا شعر:۔ علم سے عالم کو دولت بھی حاصل ہوتی ہے طاقت بھی اور ذہنی مسرت بھی لیکن محض کتابی علم یا ڈگریوں سے کوئی شخص اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا یعنی محض علم سے انسان بوعلی سینا تو بن سکتا ہے لیکن سلطان ابوسعید۔ ابوالخیر نہیں بن سکتا۔

تیسرا شعر:۔ چونکہ اس زمانہ میں اہلِ علم تو عام ہیں لیکن اہلِ معرفت کمیاب ہیں اس لئے کوئی تعجب نہیں۔ اگر قوم کے افراد تقویٰ اور پرہیزگاری اور پاکیزہ زندگی کی نعمت سے محروم ہیں۔

چوتھا شعر:۔ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم سے مسلمان نوجوانوں کے دل میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ گندھک سے بلب روشن نہیں ہو سکتا اس کے لئے تو بجلی کا کرنٹ درکار ہے اور یہ کرنٹ مرشد کامل کی صحبت سے حاصل ہو سکتا ہے۔

(❖)

خوب و زشت

ستارگانِ فضا ہائے نیلگوں کی طرح
تخیّلات بھی ہیں تابعِ طلوع و غروب
جہاں خودی کا بھی ہے صاحبِ فراز و نشیب
یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے ناخوب
نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا، قبیح و نامحبوب

(۵)

شرح مشکلات اس مختصر نظم میں اقبال نے ہمیں حسن و قبح کا معیار بتایا ہے یعنی دنیا میں اچھائی اور برائی کی کسوٹی کیا ہے علامہ نے ایک دفعہ مجھ سے دورانِ گفتگو میں کہا تھا کہ :-

(Pleasurability is the criterion of value)

یعنی انسانی شخصیت حسن و قبح کا معیار ہے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:- جس طرح نیلگوں آسماں کے ستارے کبھی طلوع ہوتے ہیں کبھی غروب ہوتے ہیں اسی طرح انسانی تخیلات بھی طلوع و غروب کے تابع ہوتے ہیں کبھی بعض خیالات دماغوں پر مسلّط ہوتے ہیں اور عوام ان کی اتباع

کرتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دنیا ان کو بالائے طاق رکھ دیتی ہے اور دوسرے تصوّرات کو سندِ قبول عطا کر دیتی ہے۔

دوسرا شعر:۔ اسی طرح خودی کی دنیا میں نشیب و فراز پایا جاتا ہے یعنی یہاں بھی اچھائی اور برائی میں ایک جنگ برپا رہتی ہے اور لوگ اپنے اپنے خیال کے مطابق اچھائی اور برائی کا معیار پیش کرتے رہتے ہیں اور کبھی ایک خاص معیار طلوع ہوتا ہے یعنی لوگوں میں مقبول ہوتا ہے اور کبھی وہی معیار غروب ہو جاتا ہے یعنی دنیا اسے ترک کر دیتی ہے۔

تیسرا شعر:۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ جمیل (اچھائی) وہ ہے جو خودی کی بلندی سے ظاہر ہو یعنی حسن یا خوبی و اچھائی وہ ہے جو اس شخص سے صادر ہو جس کی خودی بلند مقام پر فائز ہے بلکہ مرتبۂ کمال کو پہنچ چکی ہے۔ اور برائی وہ ہے جو اس شخص سے ظاہر ہو جس کی خودی ناقص ہے بالفاظ دیگر مردِ مومن کی زندگی معیارِ حسن و قبح ہے یعنی مومن جو کام کرے وہ اچھا ہے اور کافر جو کام کرے وہ برا ہے۔

مرگِ خودی

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام

(٭)

شرح مشکلات

اس نظم میں علامہ اقبال نے ہم کو خودی کی موت کے نتائج سے آگاہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ خودی کی موت یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا نتیجہ مختلف قوموں میں مختلف صورتوں میں برآمد ہوتا ہے مثلاً یورپ (مغربی اقوام) نے مادیات میں تو کافی ترقی کر لی ہے لیکن ان کا اندرون بے نور ہے یعنی ان میں روحانیت کا فقدان ہے اس کے برعکس مشرقی اقوام میں روحانیت تو پائی جاتی

ہے لیکن وہ مادّی اعتبار سے جذام میں مبتلا ہیں یعنی غیروں کی محکوم ہیں۔

دوسرا شعر:۔ عرقی اقوام میں ترقی اور سربلندی کا جذبہ مفقود ہے عجمی اقوام مثلاً ایران اور افغانستان وغیرہ مفلوج انسانوں کی طرح زندگی بسر کر رہی ہیں ان میں دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

تیسرا شعر:۔ اب رہے ہندی مسلمان تو خودی کی موت سے وہ بھی بالکل بے دست و پا ہو گئے ہیں جیسے کسی پرندے کے تمام پر نوچ دیئے جائیں اسی لئے وہ آزادی سے محروم ہیں اور غلامی (قفس) کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

چوتھا شعر:۔ مسلمانوں کے اکثر مذہبی پیشوا۔ اسی خودی کی موت سے قوم فروشی پر مجبور رہیں۔ الغرض دنیا میں جو کچھ ابتری اور بدنظمی نظر آ رہی ہے اور مختلف قومیں جن عوارض میں مبتلا ہیں ان کا اصلی سبب یہ ہے کہ بنی آدم اس طریق سے برگشتہ ہو چکے ہیں جس پر چل کر انسان اپنی خودی کو زندہ کر سکتا ہے اور وہ راستہ اطاعتِ احکامِ الٰہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

(❁)

مہمانِ عزیز

پُر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز
چاہیئے خانۂ دل کی کوئی منزل خالی
شاید آ جائے کہیں سے کوئی مہمانِ عزیز

(٭)

شرح مشکلات

یہ نظم یوں تو صرف دو شعر کی ہے۔ لیکن اقبال نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ مغربی تعلیم نے مسلمانوں کے دل و دماغ کو بیشمار علمی مسائل سے معمور کر دیا ہے اور ان کی نوعیت ایسی ہے کہ اب مسلمانوں کے اندر نیکی اور بدی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی ہے۔

دوسرا شعر:۔ اسی لئے میں انہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ شوق سے منطق فلسفہ اور دیگر علوم پڑھیں لیکن اپنے دل کا ایک گوشہ ضرور خالی رکھیں شاید کبھی ان کو کسی مرشد کامل یا مرد مومن کی صحبت نصیب ہو جائے تو وہ کوئی اسلامی نکتہ ان کو بتا کر ان کی زندگی سنوار دے گا لیکن اگر خانۂ دل میں کوئی کمرہ بھی خالی نہ ملا تو وہ مہمان عزیز یعنی پاکیزہ خیال کہاں قیام کرے گا۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ شوق سے یہ غیر اسلامی تعلیم حاصل کرو اس آزادی کے زمانہ میں تمہیں کون روک سکتا ہے لیکن کبھی کبھی اللہ سے بھی دعا کر لیا کرو۔ شاید وہ اپنے فضل سے کوئی انقلاب تمہارے اندر پیدا کر دے۔ لیکن اگر تم نے بالکل ہی تعلق ختم کر دیا تو فضل الٰہی یعنی مہمان عزیز کی پھر کوئی توقع نہیں ہے۔

عصرِ حاضر

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

شرح مشکلات

اقبال نے اس نظم میں موجودہ غیر اسلامی نظام و نصابِ تعلیم پر تنقید کی ہے اور یہ ان نظموں میں سے ہے جس کو

میں نے سیکڑوں مرتبہ پڑھا ہے اور مہینوں ان پر غور کیا ہے اس لئے میں ناظرین سے درخواست کروں گا کہ وہ بھی اس نظم کو بہت غور سے پڑھیں اور عقل سے سمجھیں۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ یورپ نے جو نظام و نصاب تعلیم معین کیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ افکار میں پختگی پیدا نہیں ہو سکتی اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ہندوستان سے ہر سال بہت سے طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ جاتے ہیں اور علم کے کسی ایک شعبہ پر کئی کئی سال صرف کرتے ہیں لیکن ان کا علم سطحی معلومات سے آگے نہیں بڑھتا۔ مثلاً وہ تو یہ بتا سکتے ہیں کہ ابن سینا کی اشارات کا قدیم ترین قلمی نسخہ کس کتب خانہ میں ہے اور کس سنہ میں لکھا گیا تھا اور اس کے اوراق کی تعداد کتنی ہے لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ اس کتاب میں کیا لکھا ہے بلکہ اکثر پی ایچ ڈی تو اس کتاب کی عبارت بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔

دوسرا شعر:۔ اگرچہ کالجوں کی تعلیم سے عقل انسانی اوہام باطلہ کی قیود سے تو ضرور آزاد ہو جاتی ہے مثلاً کالج کا تعلیم یافتہ یہ بات ہرگز تسلیم نہیں کرے گا کہ یہ زمین گائے کے سینگوں پر قائم ہے یا اٹیلس (Atlas) اسے اپنے کاندھے پر اٹھائے ہوئے ہے لیکن کالج کی تعلیم سے خیالات میں ربط اور ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ آپ کسی کالج کے گریجویٹ سے تبادلۂ خیالات کریں تو معلوم ہو جائیگا کہ عموماً ان تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ حال ہے کہ اول تو یہ لوگ زندگی کے مسائل

میں کوئی ذاتی رائے رکھتے ہی نہیں اور اگر کسی مسئلہ پر گفتگو بھی کریں گے تو وہ نوّے فیصدی غیر مربوط ہوگی۔

مثلاً آپ نے تقسیم ہند سے پہلے "نیشنلسٹ مسلمان" اور تقسیم کے بعد اسلامی سوشلزم کی ترکیب لوگوں کی زبان سے ضرور سنی ہوگی یا کم از کم اخباروں میں تو ضرور ہی پڑھی ہوگی۔

تقسیم سے پہلے دورانِ گفتگو میں مثلاً زید نے کہا کہ میں نیشنلسٹ مسلمان ہوں اور اس پر فخر کرتا ہوں۔ اب آپ سوچیں کہ اگر قائل کے خیالات میں ربط ہوتا تو کیا وہ اس قسم کا کلمہ زبان سے ادا کر سکتا تھا؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ نیشنلزم اپنے تضمنات (Connotations) کے اعتبار سے اسلام کی ضد ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے نیشنلزم کی تعلیم یہ ہے کہ قومیت کی بنیاد وطن پر ہے۔ پس جو شخص نیشنلسٹ ہے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا اس کے باوجود میں نے بہت سے مسلمانوں کو اپنے کانوں سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نیشنلسٹ مسلمان ہوں۔

یہ حال اسلامی سوشلزم کا ہے اسلام سوشلزم کی ضد ہے اور یقیناً دو ضدین ایک جگہ ایک وقت میں ایک حیثیت سے جمع نہیں ہو سکتیں لہٰذا اسلامی سوشلزم کی ترکیب بھی اجتماع ضدین کی مصداق ہے اور اس لئے محال ہے اس کے باوجود یہ ترکیب لوگوں کی زبان پر آجاتی ہے۔

یہ باتیں دلیل ہیں اس امر کی کہ کالجوں کی تعلیم سے عقل تو آزاد ہو جاتی

ہے لیکن خیالات میں ربط و نظم پیدا نہیں ہوتا اگر کالج کی تعلیم سے انسان عالم ہو جاتا تو علیگڈھ کالج سے پچھتر سال میں ۷۵ نہ سہی ۲۵ علما تو ضرور پیدا ہوتے۔

تیسرا شعر:۔ انسان کی خودی اس وقت مرتبۂ کمال کو پہنچتی ہے جب وہ اپنی دونوں قوتوں کی (یعنی عشق اور عقل) پہلو بہ پہلو صحیح طریق پر تربیت کرے لیکن آج دنیا کی حالت یہ ہے کہ

(ا ۔ مغربی اقوام کے افکار و خیالات لادینی اور مادّہ پرستی پر مبنی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی قوتِ عشق مردہ ہو گئی ہے۔ واضح ہو کہ عشق سے مراد اللہ کی محبت ہے اور جب اللہ پر ایمان ہی نہیں تو اس سے محبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ مغربی اقوام نے تو اللہ کی جگہ وطن کو اپنا معبود بنا لیا ہے چنانچہ ان کی زندگیاں انسانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے وقف ہو چکی ہیں اور وطن کو معبود بنانے کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔

(ب ۔ مشرقی قومیں بے ربطی افکار کے مرض میں مبتلا ہیں یعنی انہوں نے صحیح طریق پر غور و فکر کرنا چھوڑ دیا ہے جس کی بنا پر ان کے خیالات میں بے ربطی پیدا ہو گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ذہنی غلامی میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ ذہنی غلامی سے مراد یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں یورپ کی کورانہ تقلید کر رہی ہیں۔ مصر۔ شام۔ ترکی۔ عراق۔ ایران۔ پاکستان ہندوستان اور دوسرے ملک سب اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ یہ داستان بہت طویل اور بڑی دردناک ہے اور اس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے

یوں کہنے کو تو ترکی ایک آزاد ملک ہے لیکن غور سے دیکھو تو ترک ذہنی اعتبار سے مغرب کے غلام ہیں اسلامی قانون کے بجائے مغربی ضابطۂ قانون اختیار کر لیا۔ الف۔ ب۔ ت کے بجائے اے۔ بی۔ سی۔ ڈی اختیار کر لی۔ غرضکہ تمدّن۔ تہذیب اور معاشرت ہر لحاظ سے یورپ کی نقالی کی جا رہی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مغرب میں لادینیٔ افکار کی وجہ سے عشق مردہ ہو گیا ہے مشرق میں بے ربطیٔ افکار کے سبب سے عقل مردہ ہو گئی ہے اور خودی کی زندگی ان دونوں کی زندگی پر موقوف ہے اس لئے نہ مغربی اقوام کی خودی زندہ ہے نہ مشرقی اقوام کی بالفاظ دیگر آج ساری دنیا انسانیت اور اخلاق کے لحاظ سے مردہ ہو چکی ہے اسی خیال کو اقبال نے دوسری جگہ اس طرح پیش کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس شعر کی اس سے بہتر شرح ہو بھی نہیں سکتی۔

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

طالب علم

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

شرح مشکلات

اس مختصر نظم میں اقبالؔ نے مسلمان طالب علم کو ایسا نکتہ سمجھایا ہے جس پر عمل کرنے سے قوم کی زندگی میں انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ تیرے دل میں صحیح طریق پر دنیا میں ترقی اور سربلندی حاصل کرنے کی کوئی امنگ پیدا نہیں ہوتی اس لئے میں دعا کرتا ہوں کہ خدا اپنی مہربانی سے تیرے دل میں تڑپ پیدا کردے یعنی دنیا میں اسلام کو سربلند کرنے کا جذبہ۔

واضح ہو کہ اقبال کی رائے میں مسلمان کی ترقی اور سربلندی اسلام کی ترقی اور سربلندی پر موقوف ہے کیونکہ اس کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ دنیا میں اسلام کو سربلند کرے اور جس مسلمان کے دل میں یہ تڑپ نہ ہو

وہ اور سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن مسلمان نہیں ہو سکتا۔

دوسرا شعر:۔ تو ساری عمر یونہی کتابیں پڑھتا رہے گا لیکن کتابوں سے تیری زندگی کا مقصد کبھی تجھ پر واضح نہیں ہو سکے گا کیونکہ تو کتاب خواں تو ہے لیکن "صاحب کتاب" نہیں ہے۔

اس شعر میں "صاحب کتاب" اس نظم کی جان ہے صاحب کتاب اصلاح میں اس شخص کو کہتے ہیں جس پر اللہ کی طرف سے کوئی کتاب نازل ہو۔ یہاں اس کے مجازی معنی مراد لئے گئے ہیں یعنی ایسا شخص جس نے اپنے دل کو پاک و صاف کر لیا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس پر فیضان سماوی نازل فرمائے اور یہ نعمت اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب مسلمان اللہ سے رابطۂ قلبی پیدا کرے۔

مطلب یہ ہے کہ اے مسلمان نوجوان! اگر تو حقیقی علم کا طالب ہے تو اپنے دل کو اللہ کی محبت سے منور کر لے اور یہ نعمت اہل اللہ کی صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا ہے وہ اس امر میں مجھ سے متفق ہوں گے کہ لوٹ پھیر کر اقبال نے ایک ہی بات مختلف طریقوں سے کہی ہے اور وہ یہ ہے کہ دماغ کے ساتھ دل کو بھی منور کرو۔ محض علم جب تک اس کے ساتھ عشق بھی کارفرما نہ ہو۔ مسلمان کو مسلمان نہیں بنا سکتا اسی خیال کو اقبال نے بال جبریل میں یوں بیان کیا ہے۔

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

امتحان

کہا پہاڑ کی ندّی نے سنگ ریزے سے
فتادگی و سرافگندگی تری معراج
ترا یہ حال کہ پامال و دردمند ہے تو
مری یہ شان کہ دریا بھی ہے مرا محتاج
جہاں میں تو کسی دیوار سے نہ ٹکرایا
کسے خبر کہ تو ہے سنگِ خارہ یا کہ زجاج

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا کو اپنے ذاتی کمالات کا معترف بنانا چاہتا ہے یا اپنی خودی کی قوتوں کا اظہار کرنا چاہتا ہے تو اسے دیوار سے ٹکرانا لازمی ہے یعنی اُسے مشکلات اور آفات کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور اس کے لئے مناسب تیاری شرط اولین ہے دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ قوت کے سامنے جھکتی ہے خود اقبال ہی نے لکھا ہے۔

ع کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

اسی لئے اقبالؔ مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ اپنے اندر قوت پیدا کرو کیونکہ

دیوار سے وہی شخص ٹکرا سکتا ہے جس میں قوت ہو۔

پہلا شعر:۔ پہاڑ کی ندی نے ایک دن سنگریزے سے کہا کہ مجھے تیری حالت پر افسوس آتا ہے کیونکہ تیری زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تو زمین پر پڑا رہے اور اسی حالت میں فرسودہ ہو کر فنا ہو جائے۔

دوسرا شعر:۔ مجھے دیکھ! میں کہنے کو تو چھوٹی سی ندی ہوں لیکن میری قوت کا یہ عالم ہے کہ میں پہاڑوں سے ٹکراتی ہوں اور اپنی ضربوں سے چٹانوں کو توڑ دیتی ہوں اور آگے بڑھنے کے لئے اپنا راستہ بناتی ہوں یہی تو وجہ ہے کہ دریا بلکہ سمندر بھی میرے محتاج ہیں۔

تیسرا شعر:۔ مجھے تیری حالت پر افسوس اس لئے آتا ہے کہ اگرچہ تو اپنی ذات کے لحاظ سے سنگ خارہ ہے لیکن تو عدم تشدد کا پجاری بن گیا ہے یعنی کسی دیوار سے نہیں ٹکراتا۔ خاموش سر جھکائے زمین میں پڑا رہتا ہے۔ اس لئے دنیا تیری ذاتی خوبی سے نہ واقف ہے نہ واقف ہو سکتی ہے یا اگر دنیا تجھے کاہیخ سمجھے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ کیا تو نے کبھی کسی دیوار سے متصادم ہو کر اپنی حقیقت کا اظہار کیا۔ اندریں صورت۔

ع کسے خبر کہ تو ہے سنگ خارہ یا کہ زجاج

مدرسہ

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بے گانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفّاش
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

—(❊)—

شرحِ مشکلات اس نظم میں اقبال نے کالج کے نوجوانوں سے براہ راست خطاب کیا ہے اور جو کچھ ان کے ضمیر کی گہرائیوں میں پوشیدہ تھا سب بے کم و کاشت ان کے سامنے رکھ دیا ہے جب میں یہ نظم پڑھتا ہوں تو بے اختیار داغ کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے۔

قطرۂ خونِ جگر سے کی تواضع عشق کی
سامنے مہمان کے جو تھا میسّر رکھ دیا

پہلا شعر:- کہتے ہیں کہ اے نوجوان! فرنگی بدفرجام نے. جو نظام یہاں قائم کیا ہے بلکہ تجھ پر مسلط کیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تو دن رات فکرِ معاش میں مبتلا رہے اور تیرا ملک آئے دن قحط کی برکات سے بہرہ اندوز ہوتا رہے چنانچہ اس نے اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لئے ۱۹۴۲ء میں بنگال کے ۵ کروڑ انسانوں کو قحط کی مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا

الغرض اس فکرِ معاش کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیری روح فنا ہو گئی تو روٹی کی تلاش میں اس قدر سرگردان ہے کہ کوئی بلند جذبہ تیرے اندر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

دوسرا شعر:- مفلسی نے تجھے بزدل بنا دیا ہے تو ہر وقت ڈرتا رہتا ہے کہ اگر میں نے ذرا اپنے طرزِ عمل سے اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا تو افسرانِ بالا ناخوش ہو جائیں گے اور میری سروس خطرہ میں پڑ جائیگی سچ یہ ہے کہ جب زندگی ذوقِ خراش کھو دیتی ہے یعنی جب انسان تکالیف اور مصائب برداشت کرنے سے ڈرنے لگتا ہے تو زندگی موت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انسان غلطی سے اپنے آپ کو زندہ سمجھتا ہے دراصل وہ مر چکتا ہے۔

تیسرا شعر:- اے مسلمان نوجوان! تجھے "جنون" کی صفت تو مسلمان گھر میں پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ورثہ میں ملی تھی اور وہ کیا جنون

تھا؟ وہ ایسا تھا کہ دین اسلام کی سربلندی کے لئے تیرے اسلاف کو ہر وقت سربکف رکھتا تھا وہ بات بات میں سر سے کفن باندھ لیتے تھے سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی عزّت کے لئے ہر وقت سر کٹانے کو تیار رہتے تھے۔ اور یہ سب اسی جنون ذوق کا ثمرہ تھا لیکن افسوس کہ انگریزوں کے قائم کردہ کالجوں اور ان میں مروجہ نصابِ تعلیم نے جو سرتاپا لادینی اور شکم پرستی پر مبنی ہے۔ تجھے اس جنون سے بیگانہ کر دیا۔

واضح ہو کہ پس اب جبکہ مُلک آزاد ہو گیا ہے ہمیں اس نظام اور نصاب تعلیم کو یکسر اپنی اجتماعی زندگی سے خارج کر دینا چاہیئے۔

چوتھا شعر:۔ اے مسلمان نوجوان! اللہ نے تجھے دیدۂ شاہین عطا فرمایا تھا لیکن انگریزوں نے تجھے اپنا غلام بنا کر تیرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ "دیدۂ شاہین" تو تجھ سے چھین لیا اور اس کی جگہ چمگادڑ کی آنکھیں تجھے دیدیں تاکہ تو آفتاب کی روشنی کو دیکھ ہی نہ سکے۔

پس اے نوجوان! تو سب کام چھوڑ کر انگریز سے مقابلہ کی قوت اپنے اندر پیدا کر۔ تاکہ تو اپنی اصلی آنکھیں اس دشمنِ ملّت سے واپس لے سکے یاد رکھ جب تک تو اپنی اصلی آنکھیں واپس نہیں لے گا تیری زندگی بالکل بیکار ہے بلکہ اس پر زندگی کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھ مسلمان بننے کے لئے دیدۂ شاہین شرط اولیں ہے۔ اس لئے اگر یہ نعمت تجھے حاصل نہ ہوئی تو تیرا عدم و وجود دونوں برابر ہیں۔ پس اپنے حقیقی دشمن کو پہچان اور مقابلہ کی تیاری کر۔

پانچواں شعر:- اگر تو میرے پیغام انقلاب پر عمل کرنے کے لئے آمادہ ہے تو میں بڑی خوشی سے تجھے مطلع کرتا ہوں کہ کالج کی تعلیم نے جن حقائق و معارف کو تیری نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا ہے وہ ان بزرگوں کی صحبت سے بہت دور اس ناپاک ماحول سے بہت دور جنگلوں میں اور بیابانوں میں معمولی جھونپڑوں میں رہتے ہیں اور بوریئے پر بیٹھ کر تخت نشینوں کی نیندیں حرام کر دیتے ہیں پس اے مسلمان نوجوان تو ان اللہ والوں کی صحبت اختیار کر تاکہ تجھ میں کفار کے مقابلہ کی طاقت پیدا ہو سکے۔

حکیم نطشہ

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم
نگاہ چاہیئے اسرارِ لَآ اِلٰہ کے لئے
خارنگِ سینۂ گردوں ہے اس کا فکرِ بلند
کمند اس کا تخیّل ہے مہر و مہ کے لئے
اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی
ترس رہی ہے مگر لذّتِ گنہ کے لئے

شرح مشکلات

تمہید:۔ علامہ اقبال نے اس مشہور جرمن فلسفی کے فلسفیانہ افکار پر اپنی تصانیف میں کئی جگہ مختلف پہلوؤں سے تبصرہ کیا ہے اور اگرچہ انہوں نے اس کے بعض بنیادی تصورات پر سخت نکتہ چینی کی ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ انہیں اس کے ساتھ ایک خاص قسم کی دلچسپی ضرور تھی۔

نکتہ چینی تو اس لئے کی کہ ان کے اور نطشہ (Nietzsche) کے بنیادی نقطۂ نظر میں بعد المشرقین ہے یعنی اقبال اللہ کی ہستی کے معترف ہیں اور نطشہ اللہ تو بڑی چیز ہے۔ خدا کی ہستی کا بھی منکر ہے[1]۔ اور دلچسپی اس لئے ہے کہ اس کے بعض اخلاقی تصورات قرآنی تعلیمات سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اور دلچسپی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ نطشہ انسان میں اعلیٰ قسم کی صفات دیکھنے کا آرزومند ہے اس لئے وہ "فرد" کو فوق البشر (Superman) بننے کی تلقین کرتا ہے اگرچہ اقبال کا فوق البشر یعنی مرد مومن اپنی صفات کے لحاظ سے نطشہ کے فوق البشر سے مختلف ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ دونوں فرد کی مخفی قوتوں کو ابھارنا چاہتے ہیں۔

---

[1] اگر ایک شخص یہ تسلیم کرے کہ بیشک اس دنیا کا بنانے والا کوئی ہے تو فلسفہ کی اصطلاح میں وہ خدا کی ہستی کا معترف ہو گیا لیکن جب تک وہ اس خدا کی ذات و صفات پر قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق ایمان نہ لائے از روئے شرع وہ اللہ کی ہستی کا معترف نہیں ہے۔

اسی لئے اقبالؔ نے اپنی کتابوں میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر نطشہ کو کسی مردِ مومن یا مرشد کامل کی صحبت نصیب ہو جاتی تو وہ مسلمان ہو جاتا چنانچہ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں۔

کاش بودے در زمانِ احمدے
تا رسیدے بر سرِ در سرمدے

کاش نطشہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے زمانہ میں پیدا ہوا ہوتا تو ان کے فیضِ صحبت سے دولت سرمدی حاصل کر لیتا یعنی مسلمان ہو جاتا۔ اسی طرح بال جبریل میں لکھتے ہیں۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانہ میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

پیامِ مشرق میں بھی چار شعروں کی نظم اس کے متعلق لکھی ہے جس میں یہ شعر قابلِ غور ہے۔

آنکہ بر طرحِ حرم بت خانہ ساخت
قلب او مومن دماغش کافر است

یعنی اگرچہ اس نے بت خانہ تعمیر کیا۔ لیکن اس کی تعمیر کا انداز حرم کی تعمیر سے مشابہ ہے یعنی اس کا فلسفہ اگرچہ ملحدانہ ہے لیکن اس میں کہیں کہیں اسلام کا رنگ بھی نظر آتا ہے اس شعر کے آخری مصرع میں اقبال نے اس کے ساتھ اپنی دلچسپی کی وجہ بھی بیان کر دی ہے یعنی اس کے اندر اسلامی حقائق قبول کرنے کی صلاحیت موجود تھی لیکن جیسا کہ اقبال نے بال جبریل میں حاشیہ میں لکھا ہے کہ

"وہ اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کرسکا اس لئے اس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستہ پہ ڈال دیا۔" اس مختصر تمہید کے بعد اب میں اشعار کا مطلب لکھتا ہوں۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ نطشہ توحید الٰہی کا اعتراف اس لئے نہ کرسکا کہ اس کے اسرار کو سمجھنے کے لئے جس انداز فکر کی ضرورت ہے وہ اس میں پیدا نہ ہوسکا اگر اسے کوئی اللہ والا مل جاتا تو اس کا قلبی رجحان اسے مُوحّد اور خدا پرست بنا سکتا تھا۔

دوسرا شعر:۔ ذہنی اعتبار سے اس کا درجہ حکمائے مغرب میں بہت بلند ہے چنانچہ اس کے افکار نے مسیحی دنیا میں زلزلہ برپا کردیا تھا۔

واضح ہو کہ میری رائے میں حکیم فرفریوس (۲۳۲ء تا ۳۰۴ء) کے بعد (جس کی وفات ۳۰۴ء میں ہوئی۔ نطشہ دوسرا فلسفی ہے جس نے انیسویں صدی میں مسیحیت پر اس قدر شدید نکتہ چینی کی۔ چنانچہ اس نے اپنی تصنیف اینٹی کرائیسٹ (۱۸۸۸ء) میں بدلائل عقلیہ یہ بات ثابت کی ہے کہ مسیحی فلسفۂ اخلاق سے بڑھ کر کوئی فلسفہ بنی آدم کے حق میں مضر نہیں ہے۔

تیسرا شعر:۔ لیکن اس رفعت تخیل کے باوجود چونکہ اسے توحید کی نعمت نصیب نہ ہوسکی اس لئے اس کے فلسفۂ اخلاق میں وہ پاکیزگی وہ خوبی پیدا نہ ہوسکی کہ وہ اس ضابطہ پر عمل پیرا ہوکر گناہ کی طرف میلان یا نفسانی خواہشات پہ غالب آسکتا یعنی اس کا فلسفۂ اخلاق اس کی پاکیزگی طبع کے باوجود انسانوں کو متقی اور خدا ترس نہیں بنا سکتا۔

اساتذہ

مقصد ہو اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

—(❁)—

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ہندوستانی کالجوں کے استادوں کی ذہنیت پر تبصرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو لوگ خود گم کردہ راہ ہوں وہ دوسروں کی ہرگز رہنمائی نہیں کر سکتے ہیں چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ :-

پہلا شعر :- اگر آفتاب اپنے مستقر سے منحرف ہو جائے تو پھر اس کی شعاعوں میں یہ تاثیر باقی نہیں رہ سکتی کہ وہ معدن میں لعل و گوہر کی تربیت کر سکیں اسی طرح اگر کوئی شخص طلبہ کی صحیح تربیت کا آرزومند ہو تو اُسے لازم ہے کہ وہ ان کو ایسے اساتذہ کے سپرد کرے

جو تربیت کے اہل ہوں یعنی اسلام سے منحرف نہ ہوں۔

دوسرا شعر:۔ آج یہ حالت ہے کہ ساری دنیا تلاشِ حق سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ تحقیق و اجتہاد کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اندریں حالات بھلا ہندی کالجوں کے اساتذہ طلبہ کی ذہنی تربیت کیا کر سکتے ہیں

تیسرا شعر:۔ آج کیفیت یہ ہے کہ جو لوگ (قرآن و حدیث کے نور سے منوّر ہو کر) اپنے زمانہ کے امام بن سکتے تھے وہ روایات کے پھندوں میں گرفتار ہیں اور خود اپنے زمانہ (یعنی عصرِ حاضر کے اوہام) کے پیرو اور مقلد ہیں پس ایسے لوگ قوم کی کیا رہنمائی کر سکتے ہیں۔

غزل

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سُراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

میسّر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حُر کے لئے جہاں میں فراغ

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے مجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ مَازَاغ

وہ بزمِ عیش ہے مہمانِ یک نفس دو نفس
چمک رہے ہیں مثالِ ستارہ جس کے ایاغ

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گُل کا سراغ

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے بعض حقائق و معارف دلکش انداز میں بیان کئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ وہی شخص اپنی زندگی کے مقصد سے واقف ہو سکتا ہے جس کا دل اتباعِ شریعت سے منوّر ہو چکا ہو۔

دوسرا شعر:۔ بندۂ مومن اس دنیا میں ہر وقت قربِ الٰہی کے حصول کی خاطر جدّ و جہد کرتا ہے اس لئے اسے جیتے جی کبھی فرصت (لمحہ و لمحات) نصیب نہیں ہو سکتی۔ ہاں غلاموں کو چونکہ جہاد فی سبیل اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لئے وہ ساری زندگی فرصت کا لطف اٹھاتے رہتے ہیں چنانچہ ان کی زندگی پر ایک نظر ڈالنے سے اس شعر کی صداقت آشکارا ہو سکتی ہے۔ وہ تاش کھیلتے ہیں۔ گھوڑ دوڑ میں جاتے ہیں۔ کلب میں جاتے ہیں۔ سینما دیکھتے ہیں۔ تفریح کرتے ہیں لیکن پھر بھی ان کا وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ مجبوراً وہ داستان گو نوکر رکھتے ہیں تاکہ ان کی فرصت کے اوقات کسی طرح بسر تو ہو سکیں۔

تیسرا شعر:۔ اے مسلمان! تو اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے مغربی قوموں کے مادی عروج کو للچائی ہوئی نظر سے دیکھ رہا ہے اس لئے میں دعا کرتا

ہوں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تیری نظر کی نگہبانی فرمائیں یعنی تجھے گمراہ ہونے سے محفوظ رکھیں۔

"صاحب ماذاغ" میں قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ نے آپ کی نگاہ کی بابیں الفاظ توصیف فرمائی ہے۔ مَاذَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی۔ نہ تو آپ کی نگاہ بہکی نہ حد سے آگے بڑھی۔

چوتھا شعر:۔ اے مسلمان! تو کفار کی عیش و طرب کی محفلوں سے مرعوب نہ ہو جانا اس قسم کی محفلوں کو کبھی ثبات و دوام نصیب نہیں ہوا اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے یہ بلوریں جام جن کی خوبصورتی ستاروں کو شرماتی ہے سب فریبِ نظر ہیں۔ کوئی دن جاتا ہے کہ یہ محفلیں درہم برہم ہو جائیں گی۔

پانچواں شعر:۔ مجھے تو یہ افسوس ہے کہ تو کتابوں میں اس قدر مشغول رہتا ہے کہ کبھی کائنات خلقت پر غور ہی نہیں کرتا۔ فطرت کے مظاہر زبان حال سے صانع فطرت کے وجود پر گواہی دے رہی ہیں لیکن تو اس قدر کور ذوق ہو گیا ہے کہ کبھی ان خلائق کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتا۔ اکبر الہ آبادی نے بھی اس مضمون کو اپنے مخصوص انداز میں نظم کیا ہے صرف ایک شعر اس جگہ لکھتا ہوں۔

صاف آئے گی نظر صانع عالم کی جھلک
سامنے کچھ نہ رکھ آئینۂ فطرت کے سوا

دین و تعلیم

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص تو دعویٰ نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے دین اور تعلیم سے متعلق بعض حقائق بیان کئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان پر غور کرنے سے حکیم مشرق کی ژرف نگاہی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ۔

پہلا شعر:۔ میں موجودہ زمانہ کے علماء اور ملّا سے بخوبی واقف ہوں وہ کتابی علم تو رکھتے ہیں لیکن (اِلّا مَاشَاءَ اللہ) نظر

یعنی روحانی طاقت سے محروم ہیں یہ دولت تو صرف اخلاص یعنی عشقِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہو سکتی ہے۔

دوسرا شعر:۔ اب رہا یہ نصاریٰ کا قائم کردہ نظام تعلیم اور انہی کا مقرر کردہ نصاب تعلیم یہ دراصل تعلیم نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کو دین اور آدمیت دونوں سے برگشتہ کر دینے کی ایک سازش ہے اور افسوس کہ مسلمان اس سازش کا شکار ہو گئے یعنی وہ زہر کو تریاق سمجھ رہے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ جو قوم اپنی انفرادی اور اجتماعی خودی کے فطری تقاضوں کی تکمیل کا انتظام نہیں کرتی یعنی اپنی خودی کی تربیت نہیں کرتی وہ کبھی اس دنیا میں سربلندی اور حکومت حاصل نہیں کر سکتی بلکہ وہ ہمیشہ دوسری طاقتور قوموں کی غلام رہے گی فطرت کا قانون یہ ہے کہ حکومت اُسے ملتی ہے جس کے اخلاق بہتر ہوں۔

چوتھا شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے عمرانیات اور تمدّن کا ایک زبردست نکتہ بیان کیا ہے۔ کاش مسلمان اس پر کما حقہ غور کر لیں! کہتے ہیں کہ فطرت کے قوانین یا اس کے طریقِ کار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ افراد کے تصور تو کبھی کبھی معاف کر دیتی ہے لیکن ملّت کا قصور معاف نہیں کرتی یعنی فرض کرو کہ ایک حکمراں قوم ہے اس کے بعض افراد کبھی کبھی کسی گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں تو فطرت ان کے گناہوں سے اغماض یا چشم پوشی کر لیتی ہے لیکن اگر پوری قوم گناہ میں مبتلا ہو جائے (گناہ سے مراد ہے اللہ کے احکام کی نافرمانی یا قوانین فطرت کی خلاف ورزی ہے تو فطرت اس قوم کو کبھی معاف نہیں کرتی چنانچہ اس قول کی

صداقت تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے بخوبی واضح ہو سکتی ہے۔

جاوید سے

۱

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ
ہے اس کی نہاد کافرانہ

دربارِ شہنشہی سے خوشتر
مردانِ خدا کا آستانہ

لیکن یہ دورِ ساحری ہے
انداز ہیں سب کے جادوانہ

سرچشمۂ زندگی ہوا خشک
باقی ہے کہاں مے شبانہ

خالی ان سے ہوا دبستان
تھی جن کی نگاہ تازیانہ

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو
ہے اس کا مذاق عارفانہ

جوہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ

شاخِ گل پر چہک ولیکن
کر اپنی خودی میں آشیانہ

وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا
ہر قطرہ ہے بحرِ بیکرانہ

وہقان اگر نہ ہو تن آساں
ہر دانہ ہے صد ہزار دانہ

"غافل منشیں نہ وقتِ بازی ست
وقتِ ہنر است و کارسازی ست"

شرح مشکلات اس عنوان کے تحت علامہ مرحوم نے تین دلکش نظمیں لکھی ہیں جن میں اپنے دوسرے بیٹے جاوید اقبال سے خطاب کیا ہے اور اس کے پردے میں ملت اسلامیہ کے نوجوانوں کو بیش قیمت نصائح فرمائی ہیں۔

(۱)

پہلا شعر:۔ یہ کفر و الحاد کا زمانہ ہے جو دین کے مٹانے پر تلا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں جو خیالات کارفرما ہیں ان کی بنیاد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر نہیں بلکہ ملاحدہ۔ زنادقہ اور دشمنِ اسلام جماعتوں کے افکار پر ہے۔

دوسرا شعر:۔ اے جاوید! بلکہ اے مسلمان نوجوانو! بادشاہوں کے دربار سے اللہ کے مقبول بارگاہ بندوں کی جھونپڑی زیادہ محترم اور دلکش ہے یعنی بادشاہوں کے محلات میں کھانے پینے کو عمدہ چیزیں مل سکتی ہیں لیکن روح کو مسرت نہیں حاصل ہو سکتی یہ نعمت صرف اللہ والوں کی صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

واضح ہو کہ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے جاوید کے پردہ میں قوم کے نوجوانوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اختیار کرو لیکن افسوس کہ قوم نے اس نصیحت پر عمل نہیں کیا اور سچ پوچھو تو قوم کا اس میں کچھ قصور نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں نے انگلستان کو اپنا کعبۂ مقصود قرار دے رکھا ہے تو نوجوان بغداد یا قاہرہ کیسے جا سکتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے کیا خوب لکھا ہے۔

اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی قوم کی انجن کی طرف

تیسرا شعر:- لیکن یہ عیاری اور فریب کاری کا زمانہ ہے لہٰذا ہر شخص پر جو متشرع صورت بنا کر تمہیں جماعت صالحین میں شامل ہونے کی دعوت دے بغیر تحقیق ایمان مت لے آنا۔

چوتھا شعر:- افسوس کہ اس کافرانہ نظام حکومت میں قرآن و حدیث کے علوم تقریباً مٹ گئے اور آج ہمارے ملک میں ان علوم کے ماہرین کا قحط رونما ہو چکا ہے[1]

پانچواں شعر:- افسوس کہ میرا ملک ان قدسی نفوس انسانوں سے خالی ہو چکا ہے جن کی نگاہ سے گناہوں میں آلودہ انسانوں کی اصلاح ہو جاتی تھی لیکن تو اس حقیقت سے کبھی غافل مت ہونا کہ تو جس خاندان کا نام لیوا ہے اس کے افراد ہمیشہ سے بزرگوں کی صحبت میں بیٹھتے چلے آئے ہیں۔

عارفانہ مذاق۔ یہ تصوّف کی اصطلاح ہے یعنی بزرگان دین اور اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھنے کی خواہش کرنا۔

---

[1] چنانچہ آج سارے ملک میں حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب مرحوم کے پایہ کا کوئی مفسّر یا محدّث موجود نظر نہیں آتا۔ بلکہ اب تو مثنوی رومی اور مکتوبات سرہندی کا پڑھانے والا بھی اس ملکِ خداداد میں کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

چھٹا شعر:۔ پس تو اپنے دل کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے منوّر کرلے اس کے بعد اگر تو فرنگی اساتذہ سے مغربی تعلیم حاصل کرے گا تو وہ تعلیم تجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

واضح ہو کہ علامہ نے اس شعر میں دراصل مسلمان والدین کو نصیحت کی ہے کہ اسکولوں میں داخل کرنے سے پہلے اپنے بچوں کے دل و دماغ میں اسلام کی محبت پیدا کردو تاکہ وہ مغربی تعلیم کے جراثیم سے محفوظ رہ سکیں لیکن افسوس کہ ہمارا طرز عمل اس کے برعکس ہے جہاں بچے نے ہوش سنبھالا والدین نے اسے کافر اتالیق کے حوالہ کردیا۔ اسی لئے اکبر الہ آبادی نے ان نوجوانوں کی اسلامی زندگی پر بایں الفاظ ماتم کیا ہے۔

گذرا ان کا ہوا کب عالم اللہ اکبر میں!
پلے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں

ساتواں شعر:۔ اے مسلمان نوجوان! تو شوق سے دنیاوی عزت وجاہ یا مال و دولت حاصل کر لیکن دنیا یا اس کی دلچسپیوں کو مقصود حیات مت بنا۔ اپنی ملّت سے رابطہ استوار کر اور اپنے اسلامی اصولوں کو ہر وقت پیش نظر رکھ یعنی خودی کی تربیت سے غافل مت ہو۔

آٹھواں اور نواں شعر:۔ دراصل انسان اپنے اندر غیر محدود طاقتیں رکھتا ہے اس حقیقت کو سامنے رکھ اور اپنی مخفی قوتوں کو بروئے کار آنے کا موقع دے لیکن اس کے لئے تجھے ہر وقت جد و جہد کرنی ہوگی چنانچہ دیکھ لے اگر کسان محنت کرتا ہے تو اس کا بویا ہوا ہر دانہ

سینکڑوں دانے پیدا کر سکتا ہے اسی طرح تیری شخصیت میں سینکڑوں خوبیاں پوشیدہ ہیں پس تو سعیٔ پیہم سے اپنی صلاحیتوں کی تربیت کر۔

دسواں شعر:۔ غافل مت ہو۔ دنیا دار العمل ہے۔ اپنی زندگی کو کھیل کود میں ضائع مت کر۔ بلکہ ہنر (علم و فن) حاصل کر اور دنیا میں نام پیدا کر۔

۲

سینے میں اگر نہ ہو دلِ گرم — رہ جاتی ہے زندگی میں خامی
نخچیر اگر ہو زیرک و چست — آتی نہیں کام کہنہ دامی
ہے آبِ حیات اسی جہاں میں — شرط اس کے لئے ہے تشنہ کامی
غیرت ہے طریقتِ حقیقی — غیرت سے ہے فقر کی غلامی
اے جانِ پدر نہیں ہے ممکن — شاہیں سے تدرو کی غلامی
نایاب نہیں متاعِ گفتار — صد انوری و ہزار جامی
ہے میری بساط کیا جہاں میں — بس ایک فغانِ زیر بامی
اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے — میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی
اللہ کی دین ہے۔ جسے دے — میراث نہیں بلند نامی
اپنے نورِ نظر سے کیا خوب — فرماتے ہیں حضرتِ نظامی

"جائے کہ بزرگ بایدت بود
فرزندیٔ من ندارودت سود"

(۲)

پہلا اور دوسرا شعر:- یاد رکھ! اگر دل میں ترقی کا جذبہ نہ ہو تو انسان اس دنیا میں کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ دیکھ لے! جو حیوان یا طائر عقلمند اور چالاک ہوتا ہے وہ صیاد کے جال میں نہیں آتا اسی طرح اگر زیرکی اور چستی سے کام لے تو کسی کے فریب میں نہیں آسکے گا۔

تیسرا شعر:- آبِ حیات۔ اسی دنیا میں ہے اگر تو اسے حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے حصول کے لئے تڑپ اپنے دل میں پیدا کر۔

آبِ حیات سے مراد ہے ایسی زندگی جس سے صفتِ دوام حاصل ہو جائے یعنی اگر تو یہ چاہتا ہے کہ تیرا نام دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے تو اس مقصد کے حصول کے لئے کوشش کر۔

چوتھا شعر:- اے بیٹے! غیرت یعنی دین کی عزّت دنیا میں برقرار رکھنے کا بے پناہ جذبہ یہی حقیقی طریقت یعنی شریعت اسلامیہ کی روح ہے۔

پانچواں شعر:- اسلامی شریعت کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے سے مسلمان کے اندر دین کے لئے غیرت پیدا ہو جائے۔

ع دوسرا نام اسی دین کا ہے قصرِ غیور

جب تک غیرت کا رنگ پیدا نہ ہو۔ شانِ فقر کی تکمیل نہیں ہو سکتی چنانچہ جو چیز مسلمان کو غیر اللہ کی غلامی یا اطاعت سے باز رکھ سکتی ہے وہ یہی

غیرت تو ہے اگر مسلمان میں غیرت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ دیکھ لے شاہین موت قبول کرے گا لیکن چکور یا تیتر کی غلامی نہیں کرے گا۔

سلطان ٹیپو شہید میں یہ غیرت ہی تو تھی جس کی بناء پر اس نے موت قبول کی لیکن کافر کی غلامی قبول نہیں کی اور نظام علی خاں میں اسی جوہر کا فقدان تھا چنانچہ اس نے غلامی قبول کرلی اور غلاموں کا ایک طویل سلسلہ قائم کر دیا۔

چھٹا اور ساتواں شعر:۔ یاد رکھ! شاعری بذات خود کوئی نایاب یا قابلِ فخر چیز نہیں ہے۔ دنیا میں ایک نہیں سینکڑوں آدمی شاعری کے اعتبار سے نوری اور جامی کے ہم پلہ گذر چکے ہیں شاعری کو اپنے لئے باعث فخر نہیں سمجھتا ہوں میں عرف عام کے لحاظ سے شاعر نہیں ہوں بلکہ میری حقیقت صرف اتنی ہے کہ میں قوم کو اپنے درد دل کی داستان سناتا ہوں جس طرح کوئی عاشق محبوب کے بالاخانہ کے نیچے کھڑے ہو کر اپنا درد دل اسے سنائے۔

آٹھواں شعر:۔ میں جو دنیا کی نظروں میں محترم ہوں اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں کوئی بلند پایہ شاعر ہوں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے قرآن اور حدیث کے حقائق و معارف نہایت سچائی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیئے ہیں اور کسی کی رعایت نہیں کی۔

ع کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق

نواں شعر:۔ یاد رکھ! شہرت اور نیک نامی کسی شخص کو میراث

میں نہیں مل سکتی یہ دولت صرف اسے مل سکتی ہے جو اس کے لئے کوشش کرے اور اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ انہیں لوگوں کو نیک نامی عطا کرتا ہے جو اس کے مستحق ہوتے ہیں۔

دسواں شعر:۔ میں تجھے وہی نصیحت کرتا ہوں جو نظامی گنجوی نے اپنے بیٹے کو کی تھی کہ اے بیٹے! دنیا میں جس جگہ بزرگی درکار ہے وہاں محض میرے بیٹے ہونے کی بنا پر تجھے جگہ نہیں مل سکے گی۔ بزرگی کے مقام پر پہنچنے کے لئے بزرگ ہونا شرط ہے پس بزرگی حاصل کر۔

۳

مومن پہ گراں ہیں یہ شب و روز
دین و دولت قمار بازی

ناپید ہے بندۂ عمل مست
باقی ہے فقط نفس درازی

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی

اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شانِ بے نیازی

کنجشک و حمام کے لئے موت
ہے اس کا مقام شاہبازی

روشن اس سے خرد کی آنکھیں
بے سرمۂ بوعلی و رازی

حاصل اس کا شکوہِ محمود
فطرت میں اگر نہ ہو ایازی

تیری دنیا کا یہ سرافیل
رکھتا نہیں ذوقِ نے نوازی

ہے اس کی نگاہِ عالم آشوب
در پردہ تمام کارسازی

یہ فقرِ غیور جس نے پایا
بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی

مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

(۳)

پہلا شعر:۔ مومن۔ اس دنیا اور اس کی فریب کاریوں سے ہر وقت متنفر رہتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ دنیا پرست علماء اور امراء دونوں حصول جاہ کے لئے سرگرداں رہتے ہیں جب بندۂ مومن یہ دیکھتا ہے کہ دین دار لوگ ضرورت کے وقت دین کو بھی داؤں پہ لگا دیتے ہیں تو اسے بہت رنج ہوتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ آج دنیا ہر قسم کے فنکاروں سے بھری پڑی ہے لیکن مرد مجاہد کہیں نظر نہیں آتا۔

تیسرا شعر:۔ اے بیٹے! اگر تجھ میں ہمت ہو تو اپنے اندر وہ فقر پیدا کر جس کی تعلیم سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو دی تھی۔

نوٹ:۔ فقر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فقر حجازی۔ دوسرا فقر ہندی۔ دونوں فقر کو شعر کی شرح میں سمجھیں۔

چوتھا شعر:۔ فقر حجازی کی شناخت یہ ہے کہ اس فقر سے آدمی میں اللہ کی سی شانِ بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے یعنی صاحب فقر حجازی کسی انسان کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا اور نہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا حاجت روا سمجھتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ اس صاحب فقر کا مقام کافروں کے حق میں اسی طرح پیام موت بن جاتا ہے جس طرح شہباز کا مقام چڑیا اور کبوتر کے لئے یعنی مرد مومن کفار پر اسی آسانی کے ساتھ غالب آسکتا ہے جس آسانی کے ساتھ شہباز کبوتر پر۔

چھٹا شعر:۔ نیز اس فقر سے انسان کی عقل بوعلی سینا اور فخر الدین امام رازی صاحب تفسیر کبیر کی تصانیف کا مطالعہ کئے بغیر منور ہو جاتی ہے۔

ساتواں شعر:۔ اور اگر فطرت میں غلامی کا مادہ موجود نہ ہو (جس کا کوئی علاج نہیں) تو اس فقر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان بت شکن بن جاتا ہے اور اسے وہی سطوت حاصل ہو جاتی ہے جو سلطان محمود غزنوی کو حاصل تھی۔

آٹھواں شعر:۔ یہ مرد مومن دراصل مردوں کو زندہ کر سکتا ہے یعنی اس کی صحبت کے فیض سے کافر مسلمان ہو جاتے ہیں لیکن اسے نے نوازی کا چنداں شوق نہیں ہوتا یعنی وہ اسرافیل کی طرح صور پھونک کر عالم کو تہ و بالا نہیں کرتا بلکہ محض اپنی نگاہ سے انقلاب پیدا کر سکتا ہے اور کرتا ہے یعنی مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ دوسرا مطلب اس شعر کا یہ ہو سکتا ہے کہ جو کام اسرافیل صور سے لیتا ہے۔ مرد مومن

نواں شعر:۔ یہ کام اپنی نگاہ سے لیتا ہے۔ بظاہر اس اس کی نگاہ سے دنیا میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے لیکن دراصل وہ اپنی

نگاہ سے بگڑے ہوئے کام بناتا ہے اور لوگوں کی کارسازی کرتا ہے یعنی اس کا وجود دنیا کے لئے باعثِ رحمت ہوتا ہے۔

دسواں شعر:۔ جو مسلمان اس فقرِ غیور کا مالک ہوتا ہے وہ اپنی زبان سے وہی کام لے سکتا ہے جو ایک غازی تیر و سنان سے لیتا ہے یعنی غازی اور صاحبِ فقر دونوں جہاد کرتے ہیں ایک تلوار سے، دوسرا اپنی نگاہ اور زبان سے۔ غازی تلوار سے کفر کا مقابلہ کرتا ہے اور فقیر اپنی نگاہ سے کفر کی کمر توڑ دیتا ہے۔

چنانچہ جو کام شہاب الدین شاہ غوری[1] رحمۃ اللہ علیہ نے تلوار سے کیا وہی کام ہمارے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری سلطان الہند[2] رحمۃ اللہ علیہ نے نگاہ سے انجام دیا۔

---

[1] سلطان شہاب الدین غوری کا نام غایت شہرت کی بنا پر محتاج تعارف نہیں اسی خوش نصیب سلطان نے ۱۱۹۲ء میں دہلی اور اجمیر کے آخری فرمانروائے پتھورا کو میدان جنگ میں قتل کر کے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم کی ۱۲۰۶ء میں باطنی فرقہ کے ایک پیرو نے دھوکہ سے سلطان غوری کو قتل کر دیا۔

[2] حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین اجمیری کی ولادت ۵۳۰ھ ہے۔ یہ جب مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو انہیں خواب میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بشارت ملی کہ ہم نے تمہیں ہندوستان کی ولایت (روحانی بادشاہت) عطا کی چنانچہ آپ ۵۸۶ھ میں لاہور تشریف لائے اور حضرت داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر چالیس دن قیام کے بعد دہلی کو اپنے قدموں سے برکت دی پھر وہاں سے

(بقیہ صفحہ ۳۲۳)

اگیارھواں شعر:- پس اے نوجوان! تو اللہ سے اس فقیری کے حصول کی دعا کر۔ کیونکہ مومن کے لئے یہی فقیری دراصل امیری ہے۔

علامہ اقبال نے اس خیال کو اپنی کئی کتابوں میں مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کا نصب العین ہی یہی ہے کہ مسلمان فقر کی طاقت سے حکومت کرے تاکہ وہ حکومت دنیا کے لئے رحمت بن سکے اور سچ تو یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حکومت اسی لئے اہل عالم کے لئے باعثِ رحمت تھی۔

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

(بقیہ صـ۳۲۴ کا)

پاپیادہ اجمیر تشریف لے گئے۔ راستہ میں جس پر نگاہ پڑ جاتی تھی آپ کا حلقہ بگوش ہو جاتا تھا۔ چنانچہ آپ جب اجمیر پہنچے تو ہمراہیوں کی تعداد آٹھ سو سے متجاوز ہو چکی تھی۔ سلطان شہاب الدین غوریؒ نے تلوار کے زور سے ملک فتح کیا تو سلطان الہند خواجہ معین الدین اجمیری نے نگاہ کے زور سے قلوب مسخر کئے۔

سوم حصہ

عورت

مردِ فرنگ

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پروین
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

شرح مشکلات تمہید۔ عورت کا مسئلہ ہمارے زمانہ میں بہت پیچیدہ صورت اختیار کر چکا ہے اور یہ پیچیدگی مغربی تہذیب کی پیدا کردہ ہے۔ غلط تعلیم نے عورت کے دل میں یہ غلط خیال جاگزیں کر دیا ہے کہ مرد اور عورت میں کامل مساوات ہے اور عورت کسی اعتبار سے بھی مرد کی محتاج یا دست نگر نہیں ہے اگر دنیا قرآن مجید کے اصول اختیار کرے تو عورت کا مسئلہ بآسانی حل ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ یعنی مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ جہاں تک انعامات الٰہیہ کا تعلق ہے عورت اور مرد دونوں یکساں ہیں لیکن اس لحاظ سے کہ عورت اپنی حفاظت کے لئے مرد کی محتاج ہے وہ مرد سے کمتر یا فروتر ہے اور اس لحاظ سے کہ وہ ماں بنتی ہے اس کا درجہ اس قدر بلند ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ۔ یعنی جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ نیز اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عورت کا حقیقی مقام آفس یا کارخانہ یا کلب یا میدانِ جنگ نہیں ہے بلکہ گھر ہے آج کل صورت یہ ہے کہ عورت گھر میں رہنا نہیں چاہتی اور یہی ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ یورپ میں عورت کا مسئلہ اس قدر پیچیدہ کیوں ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ اگرچہ یورپ کے حکما ایک عرصہ سے مسئلہ زن کو

سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن انہیں ابھی تک کامیابی نہیں ہوسکی وہ مسئلہ یہ ہے کہ معاشرت میں عورت کی کیا حیثیت ہے۔

دوسرا شعر:۔ مغربی معاشرہ میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک یہ طے نہیں ہوسکا کہ عورت کی حیثیت کیا ہے لیکن ہم ان خرابیوں کا ذمہ وار عورت کو قرار نہیں دے سکتے ہیں یعنی یہ تو سچ ہے کہ مغرب میں سوسائٹی کا نظام بدل گیا ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ عورت کی فطرت خراب ہے۔ نہیں وہ بالطبع بہت شریف ہے زمین و آسمان اس کی شرافت پر گواہ ہیں۔

دراصل بات یہ ہے کہ یورپ کے مرد بھولے ہیں وہ عورت کی فطرت سے واقف نہیں ہیں اس لئے معاشرت میں فساد رونما ہوگیا۔

عورت فطرۃً مرد کی دست نگر اور اپنی حفاظت کے لئے اس کی محتاج ہے علاوہ بریں اسے فطرت نے ماں بننے اور بچوں کی پرورش کرنے اور گھر کا انتظام کرنے کے لئے پیدا کیا ہے یعنی قدرت نے مردوں اور عورتوں کے لئے جداگانہ دائرۂ عمل مقرر کر دیا ہے وہ اس لئے پیدا نہیں کی گئی ہے کہ میدان جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کرے بلکہ اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ

۱ ۔ ماں بنے یعنی بچے پیدا کرے اور ان کی صحیح طریق پر تربیت کرے۔

۲ ۔ گھر کا انتظام کرے اور مرد جو کچھ کما کر لائے اسے سلیقہ کے ساتھ صرف کرے اور کچھ رقم پس انداز کرے۔

۳ ۔ اپنی عصمت کی حفاظت کرے تاکہ سوسائٹی میں فساد رونما نہ ہونے

پائے الغرض فطرت نے اس کے لئے جو وظائفِ حیات مقرر کر دئے ہیں ان پہ
معاشرت کو خوش گوار بنائے۔

تیسرا شعر:۔ یورپ نے فطرت کے اصول اور عورت کی
فطرت دونوں باتوں کو مدنظر نہیں رکھا اور عورت کو اپنی تفریح کا آلہ بنالیا
یعنی وہ گھر کی ملکہ بننے کے بجائے کلب کی زینت بن گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ
معاشرت میں فساد رونما ہوگیا۔

ایک سوال

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے
ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بیکار و زن تہی آغوش

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے یورپ کے معاشرتی نظام پہ
تنقید کی ہے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ یوں تو حکمائے یورپ نے سائنس اور فلسفہ

میں بڑی ترقی کی ہے چنانچہ مشرق اور مغرب کے لوگ ان کے خیالات کی تقلید کر رہے ہیں لیکن اُن کی حکمت نے بنی آدم کو زندگی بسر کرنے کا طریقہ نہیں سکھایا۔

دوسرا شعر:۔ اور معاشرت کا صحیح نظام قائم نہیں کیا اور اسی غلطی کا یہ نتیجہ ہے کہ مرد تو بیکاری میں مبتلا ہیں اور عورتوں میں ضبطِ تولید کا میلان پایا جاتا ہے یعنی وہ بچے پیدا کرنے سے گھبراتی ہیں کیونکہ وہ ان کی پرورش کو اپنے لئے وبالِ جان سمجھتی ہیں۔

(:)

پردہ

بہت رنگ بدلے سپہرِ بریں نے
خدا یا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے
تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے
وہ خلوت نشیں ہے! یہ خلوت نشیں ہے
ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم
کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے

(:)

شرح مشکلات

پہلا شعر:۔ اس نظم میں اقبال نے ایک عجیب نکتہ پیدا کیا ہے عام طور سے "پردہ" کو عورت کے لئے

مخصوص سمجھا جاتا ہے یعنی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ عورت صرف پردہ کرتی ہے مرد پردہ نہیں کرتے لیکن اقبال کہتے ہیں کہ دونوں پردے میں ہیں۔

دوسرا شعر:۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ دنیا میں بہت سے انقلاب آئے لیکن یہ دنیا جہاں تھی وہ وہیں ہے۔ میں نے عورت اور مرد میں کوئی تفاوت نہیں دیکھا دونوں خلوت نشین ہیں بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اولادِ آدم ابھی تک پردہ میں ہے کیونکہ ابھی تک کسی نے اپنی خودی کو پردہ سے باہر نہیں نکالا۔

تیسرا شعر:۔ اقبال کہتے ہیں کہ لوگ غلط کہتے ہیں کہ صرف عورت پردہ میں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دونوں پردہ میں ہیں کیونکہ ان کی خودی پردہ میں ہے یعنی اس نظم میں انہوں نے نہایت دلپذیر انداز میں ہمیں اظہارِ خودی کی طرف راغب کیا ہے۔

(۵)

خَلوت

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدّر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوت میں خودی ہوتی ہے خود گیر و لیکن
خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسّر

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے خلوت (پردہ) کے فوائد بیان کئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ اس دور کے لوگوں میں اپنی نمائش کا جذبہ حد سے بڑھ گیا ہے جس کو دیکھو اس دھن میں ہے کہ کسی طرح مجھے شہرت نصیب ہو جائے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کا چہرہ یعنی ظاہر تو بہت روشن اور خوبصورت ہے لیکن باطن بہت تاریک ہے۔

دوسرا شعر:۔ یاد رکھو! جب نظارہ کرنے کا شوق حد سے بڑھ جاتا ہے آدمی کے خیالات پراگندہ اور ابتر ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ ہر وقت نئے نئے مناظر دیکھنے کی آرزو میں لگا رہتا ہے کبھی کہتا ہے فلاں باغ میں چلو! کبھی سوچتا ہے فلاں کلب میں جا کر بیٹھوں کبھی سینما کا طواف کرتا ہے کبھی ہوٹلوں میں رات بسر کرتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ یاد رکھو! وہی قطرہ آب نیساں گوہر بنتا ہے جو صدف کے آغوش میں پنہاں ہو جاتا ہے یعنی جب اس قطرہ کو خلوت نصیب

ہوتی ہے (جب وہ پردہ کر لیتا ہے) تو وہ موتی بن جاتا ہے اسی طرح خودی خلوت میں مستحکم ہوتی ہے یعنی جو آدمی اپنی خودی کی تربیت کرنی چاہتا ہے اسے نمود و نمائش کا جذبہ دل سے نکال دینا چاہئے اور چوبیس گھنٹے میں کچھ وقت خلوت کے لئے بھی مخصوص کرنا چاہئے تاکہ وہ محاسبۂ نفس کر سکے اور تنہائی میں اپنی زندگی پر غور کر سکے کہ کس نہج پر بسر ہو رہی ہے۔

چوتھا شعر:۔ چنانچہ دنیا میں جس قدر بڑے آدمی گذرے ہیں خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم سب خلوت پسند تھے لیکن اقبال افسوس کرتے ہیں کہ یہ زمانہ ایسا ہے کہ اس میں دیر و حرم میں بھی خلوت میسر نہیں آ سکتی عورتیں اور مرد دونوں اپنے جسموں کی نمائش میں منہمک ہیں اس لئے وہ اپنی روح سے یعنی اس کی تربیت سے غافل ہیں۔

عورت

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ہمیں عورت کے حقیقی مرتبہ اور مقام سے آگاہ کیا ہے خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ ذہنی اعتبار سے عورت فرد تر ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک کوئی عورت نہ نبی ہوئی ہے نہ فلسفی نہ منطقی لیکن انبیاء اور حکما دونوں نے پرورش اسی کی آغوش میں پائی ہے۔ کہتے ہیں کہ ؛

پہلا شعر:۔ عورت کا وجود اس دنیا کی خوبصورتی کا باعث ہے اور مردوں کی زندگی میں جو کچھ سوزِ دروں پایا جاتا ہے اس کا باعث یہ ہے کہ وہ ہم سے موافقت پیدا کر سکتی ہے اگر اس کا ساز (رفاقت) ہماری زندگی میں شامل نہ ہو سکتا یعنی وہ ہم سے مانوس ہو کر ہماری زندگی کو پرکیف بنا دیتی ہے۔

دوسرا شعر:۔ اس کی مشت خاک پاکیزگی اور شرافت میں ثریا سے بھی اونچی ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دنیا میں جہاں کہیں شرافت پائی جاتی ہے اس کا منبع عورت ہی کی ذات ہے۔

تیسرا شعر:۔ یہ سچ ہے کہ وہ فلسفہ میں کوئی بلند پایہ کتاب تصنیف نہ کر سکی لیکن یہ شرف اس کے لئے کیا کم ہے کہ وہ فلاسفہ کو عالم وجود میں لائی اور اس نے ساری دنیا کے حکما کو اپنی آغوش میں پالا اور اس لائق بنایا کہ وہ فلسفہ طرازی کر سکیں۔

نوٹ:۔ مکالماتِ افلاطون۔ افلاطون کی تعلیمات اور اس کے فلسفیانہ خیالات کے مختلف مجموعے ہیں جو اس کی تصانیف میں سب سے

زیادہ مشہور ہیں۔

اس نظم سے ناظرین کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اقبال عورت کو کس قدر عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن وہ اس بے پردگی اور بے حیائی کے سخت خلاف تھے جو مسلمان عورتیں محض یورپ کی کورانہ تقلید اور اپنے شوہروں کی کوتاہ بینی کی وجہ سے اختیار کرتی جاتی ہیں اور قیام پاکستان کے بعد تو یہ مرض علاج کی سرحد سے بہت آگے گذر چکا ہے میرے خیال میں بہت اچھا ہوا کہ اقبال دنیا میں موجود نہیں ورنہ اگر وہ آج کراچی میں دخترانِ ملّت کا ذوقِ نمائش دیکھتے تو شاید اپنی تمام تصانیف کو نذرِ آتش کر کے تبت میں سکونت اختیار کر لیتے۔

آزادیٔ نسواں

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں، مردانِ خردمند

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرّد کا گلوبند

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے بڑی خوبی کے ساتھ آزادیٔ نسواں کے مسئلہ پہ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے یعنی در پردہ. پردہ کی حمایت بھی کر دی اور بظاہر کچھ نہیں کہا۔ کہتے ہیں کہ

پہلا، دوسرا، تیسرا شعر:- اگرچہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ بے پردگی عورت کے حق میں زہر ہے اور پردہ اس زہر کا تریاق ہے لیکن میں مصلحتاً خاموش ہوں کیونکہ مغرب کے مقلدین کور یعنی فیشن پرست مسلمان تو مجھ سے پہلے ہی ناراض ہیں میں انہیں مزید ناراضگی کا موقع ہی نہیں دینا چاہتا۔

چوتھا شعر:- عورت کو اللہ نے اس معاملہ میں بڑی بصیرت عطا فرمائی ہے وہ خود فیصلہ کر سکتی ہے کہ آرائش اور قیمت میں کون سی چیز زیادہ ہے۔ آزادی اور بے پردگی یا زمرد کا گلوبند یعنی پردہ نشینی۔

لفظ "زمرد کا گلوبند" اس مصرع میں بہت لطف دے رہا ہے اس کے تین معنی ہیں۔ (۱- بے پردہ عورتیں چونکہ زمرد کا گلوبند پسند نہیں کرتیں اس لئے اس لفظ سے مراد ہے پردہ۔ (۲- گلوبند سے مراد ہے پابندی اور قید اور پردہ بھی ایک قید ہے۔ (۳- زمرد کا گلوبند بہت

قیمتی چیز ہے۔ لہذا اقبال دریافت کرتے ہیں کہ تمہیں آزادی پسند ہے۔ جو ادنیٰ چیز ہے یا زمرد کا گلوبند پسند ہے جو قیمتی چیز ہے نیز زمرد کا گلوبند بہت قیمتی چیز ہے جو عموماً شوہر جہیز میں پیش کرتا ہے اس لئے اس سے شوہر کی فرمانبرداری بھی مراد ہو سکتی ہے۔

(٭)

عورت کی حفاظت

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے عمرانیات کا ایک زبردست نکتہ بیان کیا ہے جس کی اہمیت نہ پہچاننے کی وجہ سے یورپ کا معاشرتی نظام تہ و بالا ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے عورت کو فطری طور پر کمزور بنایا ہے وہ اپنی اور اپنی عصمت کی حفاظت کے لئے

مرد کی محتاج ہے۔

رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی اور لکشمی بائی سب جانتے ہیں کہ کس قدر بہادر عورتیں گذری ہیں۔ ان تینوں نے گھوڑے پر سوار ہو کر میدان جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ اور فوجوں کی رہنمائی کی۔ لیکن اس کے باوجود تینوں (شوہر) کی محتاج تھیں یعنی مرد کی حمایت اور حفاظت کے بغیر زندگی بسر نہ کر سکیں ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا یا اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت نہیں کیا کہ مجھے مرد یا شوہر کی ضرورت نہیں ہے عورت گھوڑے پر سوار ہو کر تلوار چلا سکتی ہے بلکہ تختِ سلطنت پر بیٹھ کر حکومت بھی کر سکتی ہے لیکن اپنی نسوانیت کی حفاظت نہیں کر سکتی۔

پہلا شعر:۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایک زندہ حقیقت میرے دل میں چھپی ہوئی ہے جسے میں بیان تو کر سکتا ہوں لیکن جو شخص بے غیرت ہے وہ اسے کیا سمجھ سکتا ہے؟

دوسرا شعر:۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ نسوانیت زن (عورت کا عورت پن) کی حفاظت نہ پردہ سے ہو سکتی ہے۔ نہ تعلیم قدیم سے نہ تعلیم جدید سے بلکہ صرف (مرد) اس کی نسوانیت کی حفاظت کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جارج ششم نے بھی اپنی بیٹی کی شادی کر دی حالانکہ وہ ولیعہد ہے اور آئندہ خود انگلستان کی ملکہ بن جائے گی۔

تیسرا شعر:۔ جس قوم نے اس نکتہ کو نہ سمجھا وہ بہت جلد تباہ ہو جائے گی۔ یورپ نے بحیثیت مجموعی اس نکتہ کو فراموش کر دیا ہے

وہاں آزادیٔ نسواں کا مفہوم یہ ہے کہ عورت خود اپنی نسوانیت کی حفاظت کرسکتی ہے حالانکہ یہ خلاف فطرت ہے اور چونکہ خلاف فطرت ہے اس لئے یورپ کا معاشرتی نظام بالکل تہ و بالا ہو چکا اور عنقریب جو حال دومۃ الکبریٰ کا ہوا تھا وہی اس مہذب خطۂ ارض کا ہونے والا ہے۔

عورت اور تعلیم

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا کہ عورت کے لئے کس قسم کی تعلیم درکار ہے اور مغربی تعلیم نے عورت کی زندگی پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ فرنگی تہذیب کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عورت جسے قدرت

نے ماں بننے کے لئے پیدا کیا تھا ماں بننے سے انکار کرنے لگی ہے اور وہ بچے پیدا کرنے اور انہیں پالنے کو اپنی آزادی میں رکاوٹ سمجھنے لگی ہے عورت کے اس رجحان کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ سلسلۂ اولادِ آدم منقطع ہو جائیگا۔

دوسرا شعر:۔ جس علم کی تاثیر سے عورت میں یہ جذبات پیدا ہوئے ہیں کہ وہ اپنی فطری حیثیت سے منکر ہو گئی ہے اسی علم کو سمجھ دار لوگ انسانیت کے لئے موت سے تعبیر کرتے ہیں یعنی ایسا علم عورت کے حق میں زہر کا حکم رکھتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ پس ثابت ہوا کہ اگر عورت کی تعلیم میں دین کا عنصر شامل نہ ہو اور یورپ کے نظام تعلیم میں یہ عنصر شامل نہیں ہے کیونکہ یہ نظام فرنگی تہذیب پر مبنی ہے اور یہ تہذیب لادینی پر مبنی ہے تو وہ علم و ہنر عورت کے پاکیزہ جذبات کے حق میں موت کا حکم رکھتا ہے۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو ماں بننے کے لئے پیدا کیا ہے اور اسی لئے عورت کو محبت اور ایثار کا مادّہ عطا فرمایا ہے کیونکہ جب تک عورت میں یہ جذبات شدت کے ساتھ کارفرما نہ ہوں وہ بچوں کی پرورش کے لئے اپنے عیش کو قربان نہیں کر سکتی لیکن مغربی تہذیب کا نتیجہ یہ ہے کہ عورت کا دل محبت مادری کے جذبات سے مُعَرّا ہو جاتا ہے۔

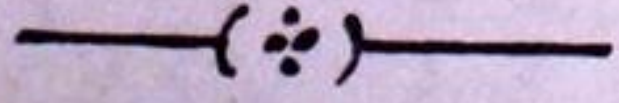

عورت

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منّتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود
راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق
آتشیں لذّتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات
گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود
میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

(❊)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے عورت کی فطری حیثیت کو واضح کیا ہے کہ وہ فعل تخلیق میں مرد کے تعاون کی محتاج ہے اگرچہ اس لحاظ سے عورت مرد کی دست نگر بن جاتی ہے لیکن اس صورت حال سے کوئی مفر نہیں ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:- مرد اپنی ذاتی خوبیوں کا اظہار دوسرے کی مدد کے بغیر کر سکتا ہے لیکن عورت اپنے جوہر کا اظہار مرد کے تعاون کے بغیر نہیں

کرسکتی یعنی عورت کا جوہر یہ ہے کہ وہ "ماں" بنتی ہے اور یہ کام مرد کے بغیر نہیں سرانجام پاسکتا۔

دوسرا شعر:۔ وہ اپنے جوہر کے اظہار کے لئے فطری جذبہ رکھتی ہے لیکن چونکہ یہ جذبہ مرد کے تعاون کے بغیر تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا اسی لئے وہ اس کے تعاون کی طرف طبعی میلان رکھتی ہے اور اسی لئے اس کی شخصیت میں لذّت تخلیق کا عنصر نمایاں ہے۔

تیسرا شعر:۔ اس کی زندگی کے اسرار اسی لذّت تخلیق کی بدولت آشکار ہوتے ہیں اور اسی جذبہ کی بدولت دنیا کی یہ رونق برقرار ہے اس میں شک نہیں کہ عورت کو اس جذبہ کی تکمیل کے لئے مرد کا دستنگر بننا پڑتا ہے لیکن اس عقدہ کے حل کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ عورت اس معاملہ میں اپنی محتاجی کا اعتراف کرے کیونکہ قانون فطرت یہی ہے۔

حصہ چہارم

ادبیات و فنونِ لطیفہ

دین و ہنر

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

تمہید :- اس باب میں حضرت علامہ مرحوم نے ادب اور فنون لطیفہ (شاعری۔ مصوری۔ موسیقی) پر اسلامی زاویۂ نگاہ سے تنقید کی ہے اور مسلمانوں کو مغربی (غیر اسلامی) نظریات اور خیالات کی خرابیوں اور گمراہیوں سے آگاہ کیا ہے۔

چونکہ اقبال دنیا کی ہر چیز کو اسلام کی روشنی میں دیکھتے ہیں اس لئے ملک کے اشتراکی اور الحاد پرست ادیب جو اپنے آپ کو "ترقی پسند" کہتے ہیں ان سے سخت ناراض ہیں اور ان پر "رجعت پسندی" کا الزام عائد کرتے ہیں مقصد ان لوگوں کا یہ ہے۔ کہ مسلمان نوجوان اقبال سے بدظن ہو جائیں تا کہ ملحدانہ خیالات کو بآسانی قبول کر سکیں۔

کیا اچھا ہوتا کہ اگر یہ لوگ اقبال کے روحانی فلسفہ پر تنقید کے بعد اپنے مادی فلسفہ کی تشریح بھی کرتے اور اس سلسلہ میں ہمیں صرف مادہ (Matter) کی منطقی تعریف سے آگاہ کر دیتے تا کہ ہم دوسرا منطقی سوال یہ دریافت کر سکتے کہ مادہ میں جو حرکت پائی جاتی ہے وہ ذاتی ہے یا عرضی۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ مادّہ ہے کیا؟ اس وقت تک حرکت کا مسئلہ زیر بحث نہیں آسکتا۔ لیکن ہمارے عریانی پسند اشتراکی ادیبوں کو علم و فن سے کیا سروکار؟

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ہمیں یہ بتایا کہ دین اور ہنر (آرٹ) میں کیا رشتہ ہے؟ واضح ہو کہ انیسویں صدی میں

یورپ کے ملحدوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مذہب (یورپ میں صرف مذہب پایا جاتا ہے وہاں کے حکماء دین کے مفہوم سے بیگانہ ہیں) اور آرٹ میں کوئی رشتہ نہیں ہے نیز آرٹ مقصود بالذات شے ہے اس کو انگریزی میں (فن برائے فن) یعنی (Art for Art's sake) کے نظریہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ ملحدانہ نظریہ تہذیب مغرب کے ناپاک شانوں پہ سوار ہو کر ہندوستان میں اس نظام تعلیم کی بدولت بآسانی شائع ہو گیا جسے فرنگیوں نے ہمارے سر پہ مسلط کر دیا ہے اور ہماری قوم کے ان بدنصیب نوجوانوں نے جو یورپ کے ملحدانہ خیالات کا شکار ہو چکے ہیں اس کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا کیونکہ یہ نظریہ ان کے خیالات کے عین مطابق ہے اور اس کا نام انہوں نے اپنے زعم باطل کی رو سے ترقی پسند ادب رکھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ادب انسانوں کو حیوانوں کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے اور آج ہندوستان اور پاکستان میں ہر قسم کی عریاں نگاری بلکہ فحاشی اس ادب کے نام سے فروغ پا رہی ہے اور ہماری قوم کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دونوں زہر کے پیالہ کو آبِ حیات سمجھ کر نوشِ جانِ ناتواں فرما رہے ہیں۔

علامہ مرحوم نے اس نظریہ کی تردید میں اپنا زورِ قلم پورا صرف کر دیا ہے چنانچہ علامہ فرماتے ہیں کہ۔

پہلا شعر:۔ موسیقی ہو یا شاعری۔ سیاست ہو یا علم و فن۔ دین ہو یا ہنر (آرٹ) یہ سب انسانی زندگی کے لئے مفید ہو سکتے ہیں انسان ان سب

چیزوں سے

دوسرا شعر:۔ فوائد حاصل کر سکتا ہے ان کی اصل انسانی ضمیر میں پوشیدہ ہے اور ان کا مقام بہت اونچا ہے۔

تیسرا شعر:۔ لیکن یہ سب انسانیت کے خادم ہیں یعنی اگر ان علوم و فنون سے انسان کی خودی مستحکم ہو سکے تو لائق ستائش ہیں ورنہ سب فضول ہیں۔ آرٹ اور زندگی میں یہ رشتہ ہے کہ آرٹ (فنون لطیفہ) زندگی کا خادم ہے۔ فن برائے فن کا نظریہ غلط ہے یعنی فن مقصود بالذات نہیں ہے۔ انسانی شخصیت فنون لطیفہ کی کسوٹی ہے جو فن انسانیت کو بلند کر سکے وہ اچھا ہے اور جس فن سے انسانیت تنزل کی طرف مائل ہو وہ برا ہے۔ اس معیار کی رو سے ترقی پسند ادب مسلمانوں کی نظر میں مذموم ہے۔

چہارم شعر:۔ یاد رکھو! اگر ادب اور آرٹ کو دین کی قید سے آزاد کر دیا جائے تو یہ دونوں بیکار ہی نہیں بلکہ مضر ہو جاتے ہیں اور جو قومیں ادب اور آرٹ کو دین کا پابند نہیں بناتیں وہ ہلاک ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اٹلی۔ فرانس۔ اسپین وغیرہ تباہی کے دروازہ پر بالکل کھڑے ہیں۔

(٭)

تخلیق

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اس آبجو سے کئے بحر و بیکراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں
ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا
ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا

(❀)

شرحِ مشکلات

اقبال کہتے ہیں کہ آرٹ کا مقصد یہ ہے کہ آرٹسٹ (فنکار) نئے تصورات پیدا کرے۔ اگر کوئی فنکار محض دوسروں کے خیالات کی تقلید کرتا ہے (جسے شاعری کی اصطلاح میں سرقہ کہتے ہیں) اور وہی فرسودہ خیالات اپنے لفظوں میں پیش کرتا ہے

تو اُسے تخلیق نہیں کہہ سکتے اور اگر کسی قوم کے فنکار صفتِ تخلیق سے بہرہ ور نہیں تو وہ قوم دنیا میں کوئی ترقی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ اگر تم نئی دنیا پیدا کرنا چاہتے ہو یعنی انسانی معاشرہ کے لئے کوئی نیا نظام بنانا چاہتے ہو جس سے قوم کو فائدہ پہونچے تو دنیا کے سامنے نئے خیالات پیش کرو اور یاد رکھو کہ نئی دنیا اینٹ اور پتھر کے نئے مکان بنانے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ نئے افکار سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسرا شعر:۔ چنانچہ جن لوگوں نے اپنی خودی کی معرفت حاصل کی انہوں نے اس چھوٹی سی ندی (خودی) سے وسیع سمندر پیدا کر دیئے یعنی دنیا میں بڑے بڑے انقلاب پیدا کر دیئے۔

تیسرا شعر:۔ وہی شخص اس دنیا میں ابدی زندگی حاصل کر سکتا ہے جو اپنی اچھوتی قوت فکر سے غیر فانی کارنامے انجام دے مثلاً جن لوگوں نے علوم و فنون میں نئی راہیں نکالی ہیں یا ان کی مدد سے نئی چیزیں پیدا کی ہیں ان کا نام قیامت تک زندہ رہے گا۔

چوتھا شعر:۔ جب سے مشرقی اقوام خصوصاً مسلمانوں کی خودی مردہ ہو گئی ہے انہوں نے کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی۔

ع ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا

اس مصرع میں اقبال نے اپنے نظریہ کا اظہار کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر انسان علم و فن میں ترقی کرے اور تحقیق و اجتہاد سے کام لے تو وہ مجازی طور پر گویا خدائی کا رازداں بن جاتا ہے یعنی جس طرح خدا نئی نئی چیزیں پیدا

کرتا رہتا ہے وہ بھی اپنی محدود طاقت کے مطابق نئی نئی چیزیں پیدا کرتا رہتا ہے اس کو شاعرانہ رنگ میں اقبال نے خدائی کے رازداں ہونے سے تعبیر کیا ہے۔

اقبال کی رائے میں اسلام السیادین ہے جو انسان کے اندر تخلیق (Creative Activity) کی شان پیدا کر سکتا ہے چنانچہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے قرآن حکیم کی آیات میں تدبر اور تفکر سے کام لے کر اپنے اندر یہ صفت پیدا کر لی تھی اور تاریخ گواہ ہے کہ انہوں کے ہر فن میں ایجادات کہیں لیکن جب وہ لکیر کے فقیر بن گئے اور جب انہوں نے عقل سے کام لینا چھوڑ دیا تو یہ صفت ان سے زائل ہو گئی چنانچہ ان کی گذشتہ چھ سو سال کی زندگی اس پر گواہ ہے یعنی انہوں نے گذشتہ چھ سو سال میں کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی اور آج جس قدر ایجادات اور اختراعات ہمارے سامنے موجود ہیں یہ سب کی سب معراج اقوام کی قوتِ تخلیق کے ثمرات ہیں۔

پانچواں شعر:۔ لیکن میں اپنی قوم سے نا امید نہیں ہوں مجھے مسلمانوں میں زندگی کے آثار نظر آ رہے ہیں انہیں یہ احساس پیدا کہ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں مغربی اقوام سے پیچھے ہیں پس کوئی تعجب کی بات نہیں اگر مسلمان بھی میری نصیحت پر عمل کر کے اپنے اندر تخلیق کی قوت پیدا کر لیں۔

جنوں

زجاج گر کی دکاں شاعری و مُلّائی !
ستم ہے خوار پھرے دشت و در میں دیوانہ
کسے خبر کہ جنوں میں کمال اَور بھی ہیں
کریں اگر اسے کوہ و کمر سے بے گانہ
ہجوم مدرسہ بھی سازگار ہے اس کو
کہ اس کے واسطے لازم نہیں ہے ویرانہ

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے قوم کو اپنے اندر جنوں کا رنگ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ جنوں اقبال کی اصطلاح ہے اور اس کا مطلب ہے انسان کے اندر اپنی خودی کو مرتبۂ کمال پر پہنچانے کا جنون یا شدید جذبہ کا پیدا ہونا۔ چنانچہ وہ مثنوی "پس چہ باید کرد" میں جنون کی تعریف ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

ہیچ قومے زیر چرخِ لاجورد
بے جنونِ در فنوں کارے نکرد

اقبال کو اپنی قوم سے ساری شکایت یہی تو ہے کہ وہ بکلی اس جنون

سے بیگانہ ہوگئی ہے اور اسی لئے دنیا میں ذلیل و خوار ہے۔ یہ جنون کیا ہے؟ صفت عشق کا خارجی مظہر ہے۔ عشق کے لئے نصب العین (آئیڈیل) لازمی ہے اور وہ نصب العین ذاتِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اس کے حصول کا ذریعہ اتباعِ سیرت محمدیہ ہے اور اتباع کے لئے صحبت مرشد شرط ہے اسی لئے اقبال نے صحبت مرشد کو ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب دیں از نظر

پہلا۔ دوسرا شعر:۔ ہماری تمام کتابیں۔ ہماری تمام سرمایۂ ادبیات۔ ہماری شاعری اور ہمارے ملّاؤں کا نصاب تعلیم اور ان کا طریق زندگی جس میں تحقیق کو مطلق دخل نہیں۔ یہ سب شیشہ گروں کی دوکانیں ہیں۔ لیکن افسوس ہماری قوم میں کوئی دیوانہ۔ فرزانہ ایسا نہیں جو ان شیشوں کو چکنا چور کر دے اور جن میں یہ اہلیت ہے وہ کس مپرسی کے عالم میں گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں افسوس قوم اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ اگر ان لوگوں کی صحبت اختیار کرے تو وہ اپنی روحانیت سے قوم کے اندر انقلاب پیدا کر سکے۔

تیسرا شعر:۔ یہ جنوں صرف حجروں ہی میں نہیں مدرسہ میں بھی پیدا ہو سکتا ہے اس کے لئے یہ شرط نہیں کہ مسلمان گھر بار چھوڑ کر بالکل صحرانوردی اختیار کر لیں۔ مسلمان شوق سے دنیاوی علوم حاصل کر لیں

لیکن اپنی زندگی کا کچھ حصہ ان دیوانوں اور اللہ والوں کی صحبت میں بھی بسر کریں تو ان کے فیضِ صحبت سے ان کے اندر بھی رنگِ جنوں پیدا ہو سکتا ہے۔

اپنے شعر سے

ہے گلہ مجھ کو تری لذّتِ پیدائی کا
تو ہوا فاش تو ہیں اب مرے اسرار بھی فاش
شعلہ سے ٹوٹ کے مثلِ شرر آوارہ نہ رہ
کر کسی سینۂ پُر سوز میں خلوت کی تلاش

شرح مشکلات اس مختصر نظم میں اقبال نے خود اپنی شاعری سے خطاب کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ میں نے جو شاعری کی تو تحسین و آفریں حاصل کرنے کے لئے نہیں کی بلکہ میری طبیعت کا اقتضا یہی تھا کہ میں شعر کہوں چونکہ شعر گوئی کا یہ جذبہ فطری تھا اس لئے میرے اسرار یعنی جذبات دوسروں پر عیاں ہو گئے۔

دوسرا شعر:۔ پس میں چاہتا ہوں کہ میرا کلام جو میرے قلب

کی گہرائیوں سے نکلا ہے ضائع نہ ہو جائے بلکہ میری آرزو یہ ہے کہ کسی سینۂ پُرسوز میں جگہ حاصل کر سکے یعنی میں نے شعر کے پردے میں قوم کو سربلندی کا راز بتایا ہے اس لئے میری آرزو ہے کہ میری قوم میرے کلام کو غور سے پڑھے اور اس پر عمل کرے۔

ع کر کسی سینۂ پُر سوز میں خلوت کی تلاش

یہ مصرع اقبال کی دلی آرزو کا آئینہ دار ہے وہ چاہتے تھے کہ قوم انہیں محض شاعر نہ سمجھ لے بلکہ ان کے پیغام کو حرزِ جاں بنا لے۔ لیکن افسوس کہ ابھی تک تو ان کی یہ آرزو پوری ہوئی نہیں چنانچہ خود ان کو بھی شاعروں کی صف میں داخل کر دیا اور اسی لئے انہوں نے قوم کی اس ناقدری کی شکایت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تھی۔

من اے میرِ امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

نوٹ:۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ وہ ایک مردہ قوم میں پیدا ہوئے۔ کہیں مردے بھی سنا کرتے ہیں ہرگز نہیں سنتے ہیں۔

پیرس کی مسجد

مری نگاہ کمالِ ہنر کو کیا دیکھے
کہ حق سے یہ حرمِ مغربی ہے بیگانہ
حرم نہیں ہے، فرنگی کرشمہ بازوں نے
تنِ حرم میں چھپا دی ہے روحِ بتخانہ
یہ بتکدہ انہیں غارتگروں کی ہے تعمیر
دمشق ہاتھ سے جن کے ہوا ہے ویرانہ

شرح مشکلات واضح ہو کہ فرانس نے گذشتہ پچاس سال سے مسلمان قوم کو غلام بنانے پر کمر باندھ رکھی ہے چنانچہ جنگ عظیم (اوّل) سے پہلے اس دشمن اسلام نے مراکو۔ الجیریا۔ اور ٹیونس کو زیر نگیں کیا اور جنگ عظیم کے بعد شام پر تسلّط قائم کیا۔ اور ان ملکوں کے مسلمانوں کو مٹانے کے لئے اپنی ساری طاقت صرف کر دی۔ ایک طرف تو یہ ظالمانہ طرزِ عمل روا رکھا دوسری طرف مسلمانانِ عالم کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے پیرس میں ایک مسجد تعمیر کی۔ چونکہ اس مسجد کی تعمیر ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لئے کی گئی اس لئے اقبال نے غیرتِ ملّی سے متاثر ہو کر یہ نظم سپردِ قلم کی۔

پہلا شعر:۔ اقبال کہتے ہیں کہ میں اہل فرانس کے کمالِ فن تعمیر کی کیسے داد دے سکتا ہوں یہ مسجد جو انہوں نے پیرس میں بنائی ہے اس کی بنیاد سچائی پر نہیں رکھی گئی۔

دوسرا شعر:۔ یہ مسجد نہیں ہے بلکہ فرنگی شعبدہ بازوں نے مسجد کی شکل میں بت خانہ تعمیر کیا ہے تاکہ مسلمان ان کی اسلام دوستی کے دھوکہ میں آجائیں۔

تیسرا شعر:۔ کیونکہ یہ بتکدہ انہیں غارت گروں نے تعمیر کیا ہے جنہوں نے دمشق کو جو مسلمانوں کا مرکز تھا۔ تباہ کر دیا اگر انہیں اسلام یا مسلمانوں سے ہمدردی ہوتی تو وہ دمشق کو ویران نہ کرتے پس ان کا یہ فعل کسی طرح لائق ستائش نہیں ہے۔ انہوں نے یہ مسجد نہیں بنائی مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکا ہے۔

(٭)

ادبیات

عشق اب پیروئ عقل خدا داد کرے
آبرو کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے
کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کرے
یا کہن روح کو تقلید سے آزاد کرے

(٭)

شرح مشکلات **پہلا شعر:۔** علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اب ہمیں ادب میں نئی اور زندگی بخش راہیں تلاش کرنی لازم ہیں۔ گل و بلبل کے افسانے اور وصل و ہجر کی داستانیں اور کوچۂ معشوق میں رسوائیاں۔ رقیبوں سے لڑائیاں یہ سب فضول اور بیکار باتیں ہیں قوم کو اس قسم کی شاعری سے کوئی اخلاقی یا مادی نفع حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسرا شعر:۔ اب ہمیں چاہئے کہ ہم شاعری کے کہنہ پیکر یا قدیم اسلوب میں نئی روح یعنی نئے تصورات داخل کریں یا قدیم استادوں کی کورانہ تقلید سے باز آکر اور اپنی عقل خداداد سے کام لے کر شاعری کو قوم کے حق میں مفید بنائیں۔

نگاہ

بہار و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی
شباب و مستی و ذوق و سرور رعنائی
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
یہ بحر! یہ فلکِ نیلگوں کی پہنائی

○ ریاض منزل (دولت کدہ سر راس مسعود) بھوپال میں لکھے گئے۔

سفرِ عروسِ قمر کا عماریٔ شب میں
طلوعِ مہر و سکوتِ سپہرِ مینائی
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

—(:)—

شرح مشکلات اس نظم کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی رنگا رنگیوں اور فطرت کی نعمتوں سے لذت اندوز ہونے کے لئے مال و دولت کی ضرورت نہیں بلکہ نگاہ کی ضرورت ہے ایسی نگاہ جو فطرت کے حسن و جمال کی قدر کر سکے۔ نگاہ سے مراد ہے مظاہرِ فطرت کا تحسین کا ملکہ با سلیقہ

کہتے ہیں کہ بہار کا موسم باغوں میں ہر قسم کے پھول عالم شباب و رونق فنون لطیفہ۔ حسن و جمال جو مظاہرِ فطرت میں پایا جاتا ہے۔ چاندنی رات۔ نیلا سمندر۔ تاروں سے جگمگاتا ہوا آسمان۔ چاند کا سفر۔ آفتاب کا طلوع۔ یہ سب چیزیں بڑی دلکش ہیں بشرطیکہ نگاہ ہو اور فطرت نے یہ دلکشی ہمارے لئے بالکل مفت مہیّا کی ہے اس سے لذّت اندوز ہونے کے لئے صرف نگاہ کی ضرورت ہے۔

—(:)—

مسجد قوت الاسلام

ہے مرے سینۂ بے نور میں اب کیا باقی
لَا اِلٰہ مردہ و افسردہ و بے ذوقِ نمود
چشمِ فطرت بھی نہ پہچان سکے گی مجھ کو
کہ ایازی سے دگرگوں ہے مقامِ محمود
کیوں مسلمان نہ خجل ہو تری سنگینی سے
کہ غلامی سے ہوا مثلِ زجاج اس کا وجود
ہے تری شان کے شایاں اسی مومن کی نماز
جس کی تکبیر میں ہو معرکۂ بود و نبود
اب کہاں میرے نفس میں وہ حرارت وہ گداز
بے تب و تابِ دروں میری صلوٰۃ اور درود
ہے مری بانگِ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ
کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلماں کا سجود؟

(٭)

شرح مشکلات جب مسلمانوں نے سنہ ۱۱۹۳ء میں دلّی فتح کی تو کچھ عرصے کے بعد انہوں نے رائے پتھورا کے قلعہ میں ایک عظیم

الشان مسجد کی بنیاد رکھی جس کا ایک مینار آج قطب مینار کے نام سے مشہور ہے اگرچہ یہ مسجد پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی لیکن اس ناتمام حالت میں بھی مضبوطی اور عظمت کے لحاظ سے دیکھنے والوں کو متاثر کر سکتی ہے چنانچہ اقبال نے اس نظم میں اس کی اسی عظمت اور استواری کا نقشہ کھینچا ہے علامہ اقبال کہتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ احکام الٰہی سے روگردانی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ میری قوم کا سینہ نور اسلام سے بالکل خالی ہو چکا ہے افراد محض زبان سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہہ لیتے ہیں لیکن اس کلمہ کا ان کی زندگی پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

دوسرا شعر:۔ صدیوں کی غلامی سے مسلمانوں کی حالت اس قدر بدل چکی ہے کہ فطرت بھی اگرچہ اس کی آنکھ بہت تیز ہے۔ ان کو نہیں پہچان سکتی۔

تیسرا شعر:۔ اے مسجد! جب میں مسلمانوں کے ضعف اور تیرے استحکام پر غور کرتا ہوں تو شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ افسوس! ایک مسلمان وہ تھے جنہوں نے تجھے بنایا اور ایک مسلمان ہم ہیں کہ تیری حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔

چوتھا شعر:۔ اے مسجد! مجھے تو تیرے اندر پڑھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے میری رائے میں صرف وہ مسلمان تیرے اندر نماز پڑھ سکتا ہے جس کی تکبیروں سے کفر نیست و نابود ہو جائے۔

پانچواں شعر:۔ افسوس! مسلمانوں کے اندر اب وہ عشق رسول نہیں اور نہ وہ غیرتِ ملّی ہے نہ وہ سوز و گداز ہے اور نہ ان کی نمازوں میں وہ خلوص ہے اور نہ ان کے درود میں وہ حرارت ہے جو کسی زمانہ میں ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز تھی۔

چھٹا شعر:۔ بے شک وہ اذانیں بھی دیتے ہیں لیکن اب ان کی اذانوں میں نہ عظمت ہے نہ ہیبت نہ بلندی نہ شکوہ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اب مسلمان اس قابل ہی نہیں کہ اس مسجد میں سجدہ کر سکیں۔

(٭)

تاتر

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود
حیات کیا ہے؟ اُسی کا سرود و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پروین سے ہے اسی کا مقام
اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات
حریم تیرا خودی غیر کی! معاذ اللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے
رہا نہ تُو، تو نہ سوزِ خودی، نہ سازِ حیات

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے تھیٹر (Theatre) پر تنقید کی ہے کہ یہ فن انسانی خودی کی تربیت کے لئے بہت مضرت رساں ہے کیونکہ اس کا کمال یہ ہے کہ انسان نقّال بن جائے اور نقالی میں کمال اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ایکٹر اپنی خودی سے بیگانہ ہو جائے

پہلا شعر:- اے انسان! اس حقیقت پر غور کر کہ تیرا حریم وجود صرف تیری خودی سے منوّر ہو سکتا ہے تیرے وجود کا انحصار تیری خودی پر ہے اگر خودی مردہ ہو جائے تو۔ تو مردہ ہو جائے گا۔

اور یہ حیات کیا ہے؟ یہ اسی خودی کے سرور سوز و گداز اور ثبات و قیام کا دوسرا نام ہے۔

دوسرا شعر:- جو چیز تجھ کو اشرف المخلوقات بناتی ہے اور مہ و پرویں سے اونچا مرتبہ عطا کرتی ہے وہ خودی ہی تو ہے اور تیری ذات و صفات تیری خودی ہی کے نور سے پیدا ہوئی ہیں۔

تیسرا شعر:- اندریں حالات کیا یہ افسوسناک بات نہیں کہ تو اس قدر بے وقوف ہو جائے کہ حریم تیرا اور خودی غیر کی۔ جب تو نے اپنی شخصیت میں غیر کی خودی داخل کر دی تو تو باقی ہی کہاں رہا؟ یہ تو بت پرستی کی دوسری شکل ہے،

چوتھا شعر:- اے انسان! تو ایکٹنگ (تمثیل) کا پیشہ اختیار کر کے لات و منات کی پرستش کا سلسلہ دوبارہ زندہ مت کر۔ غور کر کہ ایکٹنگ کا کمال یہی تو ہے کہ تو باقی نہ رہے اور وہ شخص بن جائے جس کا پارٹ تو اسٹیج پر ادا کر رہا ہے پس جو ایکٹنگ کا کمال ہے وہ تیری شخصیت کے لئے باعثِ زوال ہے جب

تو نہ رہا۔ بلکہ اسٹیج پر "سکندر اعظم یا شاہجہاں" بن گیا تو پھر نہ تیری خودی کا سوز باقی رہا نہ تیری زندگی کا ساز ہی باقی ہے۔

واضح ہو کہ انسانی شخصیت کی تکمیل سوز اور ساز سے ہوتی ہے۔ سوز کی بدولت انسان جدوجہد کرتا ہے یہ اس کی شانِ جلال ہے ساز کی بدولت انسان ماحول سے موافقت پیدا کرتا ہے اور یہ اس کی شان جمال ہے لیکن جب ایک شخص ایکٹر بن جاتا ہے تو نہ سوز باقی رہتا ہے نہ ساز۔

شعاعِ امید

۱

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز! کبھی صبح کبھی شام
مدّت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریٔ ایام
نے ریت کے ذرّوں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

شرح مشکلات اس دلپذیر تمثیلی نظم میں اقبالؔ نے ہندوستان کے باشندوں کو رجائیت (Optimism) کی تعلیم دی ہے اور نصیحت کی ہے کہ مایوس نہیں ہونا چاہئے انشاء اللہ ضرور تاریکی دور ہوگی۔ ناامید ہو جانا سب سے بڑا گناہ ہے کیونکہ اس کے بعد ترقی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

۱

پہلا شعر:۔ سورج نے اپنی شعاعوں سے یہ کہا کہ اگرچہ تم عرصۂ دراز سے دنیا اور دنیا والوں پر فیضان کی بارش کر رہی ہو لیکن وہ تمہاری کوئی قدر نہیں کرتے۔

دوسرا شعر:۔ تم مدتوں سے فضا میں آوارہ ہو لیکن دنیا والے تمہارے ساتھ بے مہری کا سلوک کر رہے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ نہ تمہیں ریت کے ذرّوں پر چمکنے میں راحت نہ پھولوں کا طواف کرنے سے کوئی فائدہ ہے۔

چوتھا شعر:۔ اس لئے تم سب کی سب چمنستان و بیابان و باغات پر فیض[1] سماوی نازل کرنا بند کر دو اور میری آغوش میں واپس آجاؤ۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب دنیا تمہاری قدر نہیں کرتی تو تم بھی دنیا کو فائدہ پہنچانا چھوڑ دو۔ یہ پہلا حصّہ سورج کی ناامیدی کا بیان کرتا ہے۔ چنانچہ

---

[1] میں نے یہ لفظ مجاز کے طور پر استعمال کیا ہے۔

شعاعیں آفتاب کے حکم کی تعمیل کرتی ہیں۔

۲

آفاق کے ہر گوشہ سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اُجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذتِ نظّارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالم لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

۲

پہلا شعر:۔ اور دنیا میں مایوسی اور ناامیدی (Despondency) کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے ہر شخص ترقی کے امکانات سے مایوس ہو کر کہتا ہے کہ

دوسرا شعر:۔ مغرب میں اجالا ممکن نہیں ہے یعنی مغربی قومیں مادہ پرستی میں اس درجہ منہمک ہو چکی ہیں کہ اب ان کی نجات کی کوئی امید نہیں ہے انہوں نے اللہ سے منہ موڑ کر مشینوں کو اپنا سہارا بنا لیا ہے اور صرف

مادّی ترقی کو مقصدِ حیات سمجھ لیا ہے۔

تیسرا شعر:۔ اب رہیں مشرقی قومیں تو اگرچہ وہ تاریکی میں نہیں ہیں اور لذّتِ نظارہ سے لطف اندوز ہو رہی ہیں یعنی ان کا ایمان خدا پہ ضرور ہے لیکن ان میں کوئی حرکت یا جدوجہد نظر نہیں آتی۔

چوتھا شعر:۔ اس شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ مغربی اقوام ایمان سے اور مشرقی اقوام عمل سے محروم ہیں۔ اندریں حالات شعاعوں نے سورج سے کہا کہ اے آفتاب واقعی اس دنیا میں ہمارا چمکنا بے سود ہے تو ہم کو ضرور اپنے سینہ میں پوشیدہ کرلے۔

۳

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشمِ مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بے گانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر ہو
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

(❖)

۳

پہلا شعر:- جب شعاعوں نے یہ بات آفتاب کی خدمت میں عرض کی تو ایک شعاع نے جو چمک میں تو حور کی آنکھ کو شرماتی تھی اور بیتابی میں سیماب سے بھی بڑھی ہوئی تھی آفتاب سے عرض کیا کہ میں اہلِ عالم کی بہبود سے نا امید نہیں ہوں

دوسرا شعر:- اس لئے جب تک مشرقی ممالک مغربی اقوام کی گرفت سے آزاد نہ ہو جائیں میں برابر اپنی روشنی سے نا امیدی کے اندھیرے

کو دور کرتی رہوں گی۔

تیسرا شعر:۔ اور جب تک ہندوستانی بیدار نہیں ہو جائیں گے میں ہندوستان کی تاریک فضا کو ترک نہیں کروں گی بلکہ نہایت استقلال کے ساتھ اس تاریک فضا میں لوگوں کو امید کا پیغام دیتی رہوں گی کیونکہ

چوتھا شعر:۔ ہندوستان تمام ایشیائی اقوام کی امیدوں کا مرکز ہے اور اقبال نے اسی سرزمین کو اپنے اشکوں سے سیراب کیا ہے اور اسی ملک کے باشندوں کو انسانیت کے مقام پر پہنچنے کا پیغام دیا ہے۔

پانچواں شعر:۔ اسی ملک کی خاک سے چاند اور پروین کی آنکھیں روشن ہیں اور اسی ملک کی زمین کا ہر سنگریزہ موتی سے بھی بڑھ کر قیمتی ہے۔

چھٹا شعر:۔ اس سرزمین نے بڑے بڑے فلاسفہ اور حکماء پیدا کئے ہیں[1]۔

ساتواں شعر:۔ افسوس ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کی محفل میں مذہب کا ساز بڑی دلکشی کے ساتھ بجتا رہتا تھا اور ہندو اور مسلمان دونوں اپنے اپنے مذہب کے پرستار تھے اور دلوں میں خوفِ خدا رکھتے تھے۔

آٹھواں شعر:۔ لیکن اب یہ کیفیت ہے کہ برہمن تو بت خانہ کے

---

[1] اشارہ ہے کہ گوتم۔ مہاویر۔ کپل۔ جمینی۔ دیاس۔ بدریان۔ بہرتری۔ اور ہری شنکر آچاریہ۔ دلبھ آچاریہ اور دوسرے حکما کی طرف جو ہندوستان کی سرزمین میں پیدا ہوئے۔

دروازہ پر سو رہا ہے اور مسلمان مسجد کے اندر اپنی تقدیر کو رو رہا ہے ایک غافل ہے دوسرا عمل سے بیگانہ ہے اور نتیجہ ان دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے یعنی اغیار کی غلامی۔

نواں شعر:۔ پس میں تو مشرقی اقوام سے نا امید ہوں نہ مغربی اقوام سے بلکہ دونوں کو راہ راست دکھاؤں گا۔

اس نظم کا مطلب یہ ہے کہ اقبالؔ مسلمان کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اٹھو! مایوسی کے جال سے نکلو! اور مشرق اور مغرب دونوں کو اسلام کا زندگی بخش پیغام پہنچاؤ! کیونکہ اسلام ہی وہ سچا دین ہے جو مشرق اور مغرب کے تمام امراض کا مداوا کر سکتا ہے۔

نوٹ:۔ جن لوگوں نے اقبال کے کلام کا بانگ درا سے لے کر ارمغان حجاز تک مطالعہ کیا ہے ان پر یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ اقبال کو ہندوستان سے بہت محبت تھی اور وہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی کا بھلا چاہتے تھے۔

امیرؔ

مقابلہ تو زمانے کا خوب کرتا ہوں
اگرچہ میں نہ سپاہی ہوں نے امیرِ جنود
مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرود
جبینِ بندۂ حق میں نمود ہے جس کی
اسی جلال سے لبریز ہے ضمیرِ وجود
یہ کافری تو نہیں کافری سے کم بھی نہیں
کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود
غمیں نہ ہو کہ بہت دور ہیں ابھی باقی
نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہرِ کبود

(٭)

○ ریاض منزل (دولت کدہ سر راس مسعود) بھوپال میں لکھے گئے۔

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے مسلمانوں کو دوسرے انداز سے رجائیت کا پیغام دیا ہے۔ اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ دنیا محض عناصر کا کھیل نہیں ہے اس کی تخلیق بلا مقصد نہیں ہوئی ہے اگرچہ بعض پہلوؤں سے ہمیں اس میں نقائص نظر آتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ دنیا بہتری کی طرف حرکت کر رہی ہے۔

اقبال نہ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ دنیا مصیبت کا گھر ہے اور اس میں سراسر بدی ہی بدی ہے اس لئے اصلاح کی کوشش بے سود ہے اس نظریہ کو فلسفہ کی اصطلاح میں قنوطیت (Pessimism) کہتے ہیں۔

اور نہ یہ کہتے ہیں کہ یہ دنیا سراسر خیر و برکت ہے کہیں کوئی نقص یا برائی نہیں ہے اس لئے اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس کو رجائیت یعنی (Optimism) کہتے ہیں۔

بلکہ ان کی پوزیشن اِن دونوں مذہبوں کے بین بین ہے یعنی وہ یہ کہتے ہیں چونکہ اللہ نے یہ دنیا ایک مقصد کے لئے بنائی ہے اس لئے بتدریج اصلاح پذیر ہے اور انجام کار نیکی بدی پر غالب آجائے گی۔ یہ بھی رجائیت ہی کی ایک قسم ہے اور اسے فلسفہ کی اصطلاح میں (Meliorism) کہتے ہیں جس کے لئے ابھی تک اردو میں کوئی خاص اصطلاح وضع نہیں کی گئی ہے۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ میں نہ سپاہی ہوں نہ فوج کا سردار ہی ہوں لیکن اللہ کے فضل و کرم اور ان وعدوں پر جو اس نے قرآن مجید میں مومنوں سے کئے ہیں۔ یقین رکھتا ہوں اس لئے باوجود بے سروسامانی زمانہ کی

پیدا کردہ مشکلات کا خوب مقابلہ کرتا ہوں

دوسرا شعر:- لوگ کہتے ہیں میں شاعر ہوں۔ ممکن ہے کہ یہ بات صحیح ہو میں تو اتنا جانتا ہوں کہ فطرت نے مجھے ذکر و فکر اور جذب و سرود عطا کیا ہے اور میں انہیں چاروں عطیات فطرت کو کلام موزوں کے ذریعہ سے دنیا کے سامنے پیش کرتا رہتا ہوں۔

تیسرا شعر:- بندۂ حق یعنی مردِ مومن کی پیشانی سے جو جلال ٹپکتا ہے وہ صرف اس کی پیشانی میں محدود نہیں ہے بلکہ ضمیرِ وجود اسی جلال سے لبریز ہے یعنی کائنات کے ہر ذرّہ میں وہ جلال پوشیدہ ہے (کیونکہ وجود اسی صفتِ جلال پر موقوف ہے) پس اے مسلمان! تو اللہ کی صفتِ تخلیق کا مشاہدہ ہر ذرہ میں کر سکتا ہے۔

دوسرا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ جلال وجود کی اصل ہے (ضمیرِ وجود کے معنی ہیں وجود کی اصل حقیقت۔) اس لئے اگر تو اپنے وجود کو دنیا پر واضح کر دے یعنی دنیا والوں کو اپنے وجود کا یقین دلا دے تو تیرے اندر بھی شانِ جلال پیدا ہو سکتی ہے یعنی تو بھی بندۂ مومن بننے کی کوشش کر۔

چوتھا شعر:- میں اسے کافری تو نہیں کہہ سکتا لیکن میری نظر میں یہ بات کفر سے کم بھی نہیں کہ مسلمان جسے مردِ حق ہونا چاہئے اللہ سے غافل ہو کر حاضر و موجود کا غلام ہو جائے یعنی دنیا کی دلچسپیوں اور نعمتوں کی طرف متوجہ ہو کر اپنی حیات کے مقصد سے غافل ہو جائے اس کو ایک مثال سے واضح کر دوں فرض کیجئے آپ نے اپنے ملازم کو باغ کی حفاظت کے لئے مقرر کیا لیکن جب وہ

نگرانی کر رہا تھا اُسے ایک عورت دکھائی دی اور مستقبل کے انعامات اور آقا کی یعنی آپ کی خوشنودی کی گراں بہا دولت سے غافل ہو کر اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ (بلکہ وہ اپنے مقصدِ حیات (نگرانی) سے غافل ہو کر عورت کے عشق میں گرفتار ہو گیا) اور باغ کو اللہ پر چھوڑ کر اس کے حصول میں منہمک ہو گیا (اور جب وہ باغ سے چلا گیا تو لوگوں نے پھل چرانے اور جانوروں نے پودوں کو پامال کر دیا) تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ شخص گرفتارِ حاضر و موجود ہو گیا۔

پانچواں شعر:۔ اے مسلمان! اگر تیرے ہاتھ سے حکومت نکل گئی تو رنجیدہ مت ہو۔ کیونکہ دولت اور حکومت کسی قوم کی موروثی ملکیت نہیں ہے انشاء اللہ نیا دور آنے والا ہے ایسا دور جس میں تجھے پھر یہ دولت گم گشتہ مل جائے گی پس تو ہمت نہ ہار۔ ترقی کے لئے کوشش کئے جا۔

(٭)

نگاہِ شوق

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا
کہ ذرّہ ذرّہ میں ہے ذوقِ آشکارائی
کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی

اِسی نگاہ سے محکوم قوم کے فرزند
ہوئے جہاں میں سزاوارِ کارفرمائی
اِسی نگاہ میں ہے قاہری و جبّاری
اِسی نگاہ میں ہے دلبری و رعنائی
اِسی نگاہ سے ہر ذرّہ کو جنوں میرا
سکھا رہا ہے رہ و رسمِ دشت پیمائی
نگاہِ شوق میسّر نہیں اگر تجھ کو
ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی

شرح مشکلات

اس دلکش نظم میں اقبال نے نگاہِ شوق یا جذبۂ عشق کے ثمرات بیان کئے ہیں اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار ہو کر اپنی خودی کو مرتبۂ کمال پر پہنچائے تو پہلے اس کے اندر ایک انقلاب رونما ہو جاتا ہے پھر وہ دنیا میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو بار بار واضح طور پر بیان کیا ہے کہ جب تک مسلمان اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں انقلاب پیدا نہیں کریں گے وہ دنیا میں کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ اس کائنات کی تخلیق اس نہج پر ہوئی ہے کہ اس کی باطنی خوبیاں ہر وقت ظاہر ہوتی رہتی ہیں ہر شئے اپنے مقام کو حاصل کرتا

چاہتی ہے اور اقبالؔ نے اس مقام کے حصول کی کوشش کو "ذوقِ آشکارائی" سے تعبیر کیا ہے۔

دوسرا شعر:۔ پس اگر نگاہِ شوق بھی شریک بینائی ہو جائے یعنی اگر مسلمان عشقِ رسول کی بدولت اپنی باطنی حس کو جسے اصطلاح میں بصیرت کہتے ہیں بیدار کرلے تو اُسے یہ دنیا صرف عناصر کا کھیل نظر نہیں آئے گی بلکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائے گا کہ یہ کائنات اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ مومن اس کو اپنے تصرف میں لاکر اس میں اللہ کے قانون کو نافذ کرے اور اس طرح اس دنیا کو بنی آدم کے لئے رحمت بنادے۔

تیسرا شعر:۔ جب یہ نگاہ پیدا ہو جاتی ہے تو محکوم قوم کے افراد حکمرانی کے اہل بن جاتے ہیں اور دنیا ان کے قدم چومنے لگتی ہے۔

چوتھا شعر:۔ اسی نگاہِ شوق کی بدولت مسلمان میں قاہری یعنی رنگِ جلال اور دلیری یعنی رنگِ جمال پیدا ہو جاتا ہے۔ قاہری کی بدولت وہ دنیا میں حکومت حاصل کرتا ہے اور دلیری کی بدولت اس کا وجود اہل دنیا کے حق میں رحمت بن جاتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ اسی نگاہ کی بدولت مسلمان میں دشت پیمائی یعنی جدوجہد کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لئے وہ ہر وقت باطل سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ اے مخاطب! اگر تیرے اندر نگاہِ شوق پیدا نہ ہو یعنی اگر تیرے اندر اسلام کو بلند کرنے کا جذبہ پیدا نہ ہو تو تیرا وجود بالکل

بیکار ہے بلکہ تیرا وجود اسلام کی رسوائی کا موجب بن جائے گا۔

نوٹ:۔ موجودہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اس شعر کی صداقت پر گواہ ہے بلاشبہ آج ہمارا وجود اسلام کے دامن پر ایک بدنما دھبا بنا ہوا ہے۔

اہلِ ہنر سے

مہر و مہ و مشتری چند نفس کا فروغ
عشق سے ہے پائدار تیری خودی کا وجود
تیرے حرم کا ضمیر اسود و احمر سے پاک
ننگ ہے تیرے لئے سرخ و سپید و کبود
تیری خودی کا غیاب معرکۂ ذکر و فکر
تیری خودی کا حضور عالمِ شعر و سرود
روح اگر ہے تری رنجِ غلامی سے زار
تیرے ہنر کا جہاں دیر و طواف و سجود
اور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو
تیری سپہ انس و جن! تو ہے امیرِ جنود

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے اہل ہنر کو خودی کے مرتبہ اور مقام کسے آگاہ کیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ آفتاب۔ ماہتاب۔ اجرام فلکی اور دوسری چیزیں مثلاً زمین و آسمان یہ سب عارضی اور فانی ہیں لیکن خودی اگر عشق کی بدولت پختہ ہو جائے تو لازوال ہو جاتی ہے پس تو فانی کو چھوڑ کر باقی کے حصول کی کوشش کر۔

دوسرا شعر:۔ چونکہ دین یعنی اسلام کی روح انسانوں میں نسلی امتیاز روا نہیں رکھتی بلکہ مساوات نسلِ انسانی کا سبق دیتی ہے اگر کوئی صاحبِ فن (آرٹسٹ) اپنے فن سے نسلی امتیازات کے تصوّر کو تقویت دیتا ہے تو وہ سچا آرٹسٹ نہیں ہے۔

تیسرا شعر:۔ تو اپنی خودی کی عظمت کا اس بات سے اندازہ کر سکتا ہے کہ جب تو کائنات میں غور کرتا ہے تو ذکر و فکر کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے یعنی کائنات میں جو قوانین نافذ ہیں تو ان کا مطالعہ کرتا ہے اور نئی چیزیں دریافت کرتا ہے یہ فکر ہے پھر تو صانعِ کائنات کی ہستی سے آگاہ ہو کر اس کی اطاعت کرتا ہے یہ ذکر ہے اور یہ دونوں باتیں ذکر و فکر بذات خود نہایت قیمتی بلکہ خودی کی ترقی کے لئے اشد ضروری ہیں۔

اور جب تیری خودی کو اللہ تعالیٰ کی حضوری نصیب ہوتی ہے تو اس پر فیضانِ سماوی کا نزول ہوتا ہے اور وہ فیضان عموماً شاعری یا نغمہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اقبال نے خودی کی دو حالتیں بیان کی ہیں۔ پہلی حالت وہ ہے جب خودی کائنات کی طرف متوجہ ہوتی ہے اس کو خودی کا غیاب کہا ہے اور دوسری حالت وہ ہے جب خودی اللہ کی طرف متوجہ ہوتی ہے یہ حالت خودی کا حضور ہے اور یہ دونوں صورتیں انسان کے لئے مفید ہیں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

چوتھا شعر:۔ لیکن اگر تو غلامی کی لعنت میں گرفتار ہے (اور مشرقی ممالک کے تمام اہل ہنر کسی نہ کسی قسم کی غلامی میں مبتلا ہیں) تو یقیناً تیرا آرٹ غلامی کا علمبردار ہوگا اور بت پرستی کی تعلیم دے گا۔ بت پرستی سے مراد وہی دوسروں کی غلامی ہے۔

پانچواں شعر:۔ اور اگر تیری روح اپنی ذاتی شرافت سے آگاہ ہے بالفاظِ دگر اگر تیری خودی بیدار ہے تو پھر ساری کائنات تیری غلامی کرے گی اور تو جن اور انسان دونوں پر حکمراں ہوگا۔

غزل

دریا میں موتی! اے موجِ بیباک
ساحل کی سوغات؟ خار و خس و خاک
میرے شرر میں بجلی کے جوہر
لیکن نیستاں تیرا ہے نمناک
تیرا زمانہ، تاثیر تیری
ناداں! نہیں یہ تاثیرِ افلاک
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیے ہیں تقدیر کے چاک
کامل وہی ہے رندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منّتِ تاک
رکھتا ہے اب تک مئے خانۂ شرق
وہ مَے کہ جس سے روشن ہو ادراک
اہلِ نظر ہیں یورپ سے نومید
ان اُمّتوں کے باطن نہیں پاک

شرح مشکلات اس غزل میں اقبال نے بعض حقائق و معارف بیان کئے ہیں۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ :-

پہلا شعر:- اے مردِ مسلماں! اگر موتیوں کی آرزو ہے تو مسائل کی زندگی سے قطع تعلق کر کے تجھے مشکلات کا مقابلہ کرنا ہوگا اور اگر تو عافیت کی زندگی بسر کرنے کا آرزومند ہے تو پھر موتیوں کا خیال چھوڑ دے ساحل کے باشندوں کو تو (یعنی بلا مشقت) صرف خس و خاشاک حاصل ہو سکتا ہے۔

دوسرا شعر:- میرے کلام میں یہ تاثیر ہے کہ تیری زندگی میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے لیکن افسوس کہ تیری خودی مردہ ہو چکی ہے اس لئے جس طرح گیلے پتے جل نہیں سکتے اسی طرح تیرے اندر میرے کلام سے کوئی حرکت یا زندگی پیدا نہیں ہو سکتی۔

تیسرا شعر:- تیرا زمانہ یا تیری زندگی بس ویسی ہی ہوگی جیسی تاثیر تو اس میں پیدا کر دے اگر تو جد و جہد کرے گا یقیناً کامیاب ہوگا لیکن اگر تو عمل سے کنارہ کش ہو کر کسی حجرہ میں بیٹھ جائے گا تو یقیناً تھوڑے دنوں کے بعد دوسروں کا دست نگر بن جائے گا۔ الغرض تیری زندگی پر افلاک یا ستارے حکمران نہیں ہیں بلکہ تو خود اپنی کامیابی یا ناکامی کا ذمہ دار ہے۔

چوتھا شعر:- عام طور سے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ جنون (عورت کا عشق) انسان کو گریبان چاک کرنے پر راغب کرتا ہے لیکن اقبال کہتے ہیں کہ ایک جنون (عشقِ رسولؐ) ایسا بھی ہے جو گریبان در کنار۔ تقدیر کے چاک کو بھی سی سکتا ہے یعنی بگڑی ہوئی تقدیر کو بنا سکتا ہے۔

نوٹ:۔ اس شعر کا لطف چونکہ تشریح سے ظاہر نہیں ہو سکتا اس لئے میں نے قصداً اس کی وضاحت سے اجتناب کیا ہے۔

پانچواں شعر:۔ عام طور سے لوگ شراب پی کر مست ہوتے ہیں لیکن یہ رندی کا کمال نہیں ہے اقبال کی نظر میں کمال یہ ہے کہ آدمی بے پیئے مست ہو جائے بلکہ مست رہے اور یہ کمال مرشد کی صحبت سے حاصل ہو سکتا ہے شراب کا نشہ تھوڑی دیر بعد اتر جاتا ہے لیکن محبت الٰہی کا نشہ انگوری شراب کا محتاج نہیں ہے اور جب ایک دفعہ آدمی اس شراب سے مست ہو جاتا ہے تو پھر جیتے جی یہ نشہ نہیں اترتا۔

چھٹا شعر:۔ مشرق کے میخانوں میں اب تک وہ شراب موجود ہے جس سے عقل روشن ہو سکتی ہے یعنی اسلام کی تعلیمات اگر کسی مرشد سے حاصل کی جائیں تو انسان حقیقی معنوں میں عالم دین بن سکتا ہے مغربی علوم سے عقل انسانی تاریک ہو جاتی ہے یعنی انسان اللہ اور اس کے رسولؐ سے بیگانہ ہو جاتا ہے لیکن قرآن مجید انسانی عقل کو نور ایمان سے منور کر سکتا ہے

ساتواں شعر:۔ اہل نظر یعنی اللہ والے یورپ کے مستقبل سے ناامید ہو چکے ہیں یعنی ان کی رائے میں اس خطہ کی بربادی یقینی ہے کیونکہ یہ خطہ اب ان اقوام سے معمور ہے جن کے قلوب اللہ کی محبت سے بالکل خالی ہو گئے ہیں بلکہ یہ قومیں مادہ پرستی میں مبتلا ہو کر اللہ سے اپنا تعلق یکسر منقطع کر چکی ہیں۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے یہ شعر ۱۹۳۵ء میں لکھا تھا اس کی جزوی

صداقت تو دوسری جنگ عظیم میں واضح ہو چکی ہے اب مکمل تباہی تیسری جنگ میں ہو جائے گی جو عنقریب شروع ہونے والی ہے۔ بقول شخصیکہ۔

ع پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے

وجود

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود
کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود
گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
دائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود
مکتب و میکدہ جز درسِ نبودن ندہند
بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ہمیں وجود انسانی کے مقام سے آگاہ کیا ہے یعنی یہ کہ اگر انسان اپنی خودی کو پختہ کرلے تو اس کا وجود غیر فانی ہو سکتا ہے یہاں انہوں نے وجود کو خودی کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ:۔

پہلا شعر:۔ اے مخاطب! تیری دنیاوی زندگی عارضی اور

فانی ہے اس لئے شاید تجھے یہ خیال ہو کہ میرا وجود بھی عارضی اور فانی ہے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے وجود کے مختلف مقامات ہیں۔ چیونٹی مکڑی مچھر بلکہ اونٹ ہاتھی اور انسان وجود کے اعتبار سے سب یکساں ہیں یعنی وجود سب میں مشترک ہے چیونٹی بھی موجود ہے انسان بھی موجود ہے لیکن چیونٹی یا ہاتھی کا وجود اپنے اندر شانِ عبدیت نہیں رکھتا یہ شرف انسانی وجود کو حاصل ہے کہ اگر انسان اپنی خودی کو مستحکم کرلے تو اس کا وجود غیر فانی یا ابدی ہو جائے گا۔

دوسرا شعر:- پس اگر تیرے ہنر میں خواہ وہ شاعری ہو یا مصوری یا موسیقی تعمیر خودی کا جوہر موجود نہیں تو یہ سارے فنون لطیفہ بالکل بیکار ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ خودی معیار حسن و قبح ہے اور آرٹ کو خودی کا خادم ہونا چاہئے مثلاً وہ شاعری مذموم ہے جو مسلمان کے اندر جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا نہ کرے۔

واضح ہو اگر اقبالؔ کا پیش کردہ معیار صحیح ہے تو پھر انہیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ لاہور اور کراچی میں جس قدر مشاعرے منعقد ہوتے ہیں اور ماشاء اللہ ہر روز ہوتے ہیں یہ سب قوم کے حق میں افیون ہیں۔ وائے بر حال ما کہ دھلی اور لکھنؤ کا حسرتناک انجام دیکھنے کے بعد بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلیں۔

تیسرا شعر:- اے مسلمان! یاد رکھ کہ مکتب و کالج اور میکدہ خانقاہ آج کل دونوں مقامات میں نفی خودی کا درس دیا جاتا ہے اس لئے اگر تو ابدی زندگی کا طالب ہے تو کسی مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھ کر ہمیشہ زندہ

رہنے کا طریقہ سیکھ تاکہ تو دنیا میں بھی نہ تنہا رہ سکے اور مرنے کے بعد بھی زندہ رہ سکے۔

سرود

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرودِ رمے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے
دل کیا ہے؟ اس کی مستی و قوت کہاں سے ہے
کیوں اس کی اک نگاہ الٹتی ہے تختِ کے
کیوں اس کی زندگی سے ہے اقوام میں حیات
کیوں اس کے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے
کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رے
جس روز دل کی رمز مغنّی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ صرف وہ نغمہ حلال ہے جو دل کو بیدار کر دے اور دل میں محبت الٰہی کا جذبہ پیدا کر دے۔

پہلا شعر:- غور کرو کہ بانسری کی آواز میں یہ شراب کا سرور کہاں سے آیا؟ حقیقت یہ ہے کہ اس کی اصل (یعنی مستی و سرور کی بنیاد) چوب نَے یا بانسری نہیں ہے بلکہ نَے نواز کا دل ہے۔

دوسرا شعر:- اب اس بات پر غور کرو کہ دل کیا چیز ہے؟ کیا وہ مضغۂ گوشت کا نام ہے؟ اس میں یہ مستی اور سرور کہاں سے آیا جو نَے نواز۔ نَے میں منتقل کر دیتا ہے آخر یہ بانسری کی آواز اس قدر دلکش کیوں ہوتی ہے کہ انسان تو خیر انسان ہے۔ حیوان بھی اس سے متاثر ہو جاتے ہیں آخر ایک معمولی سا صاحب دل تخت کیخسرو کو کس طرح تہ و بالا کر دیتا ہے اور بڑے بڑے بادشاہ اس کو دیکھ کر کیوں لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔؟

تیسرا شعر:- پھر یہ غور کرو کہ قوموں کی زندگی دل کی زندگی پر کیوں منحصر ہے؟ اور اسے ایک پہلو پر قرار کیوں نہیں ہے۔ صاحبدل پر مختلف حالات کیوں طاری ہوتے رہتے ہیں؟ وہ ہر وقت ہنگامہ کیوں پسند کرتا ہے؟

چوتھا شعر:- پھر اس پر بھی غور کرو کہ (دل) صاحبدل کو کیا چیز عطا کر دیتا ہے کہ اس کی نظر میں بادشاہ اور بادشاہت کسی چیز کی کوئی وقعت نہیں رہتی وہ بادشاہوں کو خاطر میں نہیں لاتا لیکن اس میں یہ سطوت اور رعب و دبدبہ کہاں سے آجاتا ہے۔

پانچواں شعر:- پس معلوم ہوا کہ (دل) اس کائنات میں سب سے بڑی قوت متحرکہ (Motive Force) ہے اور لامحدود توانائی کا خزانہ ہے اگر دل زندہ ہو جائے تو قومیں ہی زندہ نہیں ہو جاتیں ان کے افراد بھی معجزات

دکھانے لگتے ہیں اور بعض اوقات ایک فرد پوری جماعت پہ بھاری نظر آتا ہے۔
پس اشد ضروری ہے کہ مغنی نغمہ سرائی سے پہلے نغمہ کی اصل یا اس کے سرچشمہ سے
آگاہی حاصل کرے یعنی دل کے اسرار و رموز سے واقف ہو جائے اور اگر
وہ اس حقیقت سے خبردار ہو جائے کہ دل سرچشمۂ حیات ہے تو پھر اس کی موسیقی
قوموں کے لئے خود پیام حیات ہو جائے گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو یہی موسیقی بنی آدم
کے حق میں پیام موت بن جائے گی اور تاریخ گواہ ہے کہ بن جاتی ہے۔

نوٹ :۔ ہندو پاک کا مسلمان تو چکّی کے دو پاٹوں میں پس رہا ہے
نیچے شاعری کا پاٹ ہے اور اوپر موسیقی کا پاٹ۔

(*)

نسیم شبنم

نسیم

انجم کی فضا تک نہ ہوئی میری رسائی
کرتی رہی میں پیرہنِ لالہ و گل چاک
مجبور ہوئی جاتی ہوں میں ترکِ وطن پہ
بے ذوق ہیں بلبل کی نواہائے طربناک
دونوں سے کیا ہے تجھے تقدیر نے محروم
خاکِ چمن اچھی کہ سراپردۂ افلاک

شبنم

کھینچیں نہ اگر تجھ کو چمن کے خس و خاشاک
گلشن بھی ہے اک سرِّ سراپردۂ افلاک

—(:)—

شرح مشکلات اقبالؔ نے اس نظم میں نسیم اور شبنم کے پردہ میں عالم ناسوت اور عالم ملکوت یا انسان اور فرشتہ کے باہمی رشتہ کو واضح کیا ہے انگریزی زبان میں اس اسلوب کو ——— (ALLEDORY) کہتے ہیں جس کا ترجمہ اس شعر سے کر سکتے ہیں۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اس نظم میں بظاہر باد نسیم اور شبنم کا مکالمہ درج ہے لیکن نسیم اور شبنم سے شاعری کی مراد کچھ اور ہے یعنی حدیث دیگراں کے پردہ میں سرِّ دلبراں بیان کیا ہے۔

نسیم

پہلا شعر:۔ نسیم نے شبنم سے کہا کہ میں ساری عمر غنچوں کو شگفتہ کرتی رہی یعنی فضائے ارضی میں زندگی بسر کی اور فضائے انجم تک میری رسائی نہ ہو سکی

دوسرا شعر:۔ لیکن مجھے بلبلوں کی نغمہ سرائی میں کچھ لطف نہیں

آتا اس لئے میں ترک وطن کرنا چاہتی ہوں۔

تیسرا شعر:- اے شبنم تجھے تقدیر الٰہی نے دونوں عالموں سے آگاہی بخشی ہے تو مجھے بتا کہ "خاکِ چمن" اچھی یا فضائے آسمان اچھا۔

شبنم

چوتھا شعر:- نسیم نے یہ سوال سن کر شبنم کو جواب دیا کہ اے شبنم! اگر تو اپنی نظر کو بلند اور مقاصد کو ارفع کرے تو گلشن بھی افلاک کا ہم رتبہ ہے اس میں بھی وہی عظمت پوشیدہ ہے جو سراپردۂ افلاک میں نظر آتی ہے ضرورت اس تیز نظر کے پیدا کرنے کی ہے جو گلشن کی عظمت مخفی کو دیکھ سکے۔

اس تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بری ہے یہاں رہ کر خدا نہیں مل سکتا اس لئے ترک وطن یعنی ترک دنیا کرنا ضروری ہے فرشتہ جواب دیتا ہے کہ اگر انسان دنیا کی فانی دلچسپیوں (جسے خس و خاشاک گلشن سے تعبیر کیا گیا ہے) منہمک ہو کر مقصدِ حیات سے غافل نہ ہو جائے تو ترک دنیا کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ دنیا میں رہ کر بھی انسان اللہ سے تعلق پیدا کر سکتا ہے۔ گلشن بھی افلاک ہی کا سراپا بھید ہے۔ یعنی انسان عالم ناسوت میں رہ کر بھی عالم ملکوت کے رہنے والوں میں شامل ہو سکتا ہے چنانچہ حضراتِ انبیاء اور اولیاء کی زندگیاں اقبال کے اس دعویٰ پر شاہد عادل ہیں۔

———(:)———

اہرامِ مصر

اس دشتِ جگر تاب کی خاموش فضا میں
فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کیے تعمیر
اہرام کی عظمت سے نگونسار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر
فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو
صیاد ہیں مردانِ ہنرمند کہ نخچیر!

—(❖)—

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ آرٹسٹ اپنے آرٹ کو مرتبہ کمال پر اس وقت پہونچا سکتا ہے جب وہ اپنے آپ کو فطرت کی تقلید سے آزاد کرلے۔ دوسرے لفظوں میں آرٹ کے اندر صفت دوام اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس کے اندر جدّت (originality) ہو۔

پہلا شعر:۔ مصر کے ریگستانوں پر نظر کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کی خاموش فضا میں فطرت نے صرف ریت کے ٹیلے بنائے ہیں۔ کل بگڑ جاتے ہیں۔

دوسرا شعر:- لیکن انسان نے جو اہرام (PYRAMIE) تعمیر کئے ہیں وہ نہایت عظیم الشان اور مستحکم ہیں ہزاروں سال سے بدستور قائم ہیں۔

تیسرا شعر:- پس ہنرمند کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ہنر کو فطرت کی غلامی سے آزاد کرلے یعنی اپنی ذاتی کوشش سے اپنے مصنوعات کو پائیداری عطا کرے یاد رکھو! آرٹسٹ۔ نیچر (صیاد نہیں ہوتا بلکہ خود صیاد ہوتا ہے) اور وہ اپنے آرٹ میں اپنے اجتہاد فکر سے رنگِ دوام پیدا کرتا ہے۔

—(:)—

مخلوقاتِ ہنر

ہے یہ فردوس نظر اہلِ ہنر کی تعمیر
فاش ہے چشمِ تماشا یہ نہانخانۂ ذات
نہ خودی ہے نہ جہانِ سحر و شام کے دور
زندگانی کی حریفانہ کشاکش سے نجات
آہ! وہ کافرِ بیچارہ کہ ہیں اس کے صنم
عصرِ رفتہ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات و منات
تو ہے میت! یہ ہنر تیرے جنازے کا امام
نظر آئی جسے مرقد کے شبستاں میں حیات

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے ہندوستان کے ان ارباب ہنر پر تنقید کی ہے جو اپنے اندر کوئی تخلیقی قوت نہیں رکھتے اور اس لئے شاعری مصوری اور موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ میں کوئی جدت پیدا نہیں کر سکتے یہی وجہ ہے کہ ان کا تمام سرمایۂ فن توارد نقالی اور سرقہ کی مختلف صورتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اس نظم میں طنز کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ کہتے ہیں کہ۔

پہلا شعر:۔ ہمارے ملک کے ارباب ہنر اپنے ہنر کے جو نمونے پیش کرتے ہیں وہ اپنے اندر کوئی جدّت نہیں رکھتے اور ان پر نظر ڈالنے سے ان ہنرمندوں کی ذہنیت بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔

دوسرا شعر:۔ ان کے کمالات ہنر میں ان کی ذاتی یا شخصی خصوصیت یعنی انفرادیت نظر آتی ہے نہ زندگی سے مطابقت پائی جاتی ہے۔ ان کے آرٹ سے دیکھنے والوں کے اندر جدوجہد یا مشکلاتِ زندگی پر غالب آنے کا کوئی جذبہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔

تیسرا شعر:۔ افسوس! ہمارے آرٹسٹ ابھی تک پرانے زمانہ کے لات ومنات کی پرستش کر رہے ہیں مثلاً شاعری میں وہی معشوق کی کج ادائی وہی فراق کی راتیں اور وہی رقیب کے طعنے وغیرہ وغیرہ یہی حال دوسرے فنون کا ہے الغرض ہمارے فنکار ہر معاملہ میں کورانہ تقلید کر رہے ہیں اپنی ذاتی کوشش سے نئی راہیں پیدا نہیں کرتے۔

چوتھا شعر:۔ اے ہندی فنکار! دراصل تیری خودی مردہ ہو چکی

ہے (غلامی اور کورانہ تقلید کی بنا پر) اسی لئے تیرا ہنر تیری موت کا اعلان کر رہا ہے اور تجھ کو گمنامی کی طرف لے جا رہا ہے یعنی جب تو طبعیاتی (طبّی) زاویۂ نگاہ سے مرجائے گا تو تیرا نام چند روز کے بعد مٹ جائے گا کیونکہ دنیا میں انہی شاعروں اور مصوّروں کا نام باقی رہتا ہے جو اچھوتا کارنامہ پیش کرتے ہیں۔

(٭)

اقبال

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش
حلّاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

(٭)

شرح مشکلات

اس مختصر نظم میں اقبالؔ نے بڑے بلیغ انداز سے اپنے کلام پر تبصرہ بھی کیا ہے اور اپنا مقام بھی واضح کیا ہے۔

۱۔ اسلوب بیان ایسا دلکش ہے کہ لفظوں سے اس کا بیان نہیں ہو سکتا بس یوں سمجھو کہ یہ نظم اقبال کی جدّت طرازی کا بہترین نمونہ ہے جدّت سے میری مراد ہے، بات کہنے کا سلیقہ؟ اور سچ پوچھو تو یہی چیز شاعری کی جان ہے

سچ کہا تھا غالبؔ نے کہ شاعری مضمون آفرینی کا نام ہے قافیہ پیمائی کا نام نہیں ہے۔ اس نظم میں لفظ (فردوس) کس قدر موزوں ہے شاعر نے اس لفظ سے ہمیں یہ بتا دیا کہ میں رومی۔ سنائی اور حلاج تینوں بزرگوں کو کیا سمجھتا ہوں۔ علاوہ بریں یہ لفظ ہم کو فوراً عالم رنگ و بو سے بلند کر کے فردوس میں پہنچا دیتا ہے جہاں نہ غلامی ہے اور نہ ضمیر فروشی نہ پالیسی (سیاست POLO) ہے نہ ڈپلومیسی (سیاست Diplomacy)

ب ۔ رومی۔ سنائی اور حلاج کا ذکر کر کے اقبالؔ نے ضمناً اپنا روحانی سلسلہ بھی بیان کر دیا انہوں نے اپنا شمار اسپنوزا اور ہیگل ارسطو اور کانٹ یا لطشہ اور برگسان کے زمرہ میں نہیں کیا بلکہ سنائی اور رومی کی شاگردی پر فخر کیا ہے۔

کلام اقبالؔ کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ اقبال کو ان تینوں بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی جس کا اظہار ان کی تصانیف سے جا بجا ہوتا ہے اور رومی کو تو انہوں نے اپنا مرشد اور رہنما قرار دیا ہے اور جس طرح مولانا رومؒ نے سنائی اور عطار کی اتباع پر فخر کیا ہے۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او
ما از پئے سنائی و عطار آمدیم

اسی طرح اقبالؔ نے اسرار خودی ۱۹۱۴ء سے لے کر ارمغان حجاز ۱۹۳۸ء تک ہر کتاب میں رومی کی شاگردی پر فخر کیا ہے بلکہ ہمیں بھی یہی مشورہ دیا ہے چنانچہ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں۔

پیر رومی را رفیق راہ ساز تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
ترا نکہ رومی مغز را داند ز پوست پائے او محکم فتد در کوئے دوست

بال جبریل کی اس نظم " سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا " پر جو مختصر تمہید اقبالؔ نے لکھی ہے اس سے ان کی اس گہری عقیدت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو ان کو حکیم سنائیؒ کے ساتھ تھی۔

ج :- اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اقبالؔ کے فلسفہ یا بنیادی خیالات یا تصورات کو مغربی حکماء سے ماخوذ سمجھتے ہیں وہ اقبال کو بالکل نہیں سمجھتے انہوں نے دراصل قرآن مجید اور احادیث رسولؐ اور ان کے بعد رومی اور دوسرے مسلمان صوفیائے کرام مثلاً امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خیالات سے استفادہ کیا ہے اور محض استفادہ ہی نہیں کیا بلکہ اس پر فخر کیا ہے چنانچہ ارمغان حجاز میں جو ان کی زندگی کے بالکل آخری زمانہ کا کلام ہے وہ خود اپنے آپ کو مثل رومیؒ قرار دیتے ہیں اور ہر دانشمند انسان اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو اگر کسی کا مثل قرار دے تو وہ اس شخص کی انتہائی عزت کرتا ہے بلکہ اس کی تقلید کو اپنے لئے باعث فخر و مباہات سمجھتا ہے۔

چو رومی در حرم دادم اذان من ازو آموختم اسرار جان من
بدور فتنۂ عصر کہن او بدور فتنۂ عصر رواں من

د :- چوتھی غور طلب بات یہ ہے کہ اس نظم میں اقبالؔ نے اپنا کارنامہ بھی بیان کر دیا ہے کہ میں نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے کیونکہ اسلام ہی وہ دین حق ہے جس نے سب سے پہلے دنیا کو خودی کی مخفی طاقتوں سے

آگاہ کیا اور چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خودی کمال کے انتہائی نقطہ پر پہنچ گئی تھی اسی لئے آپ ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہیں اب پڑھئے اس شعر کو

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰے سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

پہلا شعر:- فردوس میں ایک دن مولانا رومؒ حکیم سنائی سے یہ کہہ رہے تھے کہ افسوس! مشرقی ممالک ہنوز غلامی میں گرفتار ہیں۔

دوسرا شعر:- یہ سن کر حسین بن منصور حلاّج نے یہ کہا کہ یہ تو صحیح ہے کہ صدیوں سے کوئی خدائی کا رازداں پیدا نہیں ہوا ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ آخر کار ایک قلندرؒ (اقبال) نے خودی کا راز فاش کر دیا ہے انشاء اللہ اب مسلمان آزاد ہو جائیں گے۔

فنونِ لطیفہ

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مُغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ہمیں آرٹ کی غرض و غایت سے آگاہ کیا ہے کہ آرٹ کے اندر اگر باطل کو فنا کرنے کی قوت نہیں تو وہ آرٹ نہیں بلکہ محض تضیّعِ اوقات کا موجب ہے۔ واضح ہو کہ اقبال نے آرٹ کو خودی کا خادم قرار دیا ہے آج کل کے عریانی پسند کوتاہ نظر ادیب آرٹ کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں اور اس غلط خیال کا نتیجہ "خودی" کی تباہی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اقبال کی تعلیم یہ ہے کہ ہماری آخری وفاداری کا مرکز آرٹ نہیں بلکہ قرآن اور سنت نبوی کی روشنی میں خودی کی تکمیل ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ :۔

ا ۔ ہماری آخری وفاداری کا مرکز اللہ ہے۔

ب ۔ اللہ ہم سے یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے اندر اس کی نیابت کی اہلیت اور صلاحیت پیدا کریں یعنی دنیا میں اس کی حکومت قائم کریں۔ خلیفۃ اللہ کا حقیقی مفہوم یہی ہے۔ طاقت کے بغیر خلافت ایک لفظ ہے بے معنی اسی لئے ۱۹۲۴ء میں ترکوں کے خلیفہ کو پنشن دے کر رخصت کر دیا۔

ج ۔ نیابت یا خلافت کی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک ہم قرآن اور سنت نبوی کی روشنی میں اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک نہ پہنچا دیں پس آرٹ خودی کے تابع ہے آزاد نہیں ہے اور وہی آرٹ لائق تحسین ہے جو استحکامِ خودی میں معاون ثابت ہو سکے ۔

ع جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

پہلا شعر:۔ اے اہلِ نظر یعنی اے اربابِ ہنر! آرٹ کی تحسین کی صلاحیت پیدا کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن اگر تم آرٹ کی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے تو پھر تم اہل نظر نہیں ہو۔

دوسرا شعر:۔ آرٹ کا مقصد جذباتِ نفسانی کو برانگیختہ کرنا نہیں ہے جیسا کہ کارل مارکس اور فرائڈ کے مقلدین سمجھتے ہیں بلکہ خودی کے اندر پختگی کا رنگ پیدا کرنا۔

تیسرا شعر:۔ اگر انسانی خودی باطل کی دنیا میں تلاطم پیدا نہیں کر سکتی تو پھر اس میں اور گائے یا بیل کی خودی میں کیا فرق ہے ؟

چوتھا شعر:۔ ایسی شاعری اور موسیقی سے کیا فائدہ جس کی بدولت انسان کے اندر جد و جہد کا جذبہ پیدا نہ ہو اگر اقبال کا یہ معیار صحیح ہے تو مشاعرے اور قوالی دونوں قوم کے حق میں افیون سے کم نہیں ہیں ۔

پانچواں شعر:۔ یاد رکھو! جب تک کسی قوم میں فوق العادت کارنامے انجام دینے کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے وہ قوم دنیا میں سربلند اور حکمراں نہیں ہو سکتی پس جس آرٹ سے باطل کا مقابلہ کرنے یا دشمن پر غالب

آنے کی طاقت پیدا نہیں ہوتی وہ آرٹ نہیں ہے بلکہ اخلاق کو تباہ کرنے کا ذریعہ ہے۔

(٭)

صبحِ چمن

پھول

شاید تو سمجھتی تھی وطن دور ہے میرا
اے قاصدِ افلاک! نہیں! دور نہیں ہے

شبنم

ہوتا ہے مگر محنتِ پروانہ سے روشن
یہ نکتہ کہ گردوں سے زمیں دور نہیں ہے

صبح

مانندِ سحر صحنِ گلستاں میں قدم رکھ
آئے تہِ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے
ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش ولیکن
ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

(٭)

شرح مشکلات اس دلکش نظم میں اقبال نے گل شبنم اور صبح کے پردہ میں انسان کو چند نکتے سمجھائے ہیں۔

پھول

پہلا شعر:- پھول نے شبنم سے کہا کہ تو یہ سمجھتی تھی کہ میرا وطن (زمین) بہت دور ہے اس لئے شاید میں وہاں تک نہ پہنچ سکوں۔

شبنم

دوسرا شعر:- شبنم نے جواب دیا کہ تیرا یہ قول صحیح ہے کہ وطن دور نہیں ہے لیکن اس کی صداقت اس وقت تک آشکار نہیں ہو سکتی جب تک انسان محنت اور مشقت (جد و جہد) سے کام نہ لے اگر ایک شخص جد و جہد سے جی چرائے تو اس کے لئے بلاشبہ گردوں سے زمین بہت دور ہے۔

صبح

تیسرا شعر:- یہ سن کر صبح نے کہا کہ گلستاں کی سیر کرنے کے لئے آؤ تو نسیم (صبح کی ہوا) کی طرح آؤ یعنی دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو کہ کسی کو تمہاری ذات سے تکلیف نہ پہنچے۔

چوتھا شعر:- نیز اس کی یہ صفت بھی اپنے اندر پیدا کرو کہ دنیا میں سب سے ملو جلو لیکن اللہ تعالیٰ سے تعلق میں کمی پیدا نہ ہو۔

خلاصۂ کلام اینکہ اگر انسان ہمت سے کام لے تو اس کا وطن (آسمان) اس سے دور نہیں ہے انسان کو دنیا کی ہر پاک چیز سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے لیکن خدا سے تعلق کا دامن اس کے ہاتھوں سے نہیں چھوٹنا چاہئے۔

خاقانی

وہ صاحبِ تحفۃ العراقین
اربابِ نظر کا قُرّۃ العین
ہے پردہ شکاف اس کا ادراک
پردے ہیں تمام چاک در چاک
خاموش ہے عالمِ معانی
کہتا نہیں حرفِ لن ترانی
پوچھ اس سے یہ خاکداں ہے کیا چیز
ہنگامۂ این و آں ہے کیا چیز
وہ محرمِ عالمِ مکافات
اک بات میں کہہ گیا ہے سو بات
خود بوئے چنیں جہاں تواں برد
کابلیس بماند و بوالبشر مرد

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ایران کے مشہور شاعر افضل الدین خاقانی کے ایک شعر پر تضمین کی ہے جو ان کو بہت پسند آیا

حقیقت یہ ہے کہ خاقانی بھی بیدلؔ۔ غالبؔ۔ عرفیؔ اور نظیریؔ کی طرح اقبال کا محبوب فارسی شاعر ہے۔ کلیاتِ خاقانی میں انہیں قصائد سے بہت زیادہ مثنوی تحفۃ العراقین پسند تھی چنانچہ اس کے دو شعروں پر تضمین اس کتاب (ضرب کلیم) کے آغاز میں گذر چکی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ خاقانی نے اس شعر میں اس قانون مکافات کو واضح کیا ہے جو دنیا میں جاری ہے۔

پہلا و دوسرا شعر:۔ خاقانی جو تحفۃ العراقین کا مصنف ہے ارباب نظر میں بہت مقبول ہے وہ بڑا زیرک شاعر ہے اور اسرار کائنات سے واقف ہے۔

تیسرا و چوتھا شعر:۔ معانی کی دنیا بہت خاموش ہے اور خود اپنی زبان سے کوئی متکبّرانہ دعویٰ نہیں کرتی

دوسرے معنی اس شعر کے یہ ہو سکتے ہیں کہ معانی کی دنیا بہت خاموش ہے لیکن اس کا دعویٰ نہیں ہے کہ کوئی شخص مجھے سمجھ نہیں سکتا۔ اے مخاطب! تو خاقانی سے پوچھ کہ اس دنیا کی حقیقت کیا ہے۔

پانچواں شعر:۔ وہ قانون مکافاتِ عمل سے بخوبی واقف ہے اس لئے اس نے اس شعر میں بڑے پتہ کی بات کہہ دی ہے۔ ہمیں بھی اس حیرت انگیز دنیا سے قدرے آگاہی حاصل کرنی چاہئے جس میں قانون مکافات عمل رائج ہے چنانچہ اسی قانون کا ثمرہ ہے کہ آج کل دنیا میں ابلیسیت تو باقی ہے لیکن آدمیت مردہ ہو چکی ہے یعنی آدم کی اولاد نے جب انبیائے کرامؑ کی اتباع چھوڑ دی۔ اور

ابلیس (اپنے دشمن) کی اطاعت اختیار کرلی تو آدم کی اولاد ہونا بنی آدم کے کچھ کام نہ آیا۔ ان میں سے آدمیت و شرافت بالکل نکل گئی اور اس کے بجائے ابلیسیت آگئی یعنی جیسے عمل کئے ویسی ہی سیرت بن گئی۔

اس شعر کے ایک معنی اور بھی ہو سکتے ہیں وہ یہ کہ واقعی یہ دنیا عجیب و غریب ہے بلکہ اس کی دلفریبیاں اس قدر زبردست ہیں کہ بیان سے باہر ہیں۔ اس میں ضرور کوئی راز ہے کہ ابلیس تو باقی ہے لیکن حضرت ابو البشر کا انتقال ہو گیا یعنی آدم کی اولاد ابلیس کی اولاد سے ہار گئی اور زر۔ زن۔ زمین کی پرستار بن گئی۔ پس لاؤ ہم بھی ذرا اس کا مزہ چکھیں! ذرا ہم بھی بطور خود اس کی دلفریبی سے آگاہی حاصل کریں۔

لفظی ترجمہ :- بو بردن بمعنی اطلاع بہم رسانید۔ یعنی ایسی دنیا ضرور اس قابل ہے کہ اس سے آگاہی حاصل کی جائے۔ جہاں آدمیت تو عنقا ہے اور ہر جگہ شیطنت کا چرچا ہے۔ آؤ آزما کر تو دیکھیں کہ دنیا کی لذت میں کیا بات ہے کہ ایک دنیا اس کی لذت میں گرفتار ہے۔

رومی

غلط نگر ہے تری چشمِ نیم باز اب تک
ترا وجود ترے واسطے ہے راز اب تک
ترا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک
کہ ہے قیام سے خالی تری نماز اب تک
گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک
کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک

(:)

شرح مشکلات

اس نظم میں ہم کو اقبالؔ نے رومی کے مرتبہ اور مقام سے آگاہ کیا ہے اگرچہ وہ لوگ جنہوں نے کلام اقبال کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے رومی کے مقام سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے اس نظم کے محتاج نہیں ہو سکتے لیکن اقبالؔ نے یہ خراج رومی کی بارگاہ میں اپنی بے پناہ عقیدت کی بنا، پر پیش کیا ہے جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ کلام اللہ اور احادیث رسول اللہ کے بعد مثنوی سے اقبال نے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے اور ان کی عقیدت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے وہی مسلک اختیار کر لیا جو مولانا روم کا تھا یعنی عقل پہ عشق کی برتری

فرماتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ اے مخاطب! یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ تو کائنات میں کسی شئے کی حقیقت سے واقف نہیں ہے بلکہ تو خود اپنے وجود سے آگاہ نہیں ہے تو ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ خود "میں" کیا ہوں؟

دوسرا شعر:۔ تیرے اندر نیاز۔ احتیاج اور محکومی کی شان تو موجود ہے لیکن تیرے اندر ناز۔ استغنا اور حکومت کی شان پیدا نہیں ہوئی تو خود بادشاہوں کے دروازوں پر جاتا ہے لیکن کوئی بادشاہ تیرے دروازے پر نہیں آتا۔ تیری نماز۔ قیام سے خالی ہے یعنی تو اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا نہیں ہوتا بلکہ ارباب حکومت کی چوکھٹ پر مسلسل سجدے کرتا رہتا ہے بالفاظ دگر تو نماز تو پڑھتا ہے لیکن اس میں سجدہ ہی سجدہ ہے قیام کہیں نظر نہیں آتا۔ حالانکہ نماز میں سجدے کے علاوہ قیام بھی ہوتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ مختصر یہ ہے کہ تیری خودی کے ساز کے سب تار ٹوٹے ہوئے ہیں یعنی تیری خودی بیکار ہو چکی ہے۔ دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ کیا تو جانتا ہے کہ ان سب امراض کا باعث کیا ہے؟ ان کا باعث یہ ہے کہ تو نے ابھی تک مثنوی مولانا روم کا مطالعہ کر کے اس کی تعلیم پر عمل نہیں کیا اور مثنوی کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور چونکہ اطاعت کے لئے محبت لازمی ہے اس لئے حضورؐ کی ذات سے عشق پیدا کرو۔ الغرض عشق رسولؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام بیماریوں کا علاج ہے چنانچہ مولانا خود فرماتے ہیں۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما — وے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما — اے تو افلاطون و جالینوس ما

(❁)

جدّت

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منوّر ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیّل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

(❁)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ہمیں جدّت یعنی ندرتِ فکر۔ (originality) کی قدر و قیمت اور اس کے ثمرات سے آگاہ کیا ہے یعنی یہ بتایا ہے کہ اگر ہم دوسروں کے خیالات کی تقلید کے بجائے خود اپنی قوت فکر کی نشوونما کریں اور اس خداداد نعمت کو مرتبۂ کمال

پر پہنچائیں تو کیا نتیجہ ہوگا۔

پہلا شعر:۔ اے مخاطب! اگر تو اپنی خودی میں ڈوب کر اپنی ذہنی قوتوں کو صیقل کر کے بطور خود اس کائنات میں غور و فکر کرے تو ایک عالم تیرے افکار کی روشنی سے منور ہو جائے گا۔

دوسرا شعر:۔ بڑے بڑے آدمی تیرے خیالات سے استفادہ کریں گے بلکہ تو تسخیر عناصر کر کے کائنات پر حکمراں ہو جائے گا۔

تیسرا شعر:۔ تیرے پاکیزہ اور بلند خیالات کی بدولت دنیا میں انقلاب رونما ہو سکتا ہے اور تیرے تخلیقی کارنامے فطرت کے کارناموں سے بڑھ سکتے ہیں (ریڈیو۔ لاسلکی۔ ٹیلی ویژن۔ ٹیلیفون یہ اور سینکڑوں ایجادات سب اجتہاد اور تحقیق یا جدّتِ فکر ہی کے ثمرات ہیں۔

چوتھا شعر:۔ مجھے حیرت ہے کہ تو کیوں غیروں کے افکار کی تقلید کر رہا ہے؟ کیا تو اس قدر عاجز اور درماندہ ہے کہ اپنی خودی تک بھی تیری رسائی نہیں ہے یعنی کیا تجھے یہ معلوم نہیں کہ تو اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے اگر تو ہمت کرے تو یہ کام چنداں مشکل نہیں ہے۔

—(:)—

مرزا بیدل

ہے حقیقت یا مری چشمِ غلط بیں کا فساد
یہ زمیں یہ دشت یہ کہسار یہ چرخِ کبود
کوئی کہتا ہے نہیں ہے کوئی کہتا ہے کہ ہے
کیا خبر! ہے یا نہیں ہے تیری دنیا کا وجود
میرزا بیدلؔ نے کس خوبی سے کھولی یہ گرہ
اہلِ حکمت پر بہت مشکل رہی جس کی کشود
دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود ایں چمن
رنگِ مے بیروں نشست از بسکہ مینا تنگ بود

(٭)

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبالؔ نے عظیم آباد[1] (پٹنہ) کے جلیل القدر

[1] عظیم آباد جسے اب عرف عام میں پٹنہ کہتے ہیں صوبہ بہار کا دار الحکومت ہے داغؔ دہلوی نے اس نام کو اپنے ایک مقطع میں استعمال کر کے دوبارہ زندہ کر دیا۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغؔ کلکتہ چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

فارسی شاعر مرزا عبدالقادر بیدلؔ کے مشہور شعر تضمین کی ہے یہ وہی بیدل ہیں جن کے تقلید کی کوشش غالبؔ نے بھی کی تھی چنانچہ اس کی دشواری کو انہوں نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

واضح ہو کہ میرزا بیدل کا تتبع اس لئے دشوار ہے کہ ایک تو وہ آسان اور معمولی مضمون کو پیچیدہ اور مغلق طریق پر بیان کرتے ہیں دوسرے یہ کہ وہ فلسفہ اور حکمت کے اکثر مشکل مسائل کو اپنی غزل کا موضوع بناتے ہیں۔

مثلاً غالبؔ کا یہ شعر بیدل کے انداز بیان کے تتبع ہی کی وجہ سے دشوار ہو گیا ورنہ بات صرف اتنی سی ہے کہ عاشق کی وفات کے بعد معشوق نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا کیونکہ پھر زمرۂ عشاق میں کوئی اس قابل نظر نہ آیا کہ اس پر بیداد کی جائے

درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

اقبالؔ چونکہ غالبؔ کا حشر دیکھ چکے تھے اس لئے انہوں نے بیدلؔ سے استفادہ تو کیا لیکن اس کے رنگ میں لکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

بیدلؔ نے اپنے اس شعر میں اس مسئلہ پر اظہار رائے کیا ہے کہ یہ کائنات حقیقی ہے یا غیر حقیقی؟ یہ وہی مسئلہ ہے جو قدیم زمانہ سے حکما کے درمیان معرکۃ الآرا رہا ہے چونکہ اقبال کو بھی اس مسئلہ سے دلچسپی تھی اس لئے انہوں نے اس شعر پر

تضمین کردی۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ سوال یہ ہے کہ یہ کائنات۔ زمین۔ صحرا۔ پہاڑ آسمان حقیقی ہے یا محض فریب نظر ہے؟

دوسرا شعر:۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ دنیا واقعی موجود ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ نہیں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے محض موہوم ہے۔

تیسرا شعر:۔ لیکن میرزا بیدل نے اس مسئلہ کو بڑی خوبی کے ساتھ سمجھایا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مومن کا قلب اگر اس قدر وسیع ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام تجلیات کو اپنے اندر لے سکتا ہے تو کائنات کا وجود ہی نہ ہوتا لیکن چونکہ مینا (بوتل) تنگ تھی اس لئے رنگِ مے (تجلیاتِ انوار الٰہیہ) بوتل (قلب مومن) سے باہر جلوہ گر ہو گیا۔ یعنی کائنات موجود ہو گئی۔

چوتھا شعر:۔ بالفاظ دگر کائنات کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ ظلّی ہے یا کائنات کی حقیقت وجود نہیں بلکہ عدم ہے اور جو کچھ نظر آتا ہے یہ پرتو ہے اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ دنیا ذات کے اعتبار سے معدوم ہے تجلیات کے اعتبار سے موجود ہے۔

نوٹ:۔ میں نے جو مطلب لکھا ہے اس کے سمجھنے کے لئے ان تینوں باتوں کو مدنظر رکھنا اشد ضروری ہے۔

۱۔ یہ کائنات بیدل کی رائے میں تجلیات انوار الٰہیہ کا مظہر ہے اس کے علاوہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

۲۔ مومن کا قلب تجلیات کا مہبط ہے اگر اس میں وسعت ہوتی تو ساری

تجلیات کو اپنے اندر جذب کر لیتا لیکن اس میں اس قدر وسعت نہیں ہے اس لئے کائنات بھی عالم وجود میں آگئی۔

۳۔ کائنات کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ رب کی تجلیات کا پرتو ہے کسی کے آئینہ رخ کا اب خود بیدل کا ایک شعر پیش کرتا ہوں تاکہ ناظرین کو اس کا مسلک خود اس کی زبان سے معلوم ہو جائے۔

ہستیِ فتنہ انگیز است سردِ قاشت
ہستیِ ما جز دروغِ مصلحت آمیز نیست

(٭)

جلال و جمال

مرے لئے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیِ ادراک
مری نظر میں یہی ہے جمالِ زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
ترا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک
مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ اگرچہ انسان کے لئے جلال اور جمال دونوں ضروری ہیں لیکن جلال نہ ہو تو جمال بے تاثیر ہے اس جگہ اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ اقبال کے اس قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جمال نہ ہو تو محض جلال خودی کی تکمیل کے لئے کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ بہت ضروری ہیں اور خودی کی تکمیل ان دونوں پر موقوف ہے اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو خودی ناقص رہ جائے گی چنانچہ اقبالؔ نے۔ پس چہ باید کرد میں اس کی صراحت کر دی ہے۔

رائے بے قوّت ہمہ مکر و فسوں
قوّت بے رائے جہل است و جنوں

یعنی جمال ہو اور اس کے ساتھ جلال نہ ہو تو وہ جمال محض مکر و فسوں ہے یعنی بے تاثیر ہے مثلاً آپ کا خیال کیسا ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن اگر آپ کے پاس طاقت نہیں ہے تو اس پر کون عمل کرے گا۔ اور طاقت ہو لیکن اس کے ساتھ صحیح خیال نہ ہو تو پھر وہ طاقتور انسان چنگیز خان بن جاتا ہے یعنی وہ قوت چونکہ اندھی ہوتی ہے اس لئے بنی آدم کے حق میں مصیبت بن جاتی ہے۔ قصہ مختصر اس نظم میں اقبال نے صرف ایک پہلو کو واضح کیا ہے اور وہ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ جلال نہ ہو تو جمال بے تاثیر ہے نیز میں اس شرح میں کسی جگہ اس بات کی وضاحت کر چکا ہوں کہ جلال اور جمال کا منبع لا الٰہ الا اللہ ہے لا الٰہ سے جلال اور الا اللہ سے جمال پیدا ہوتا ہے اب نظم کا مطلب لکھتا ہوں

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ اے مخاطب! اگر تو فلسفہ اور حکمت کو دقیع یا اپنی زندگی کے لئے کافی سمجھتا ہے تو تیری مرضی تجھے یہ خیال مبارک ہو لیکن میں تو افلاطون کے فلسفہ پہ زور حیدری کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ مسلمان کا مقصد حیات باطل کا مقابلہ کرنا ہے اور یہ مقصد فلسفہ سے نہیں بلکہ روحانی طاقت سے حاصل ہو سکتا ہے بالفاظ دیگر میں تو عقل کے مقابلہ میں عشق کو ترجیح دیتا ہوں

(واضح ہو کہ جناب حضرت علی حیدر کرارؓ میں یہ طاقت عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بدولت پیدا ہوئی تھی)

دوسرا شعر:۔ میں تو اسی کو حقیقی جمال و زیبائی سمجھتا ہوں کہ مسلمان میں باطل کا مقابلہ کرنے کے لئے بازو میں طاقت اور دل میں حوصلہ ہو دیکھ لو! آسمانوں کو اللہ نے اپنی قدرت (قوت) ہی سے تابع فرمان بنا رکھا ہے اس مصرع کے دوسرے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ قوت کے سامنے کائنات کی ہر بڑی سے بڑی چیز مطیع بن جاتی ہے۔

تیسرا شعر:۔ اگر انسان میں جلال (قوت) نہ ہو تو اس کی تقریر کیسی ہی دلکش کیوں نہ ہو مخالف کے اندر کوئی تاثیر پیدا نہیں کر سکتی اگر موسیقی میں سوز و گداز نہ ہو تو سامعین پہ کوئی تاثیر مرتب نہیں ہو سکتی۔

چوتھا شعر:۔ میرا ذاتی نظریہ تو یہ ہے کہ میں اپنی سزا کے لئے اس آگ کو بھی پسند نہیں کروں گا جس کے شعلوں میں حدت اور تندی نہ ہو کیونکہ جلنے میں مجھے کوئی لطف نہیں آئے گا بالفاظ دگر سزا کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

مصوّر

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیّل
ہندی بھی فرنگی کا مقلّد، عجمی بھی
مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دَور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی
معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات
صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

(*)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے مصوّری کی حقیقت واضح کی ہے کہ حقیقی مصوری وہ ہے جس میں مصور کی شخصیت یا انفرادیت کا رنگ نمایاں ہو سکے یعنی تصویر دیکھ کر ہم مصوّر کی ذہنی کیفیات کا اندازہ کر سکیں۔ کہتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ ہندوستان کے مصوّروں میں تخیّل (Imagination) کا فقدان ہے۔

دوسرا شعر:۔ وہ سب مغرب کے فنکاروں کی تقلید کرتے ہیں اپنی جدّت فکر کا اظہار نہیں کرتے ان کی ذہنیت پست ہے اس لئے وہ تصویر میں کوئی ندرت پیدا نہیں کر سکتے بلکہ زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے مصوّروں میں مشرقی طرز مصوّری کا رنگ بھی نظر نہیں آتا۔

تیسرا شعر:۔ اے مصوّر! مجھے تیرے کمالات بخوبی معلوم ہیں۔ تو مانی و بہزاد کے طرز سے بھی واقف ہے اور جوشوار مینلڈ ——— (Tallsaa Ranobal) بلکہ مائیکل اینجلو (Mielbaian gale) کے اسلوب سے بھی آگاہ ہے یعنی تو مشرقی اور مغربی دونوں قسم کے مصوّروں کی نقالی کر سکتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ نیز تو نے اپنی تصاویر میں فطرت کو دکھایا بھی ہے لیکن یہ کافی نہیں ہے تو اپنی تصاویر میں اپنی خودی کو بھی تو ظاہر کر یعنی ایسی تصاویر پیش کر۔ جن سے تیری انفرادیت کا اظہار ہو سکے کیونکہ آرٹ نقالی کا نام نہیں ہے بلکہ اچھوتے تخیلات کو مختلف رنگوں کے ذریعہ سے واضح کرنے کا نام ہے۔

———(❖)———

سرودِ حلال

کھُل تو جاتا ہے مغنّی کے بم و زیر سے دل
نہ رہا تہ ندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود
ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود
جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود
مہ و انجم کا یہ حیرت کدہ باقی نہ رہے
تو رہے اور ترا ترزمۂ لاموجود
جس کو مشروع سمجھتے ہیں فقیہانِ حجاز
منتظر ہے کسی مطرب کا ابھی تک وہ سرود

(❁)

شرح مشکلات | یہ کس قدر مشکل نظم ہے اس میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ وہ سرود یا نغمہ کون سا ہے جس کو مذہب خودی میں جائز قرار دیا جا سکتا ہے یعنی وہ موسیقی کونسی ہے جو مرد مومن کے لئے جائز ہے کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ عام گویوں کے گانے اور تان پلٹے سن کر تھوڑی دیر کے لئے دل ضرور شگفتہ ہو جاتا ہے لیکن یہ شگفتگی اور لذت دائمی اور زندگی بخش نہیں ہوتی لہٰذا یہ عارضی سرور محض بیکار ہے۔

دوسرا شعر:۔ افسوس! وہ موسیقی ابھی تک کہیں سننے میں نہیں آئی جو دل میں حقیقی سوز و گداز پیدا کر دے۔

تیسرا شعر:۔ جس کی تاثیر سے انسان کے قلب میں ایسی طمانیت پیدا ہو جائے کہ وہ خوف اور غم (حزن) ان دو بلاؤں سے محفوظ ہو جائے۔

واضح ہو کہ قلب انسانی کے سب سے بڑے دشمن دو ہیں۔ خوف اور حزن اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان جب تک اس کا تعلق اللہ سے استوار و مستحکم نہ ہو جائے یا تو آئندہ آفات سے ڈرتا رہتا ہے یا گذشتہ غلطیوں پر افسوس کرتا رہتا ہے اور جب تک قلب انسانی پر خوف اور حزن مسلط رہتے ہیں وہ کوئی روحانی ترقی نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید میں مومنوں کی شان یہ بیان کی گئی ہے کہ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔ نہ انہیں خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ مسلمان کے لئے وہ موسیقی جائز ہے جو اس کے قلب کو خوف اور غم سے پاک کر کے دائمی سرور اور ابدی اطمینان عطا کر دے اور وہ موسیقی قرآن مجید کی تلاوت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ وہ موسیقی ہے جس کی بدولت ایاز (غلام) کو محمود (سلطان) کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

اس مصرع میں۔ مقام محمودہ کی ترکیب بہت خوب ہے بلکہ میری تحسین سے بالاتر ہے کیونکہ مقام محمود کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک معنی تو وہی ہیں جو میں نے بیان کئے ہیں دوسرے اور ارفع معنی یہ ہیں کہ اس میں اشارہ ہے اس آیت مبارکہ کی طرف عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا یعنی اے ہمارے محبوب! آپ رات کو پچھلے پہر اٹھ کر نماز تہجد پڑھا کیجئے یقین ہے کہ اس کے معاوضہ میں آپ کا پروردگار آپ کو مقام محمود عطا فرمادے گا۔

اس شعر سے ناظرین اقبال کی شاعری کی نوعیت سے بھی آگاہ ہو سکتے ہیں کہ اس کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے اور حدیث شریف۔ دیگر ہیچ۔

چوتھا شعر:۔ اے مسلمان! پس لازم ہے کہ تو وہ سرود (نغمہ) سن جس کی تاثیر سے تو علائق دنیوی سے پاک ہو جائے اور تیری زبان پر ہر وقت لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ کلمہ جاری رہے یعنی یہ دنیا اور اس کی دلچسپیاں سب فانی ہیں حقیقی وجود صرف ایک ہے اور میں اسی وجود حقیقی یعنی اللہ کے سہارے سے موجود ہوں تو محض اس لئے کہ وہ موجود ہے وہ نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

نوٹ۔ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ کی یہ وہ تعبیر ہے جو اقبال نے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی سے سیکھی ہے۔

پانچواں شعر:۔ جس سرود کو مذہب خودی کے فقہا، جائز سمجھتے ہیں یعنی ذکر الٰہی کا سرور افسوس کہ وہ سرور ابھی تک کسی مطرب یعنی زبردست اور عظیم الشان روحانی بزرگ کے ظہور کا منتظر ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس زمانہ میں نفسیاتی خواہشات کو برانگیختہ کرنے

والا سرود تو مل سکتا ہے لیکن روحانیت پیدا کرنے والا سرود ناپید ہے۔

سرودِ حرام

نہ میرے ذکر میں ہے صوفیوں کا سوز و سرور
نہ میرا فکر ہے پیمانۂ ثواب و عذاب
خدا کرے کہ اسے اتفاق ہو مجھ سے
فقیہِ شہر کہ ہے محرمِ حدیث و کتاب
اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نالۂ چنگ و رباب

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبالؔ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ کونسی موسیقی حرام ہے۔ کہتے ہیں کہ:۔

پہلا شعر:۔ نہ تو میرے ذکر میں صوفیوں کا سوز و سرور ہے اور نہ میری فکر میں یہ اہلیت ہے کہ وہ ثواب و عذاب کا اندازہ کر سکے یعنی نہ میں کوئی صوفی صافی ہوں نہ مفتیِ شرع۔

دوسرا شعر:۔ اس لئے میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ جو کچھ میں کہنے والا ہوں فقہا بھی اس سے متفق ہو جائیں (تاکہ میرا قول مستند قرار پا سکے)

تیسرا شعر:- وہ موسیقی بالکل حرام ہے جس کو سن کر مسلمان کی قوتِ عمل مردہ ہو جائے اور وہ کشمکشِ حیات سے کنارہ کش ہو جائے۔

فوّارہ

یہ آبجو کی روانی یہ ہمکناریِ خاک
مری نگاہ میں تا خوب ہے یہ نظّارہ
ادھر نہ دیکھ ادھر دیکھ اے جوانِ عزیز
بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فوّارہ

شرح مشکلات

اس مختصر نظم میں اقبال نے ایک پیش کردہ یا افتادہ مضمون سے اپنے نظریہ کی تائید کی ہے بظاہر نہر اور فوّارہ کا موازنہ ہے لیکن ان دو شعروں میں اقبال نے بات پتہ کی کہی ہے

پہلا شعر:- کہتے ہیں کہ نہر کو دیکھو چونکہ اس میں زورِ دروں نہیں ہے بلکہ یہ دریا کی محتاج ہے اس لئے یہ تو رہی ہے لیکن خاک سے ہمکنار ہے اس میں اٹھنے یا ابھرنے یا بلند ہونے کی طاقت نہیں ہے اسی لئے مجھے اس کی روانی کا منظر پسند نہیں ہے۔

دوسرا شعر:- اے نوجوان! نہر (غلاموں یا محتاجوں) کی طرف

مت دیکھ فوّارہ (بلند حوصلہ خود دار غیرت مند انسانوں) کی طرف دیکھ بظاہر نہر کے طول کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے لیکن اس کے دل میں امنگ ہے ابھرنے کی طاقت ہے اس لئے بلندی کی طرف مائل ہے۔ چونکہ اقبال کی رائے میں اسلام انسان کو ابھرنے اور بلند ہونے کی تعلیم دیتا ہے اس لئے ان کو ہر وہ شئے پسند آتی ہے جس میں بلندی کا رنگ نظر آتا ہے چنانچہ انہوں نے اپنے کلام میں جابجا شاہین اور عقاب اور شہبانہ کا ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ان پرندوں میں انہیں مرد مومن کی بعض صفات کا پرتو نظر آتا ہے شاہین کی درویشی ملاحظہ ہو۔

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

شاعر

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نے
شاعر! ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیرِ غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے
ہر لحظہ نیا طُور، نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے!

(٭)

شرح مشکلات اس دلپذیر نظم میں اقبال نے شاعروں کو پیغام دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے شاعروں کو کس قسم کی شاعری کرنی چاہیئے۔ کہتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ مشرق کی شاعری کی دنیا میں شاعری محض لفظی طلسم ہے نفس مضمون کا فقدان ہے خلا جانے ہمارے شاعروں کے دماغوں میں مضامین اور خیالات ہیں بھی یا نہیں۔

دوسرا شعر:۔ اے ہند کے شاعر! غلامی کی بدولت جس قوم کی خودی ضعیف ہو جائے اس قوم کے حق میں عجمی مذاق کی شاعری (وصل و ہجر کے افسانے اور دریائے رادی کے رومان) بالکل بیکار بلکہ مضر ہے۔

تیسرا شعر:۔ خواہ تو پرشوکت الفاظ استعمال کرے یا بالکل سادہ اور اسلوبِ بیان غالب کا ہو یا داغ کا۔ اصلی چیز یہ ہے کہ مضامین نہایت عالیشان اور حوصلہ افزا ہوں جن کی بدولت قوم کی قوتِ عمل تیز ہو جائے۔

چوتھا شعر:۔ یاد رکھ! اس دنیا میں کوئی قوم جد و جہد اور جہاد

اور سعیِ پیہم کے بغیر سرداری اور حکمرانی حاصل نہیں کر سکتی۔

پانچواں شعر:۔ پس میری یہ دعا ہے کہ تیری شاعری سے قوم کے اندر سربلندی کے حصول کا ایسا بے پناہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ایک عزت کا مقام حاصل کرنے کے بعد دوسرا مقام پیدا کرنے کی تڑپ پیدا ہو اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے یعنی ترقی کا جذبہ کبھی سرد نہ ہو۔

شعرِ عجم

ہے شعرِ عجم گرچہ طرب ناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز
وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے
جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز
اقبالؔ یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ
از ہر چہ بآئینہ سمانند بہ پرہیز

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ایرانی شاعری پر تنقید کی ہے جس نے ان کی رائے میں مسلمانوں کی قوت عمل کو مفلوج کر دیا۔ کہتے ہیں کہ:-

پہلا شعر:- اگرچہ ایرانی شاعری بہت مسرت انگیز اور دلکش ہے لیکن اس کے مطالعہ سے انسانی خودی کو استحکام نصیب نہیں ہو سکتا۔

دوسرا شعر:- اگر بلبل کی خوش الحانی سے باغ پر افسردگی اور (اخزان کا رنگ) طاری ہو جائے تو اسے خاموش رہنا بہتر ہے اسی طرح اگر شاعر یہ دیکھے کہ میرے کلام سے قوم میں مایوسی اور دل شکستگی پیدا ہوتی ہے تو شاعری ترک کر دے۔

تیسرا شعر:- اگر شاعروں کے کلام سے قوم کے اندر وہ طاقت پیدا نہ ہو سکے جس کی بدولت اس قوم کے افراد غلامی کی زنجیروں کو توڑ سکیں تو خواہ ان کی شاعری آسمان سے اونچی ہو تو بھی بیکار ہے مثلاً بیدلؔ ہی کے کلام کو دیکھ لیجئے۔ نہایت دشوار اور مغلق ہے اور انداز بیان اس قدر مشکل ہے کہ بعض اشعار بالکل چیستاں بن گئے ہیں لیکن اس کی شاعری سے قوم کے اندر "عمل صالح" کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا۔

چوتھا شعر:- اے دوستو! اے شاعرو! یہ عیش و عشرت کا زمانہ نہیں بلکہ جد و جہد کا دور ہے لہذا قوم کو عمل کا پیغام دو۔ اور ہر اس بات سے پرہیز اور اجتناب کرو جو تمہیں حقیقت پسندی سے دور کر دے اور وہمی دنیا کی طرف لے جائے۔

ہنروران ہند

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیّل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنرانِ برہمنوں کا مزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ہندوستان (اب پاکستان کو بھی شامل کر لیا جائے) کے فنکاروں کی ذہنیت یا نفسیاتی حالت پر تنقید کی ہے۔ کہتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ ان کے تخیلات اور تصورات ایسے مردہ ہیں کہ ان کے کلام یا مضامین خصوصاً افسانوں کے پڑھنے کے بعد اگر کسی کے اندر پاکیزہ جذبات موجود ہوں تو وہ بھی مردہ ہو جاتے ہیں پیدا ہوتا تو خارج از بحث ہے

اور اگر کوئی قوم ان کے خیالات کی پیروی کرنے لگے تو یقیناً تباہ ہو جائے گی۔

دوسرا شعر:- ہندوستان کے شاعر مصوّر اور افسانہ نگار اپنے کلام میں اپنی تصاویر میں اور اپنے افسانوں میں ایسے تخیلات پیش کرتے ہیں جن سے قوتِ عمل افسردہ بلکہ مردہ ہو جاتی ہے ان بت پرستوں کا آرٹ زندگی اور حقائق زندگی سے بالکل دور ہے یہ لوگ سچائی اور حقیقت سے بیگانہ ہو کر ایک فرضی اور وہمی دنیا میں رہتے ہیں اور اپنے فن کے نمونوں سے قوم کو افیون کی گولیاں کھلاتے رہتے ہیں۔

مثلاً جب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں رات دن ریکارڈوں اور ریڈیو پر مشاعروں اور کتابوں میں اس قسم کے اشعار سنتے اور پڑھتے رہیں گے کہ

ہمیں تو شام غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی
کہ وہ ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی

تو آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کی ذہنیت کس قدر افسردہ اور غم پسند ہو جائے گی کیا ایسے نوجوان جہاد میں حصہ لے سکتے ہیں؟ یا مشکلاتِ زندگی پر غالب آسکتے ہیں؟ ہرگز نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ان کے دل اور دماغ میں غرقابی اور فنا کا تصور جاگزیں ہو جائے گا تو پھر ابھرنے اور جدوجہد کرنے اور موجوں کا مقابلہ کرنے اور ساحل پر پہنچنے کا تصور کب اور کیسے پیدا ہو سکے گا۔

جب ایک نوجوان کی زندگی کا مقصدِ وحید صرف یہ ہو کہ اس کا محبوب تو ساحل پہ دوربین ہاتھ میں لئے بیٹھا ہو اور وہ خود اس قدر پست

ہمت مایوس۔ کمزور۔ بزدل اور دل شکستہ ہو کر کنارے پر پہنچ کر محبوب سے ملنے کا تصور بھی نہ کر سکتا ہو بلکہ محبوب کو اپنی محبت کا آخری ثبوت دے کر منجدھار میں غرق ہو جانے کو مقصد حیات سمجھتا ہو تو وہ نوجوان تلوار ہاتھ میں لے کر میدانِ جنگ میں کیسے اور کس طرح جا سکتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ ہندوستان و پاکستان کے فنکار زندگی کے بلند مقامات تو نوجوانوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں بلکہ ان کو پستی کی طرف لے جاتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اخلاق حسنہ اور پاکیزہ صفات کو فنا کر دیں اور ان کے بجائے نفسانی یعنی حیوانی خواہشات اور جنسی میلانات کو برانگیختہ کر دیں۔

چوتھا شعر:۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے شاعروں مصوّروں اور افسانہ نگاروں کے یہاں ہر جگہ عورت ہی عورت جلوہ گر ہے عموماً شاعروں کو مشغلہ یہ ہے کہ لفظوں کے ذریعہ سے عورت کے جسم کے مختلف اعضاء کی تصویر کھینچتے رہتے ہیں اور مشاعروں میں اسی قسم کے شعروں پر "داد" بھی ملتی ہے۔

مصوّروں کا مشغلہ یہ ہے کہ یہ ایسی تصاویر بناتے ہیں جن میں عورت لباس کے باوجود عریاں نظر آتی ہے اور ایسی ہی تصاویر زیادہ مقبول ہوتی ہیں اور لطف یہ ہے کہ اسے آرٹ کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ افسانہ نگاروں کا مشغلہ یہ ہے کہ عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کو مزے لے لیکر بیان کرتے ہیں اور اسے حقیقت نگاری سمجھتے ہیں اور غلط فہمی کی انتہا یہ ہے کہ اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہیں حالانکہ یہ

ترقی نہیں بلکہ ذہنی پستی اور اخلاقی موت ہے۔

نوٹ:۔ علامہ نے شاعر مصور اور افسانہ نگار کا ذکر تو کر دیا لیکن ان کے سرپرستوں کا تذکرہ خدا جانے کیوں نہیں کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو اور ان کے اس انسانیت کش آرٹ کو جو کچھ فروغ حاصل ہو رہا ہے وہ سب فلمیں بنانے والوں کی نگاہِ کرم کا نتیجہ ہے۔ ملک کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دین۔ مذہب اخلاق اور آدمیت سے برگشتہ کرنے میں یہ فلمیں (Films) میجر پارٹ ادا کر رہی ہیں چنانچہ ان کی بدولت ہمارے اخلاق اس قدر تباہ ہو چکے ہیں کہ مسلمان ماں خود اپنی جوان بیٹی کو ساتھ لے کر "نرگس" کا کام دیکھنے جاتی ہے اور اسے مطلق معیوب نہیں سمجھتی اور اب تو کراچی میں کالج کی مسلمان لڑکیاں شکنتلا کا روپ بھر کر روز روشن میں ارباب نظر سے خراج تحسین وصول کرتی ہیں بلکہ پہلا انعام حاصل کرتی ہیں۔

(٭)

مردِ بزرگ

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق

انجمن میں بھی میسّر رہی خلوت اس کو
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثلِ خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزاد و معانی میں دقیق
اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے مردِ مومن کی صفات بیان کی ہیں۔ علامہ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ مومن۔ کفر سے نفرت کرتا ہے اور اس کی نفرت بہت شدید ہوتی ہے یعنی وہ کفر سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کرسکتا وہ اسلام سے محبت کرتا ہے اور اس کی محبت بھی بہت شدید ہوتی ہے یعنی وہ اسلام کے لئے اپنی زندگی تک قربان کرسکتا ہے واضح ہو کہ یہ مضمون اس آیت سے ماخوذ ہے وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ یعنی وہ لوگ جو آپؐ کے ساتھ ہیں اس کی حالت یہ ہے کہ وہ کافروں پر بہت شدید ہیں لیکن آپس میں ایک دوسرے پر بہت شفیق اور مہربان ہیں۔

نیز مومن اگر اللہ کے بندوں پر قہر یا سختی کرتا ہے تو اس میں بھی شفقت

کا رنگ پوشیدہ ہوتا ہے وہ اس طرح کہ استاد اگر شاگردوں پر سختی کرتا ہے تو اس میں استاد کو شاگردوں کی بہتری ہی مدّ نظر ہوتی ہے۔

دوسرا شعر:۔ اس کی دوسری صفت یہ ہے کہ اگرچہ اس کی پرورش تقلید کے ماحول میں ہوتی ہے لیکن وہ اپنی فطری صلاحیت کی بدولت اپنے ماحول میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے پرانی رسموں اور بری باتوں کو مٹا کر پاکیزہ طرز زندگی کی تخلیق کرتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ اگرچہ وہ بظاہر سب لوگوں کے ساتھ رہتا ہے سب سے ملتا جلتا ہے لیکن اللہ کے سوا کسی کو اپنا محبوب یا مقصد حیات نہیں بناتا۔ گویا وہ شمع محفل کی طرح سب کو اپنی ذات سے فائدہ پہنچاتا ہے لیکن خود سب سے الگ رہتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ اس کی دماغی قوتیں نہایت روشن ہوتی ہیں اسی لئے وہ صاحب فراست ہوتا ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے اس کی گفتگو نہایت سادہ اور سچی ہوتی ہے لیکن آسان لفظوں میں وہ بڑے حکیمانہ نکتے بیان کر دیتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ وہ دنیا کو دنیا داروں کے زاویۂ نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ ہر بات کو قرآن اور سنت کی روشنی میں دیکھتا ہے اسی وجہ سے اس کا انداز نظر اپنے زمانہ سے جدا ہوتا ہے مثلاً دنیا دار دنیاوی فوائد اور مادی اغراض کے حصول کی خاطر ضمیر فروشی بھی کر لیتے ہیں لیکن مومن اس بات کو کبھی

جائز نہیں رکھتا وہ فقر و فاقہ میں گذر کر لیتا ہے لیکن ایمان نہیں بیچتا یہی وجہ ہے کہ "پیرانِ طریق" یعنی دنیا دار علما یا صوفیا اس کے احوال اور مقامات سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔

عالمِ نو

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر
خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نو کی تصویر
اور جب بانگِ اذاں کرتی ہے بیدار اسے
کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر
بدن اس تازہ جہاں کا ہے اسی کی کفِ خاک
روح اس تازہ جہاں کی ہے اسی کی تکبیر

شرح مشکلات اقبالؔ نے اس نظم میں یہ بتایا ہے کہ عالمِ نو کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس کا خمیر کن چیزوں سے تیار ہوتا ہے

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ:-

پہلا شعر:- عالمِ نو (نئی دنیا) وہ شخص پیدا کر سکتا ہے جس کا دل زندہ ہو یعنی جس کی خودی مرتبۂ کمال تک پہنچ چکی ہو چونکہ وہ ضمیرِ کائنات سے

آگاہ ہوتا ہے اس لئے یہ بھی جانتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے چنانچہ وہ جب سونے کے لئے لیٹتا ہے تو یہ خیال اس کے ذہن میں ہوتا ہے کہ میں ایک نئی دنیا بناؤنگا جس میں اللہ کے بندے اللہ کی مرضی پر چل سکیں جس میں اسلام کا نام بلند ہو سکے جس میں کفر ذلیل اور مغلوب ہو سکے اس لئے وہ خواب بھی دیکھتا ہے تو عالم نو کا یا خواب میں عالم نو کی تصویر بناتا ہے یعنی سوتے جاگتے اسلام کی سربلندی کا خیال اس کے دل پر مسلط رہتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ جب وہ سو کر اٹھتا ہے اور ہمیشہ بانگ اذان اسے بیدار کر دیتی ہے تو وہ رات بھر جن تصورات میں غلطاں رہا ہے بس انہی خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ جو دنیا اس نے خواب میں بنائی تھی اسے اب خارج میں تعمیر کرنے لگتا ہے یعنی اسلام کی سربلندی کے لئے کوشاں ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب وہ سونے کے لئے لیٹتا تھا تو اسلام کی سربلندی کا خیال دل میں لے کر لیٹتا تھا۔ خواب میں بھی یہی خیالات اس کے دل پر مسلط رہے اور جب سو کر اٹھا تو پھر انہی خیالات کو خارجی شکل دینے میں مصروف ہو گیا۔

تیسرا شعر:۔ اس نئی دنیا کا بدن اسی کی کف خاک سے بنتا ہے اور اسی کی تکبیر سے اس دنیا میں روح پڑتی ہے یعنی وہ اپنی شخصیت یا ظاہری وجود کی بدولت اس نئی دنیا کو خارجی شکل عطا کرتا ہے اور اس نئی دنیا میں جو کچھ خوبی اور پاکیزگی نظر آتی ہے یہ سب کچھ اسی مرد مومن کے نعرۂ تکبیر کی بدولت

نظر آتی ہے اسی کی تکبیر سے باطل سرنگوں ہوتا ہے اور اسی کی تکبیر سے اسلام کا بول بالا ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے اس قسم کی نظموں میں عصر حاضر کے مسلمانوں کو ان کے اسلاف کے کارنامے یاد دلائے ہیں کہ جب مسلمان زندہ تھے تو وہ اسی دنیا میں عالم نو پیدا کرتے رہتے تھے مثلاً جب انہوں نے مصر فتح کر لیا تو طرابلس کی فتح کے منصوبے باندھا کرتے تھے اور اسی طرح الجزائر اور مراقش کی فتح کے بعد انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ اسپین کو فتح کیا جائے اندلس ([illegible]) میں اس وقت پرانی دنیا کا سکّہ رواں تھا۔ عربوں نے سوچا کہ لاؤ اس خطہ ارضی میں عالم نو پیدا کریں (اس عالم نو کی خصوصیات اوپر مذکور ہو چکی ہیں تو انہوں نے فوج کشی کی میدان جنگ میں ان کی نعشیں پیوندِ زمین ہو گئیں ان کا جسم اندلس کی مٹی میں مل گیا یہ ہے مطلب اس مصرع کا۔

ع بدن اس تازہ جہاں کا ہے اسی کی کفِ خاک

اور یہ فتح جو ان کو حاصل ہوئی یہ سب کرشمہ تھا نعرۂ تکبیر کا یعنی فتح کے بعد ہی اندلس میں اسلام کا نام سربلند ہوا۔ اسی لئے اقبالؔ نے یہ کہا کہ:۔

ع روح اس تازہ جہاں کی ہے اسی کی تکبیر

اب نہ وہ مسلمان ہیں نہ وہ ان کے تصورات ہیں نہ وہ کائناتِ نو کی تشکیل کے ولولے ہیں اس دور میں یہ سب خواب کی باتیں ہیں بلکہ ایک دُور رَس تخیّل پرست[1] ([illegible]) کے احساساتِ قلبی

---

[1] یہ لفظ میں نے یہاں قصداً استعمال ہے کیونکہ مارچ ۱۹۳۳ء میں علامہ مرحوم نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہ مرکب توصیفی خود اپنے لئے استعمال کیا تھا۔

کی تصاویر ہیں۔

ایجادِ معانی

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد
کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظؔ ہو کہ بتخانۂ بہزادؔ
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہادؔ

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبالؔ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اگرچہ فنونِ لطیفہ مثلاً شاعری، مصوری اور موسیقی کی نعمت خداداد ہے (موہبۃ من اللہ) لیکن اس کے باوجود ان فنون میں کمال حاصل کرنے کے لئے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔

پہلا شعر:۔ اگرچہ نئے معانی پیدا کرنے کی قوت خداداد ہوتی ہے پھر بھی اربابِ فن کو اپنے اپنے فن میں مہارتِ تامہ حاصل کرنے کے لئے سعیِ پیہم اور کوشش بلیغ صرف کرنی پڑتی ہے۔

دوسرا شعر:۔ مثلاً خواجہ حافظ نے شاعری کی دنیا میں غیر فانی شہرت حاصل کی لیکن دیوان حافظ اور مرقع بہزاد دونوں بڑی محنت کے بعد مرتب ہوئے تھے[1]

تیسرا شعر:۔ سچ یہ ہے کہ مسلسل کوشش اور لگاتار محنت کے بغیر انسانی شخصیت کی کوئی خوبی ظاہر نہیں ہو سکتی دیکھ لو فرہاد کا تمام دنیائے عاشقی میں اس وقت روشن ہوا جب اس نے برسوں کی لگاتار محنت سے پہاڑ جیسی چیز کاٹ کر رکھ دی۔

---

[1] اقبال کے قول کی صداقت ناظرین پر اس وقت واضح ہو سکتی ہے جب وہ خود کسی فن میں مہارت حاصل کریں یا کسی صاحبِ فن سے یہ دریافت کریں کہ آپ نے اس فن کی تحصیل میں کتنا وقت صرف کیا۔ مثلاً شاہ سدارنگ نے بعہد محمد شاہ موسیقی میں ایک خاص طرز ایجاد کی جسے "خیال" کہتے ہیں لیکن یہ صاحب فن تیس ۳۰ سال تک اپنے مکان کی چہار دیواری سے باہر نہیں نکلا تب کہیں جا کر اس طرز کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکا ورنہ اس کا رواج پانا بہت مشکل تھا۔

موسیقی

وہ نغمہ سردیٔ خونِ غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں
پھرا میں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں
کسی چمن میں گریبانِ لالہ چاک نہیں

(:)

شرح مشکلات

اس نظم میں علامہ اقبال نے موسیقی کی خصوصیت بیان کی ہے کہ:۔

پہلا شعر:۔ حقیقی موسیقی وہ ہے جس کو سن کر انسان کے اندر جذباتِ عالیہ برانگیختہ ہو جائیں یعنی محبتِ الٰہی کا جذبہ پیدا ہو جائے اگر موسیقی سن کر دل میں جوش پیدا نہ ہو اور رگوں میں خون نہ دوڑنے لگے یعنی جہاد کا جذبہ پیدا نہ ہو تو وہ نغمہ اس بات کی دلیل ہے کہ مغنی کا دل خود مردہ ہے اور مردہ کسی کو بیدار نہیں کر سکتا۔

دوسرا شعر:۔ وہ مغنی جس کا دل خود محبتِ الٰہی سے لبریز نہ ہو

وہ اپنی موسیقی سے سامعین کو نفع کے بجائے نقصان پہونچاتا ہے بلکہ ان کی زندگیوں کو تباہ کر دیتا ہے قوم ایسی موسیقی سے بالکل مردہ ہو جاتی ہے اور اس میں عمل کا جذبہ فنا ہو جاتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ میں نے مشرق اور مغرب دونوں حصوں میں اس بات کی تحقیق کی لیکن کہیں بھی مجھے کوئی مغنی ایسا نہ ملا جس کا نغمہ سن کر دل میں محبتِ الٰہی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

ذوقِ نظر

خودی بلند تھی اس خوں گرفتہ چینی کی
کہا غریب نے جلّاد سے دمِ تعزیر
ٹھہر ٹھہر کہ بہت دلکشا ہے یہ منظر
ذرا میں دیکھ تو لوں تابناکیِ شمشیر

شرح مشکلات اقبال نے اس نظم میں ایک چینی کے طرزِ عمل سے ایک دلپذیر نکتہ اخذ کیا ہے کہ جب جلّاد اسے قتل کرنے پر آمادہ ہوا تو اس نے یہ کہا کہ ذرا ایک منٹ کے لئے توقف کر۔ میں تیری شمشیر کی آب و تاب کو دیکھ کر اپنے ذوقِ نظر کی تسکین کا سامان بہم

پہنچالوں اس کے بعد مجھے شوق سے قتل کر دینا۔

پہلا شعر:۔ اقبال نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر کسی شخص کی خودی بلند ہو جائے تو وہ موت سے بالکل نہیں گھبراتا نیز چونکہ اس کی خودی مرتبۂ کمال پر پہنچ جاتی ہے اس لئے وہ کائنات میں کمال اور حسن و جمال کی قدر کرنا سیکھ جاتا ہے جہاں بھی اسے کسی چیز میں کمال نظر آتا ہے (اور کمال میں جمال مضمر ہوتا ہے) وہ اس کو ضرور دیکھ لیتا ہے اور اس طرح اپنے ذوق نظر کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اس چینی کی جگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا جس کی خودی ناقص یا پست ہوتی تو وہ تلوار کو دیکھ کر سراسیمہ ہو جاتا لیکن اس چینی کی خودی چونکہ بلند تھی اس لئے وہ موت کے تصوّر سے قطعاً مضطرب نہیں ہوا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسان میں ذوق نظر اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اس کی خودی بلند ہو جائے۔

(٭)

شعر

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخِ اُمَم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

(٭)

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے شعر کی حقیقت سمجھائی ہے کہ :-

پہلا شعر :- اگرچہ میں شعر کے اسرار و رموز سے آگاہ نہیں ہوں لیکن ایک نکتہ ایسا بتاتا ہوں جس کی تصدیق قوموں کی تاریخ سے ہو سکتی ہے۔

دوسرا شعر :- وہ نکتہ یہ ہے کہ جس شاعری سے قومیں زندہ ہو سکتی ہیں اور دنیا میں سربلندی حاصل کر سکتی ہیں وہ شاعری یا نغمۂ جبریل ہوتی ہے یا بانگ اسرافیل یعنی اس شاعری میں یا تو پاکیزہ خیالات ہوتے ہیں جن کی بدولت قوم میں نیکی کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے یا پھر اس میں عمل صالح کی ترغیب ہوتی ہے جس کی بدولت قوم میں جہاد کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

(٭)

رقص و موسیقی

شعر سے روشن ہے جانِ جبرئیل و اہرمن
رقص و موسیقی سے ہے سوز و سرورِ انجمن
فاش یوں کرتا ہے اک چینی حکیم اسرارِ فن
شعر گویا روحِ موسیقی ہے رقص اس کا بدن

(:)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے شاعری موسیقی اور رقص کے ربط باہمی کو واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ :-

پہلا شعر :- شاعری میں وہ لذّت ہے کہ جبرئیل اور ابلیس (نیکوکار اور بدکار) دونوں اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اچھا شعر مسلم اور کافر دونوں سے خراج تحسین وصول کرتا ہے اور رقص و موسیقی سے انسانوں میں سوز و گداز کا رنگ پیدا ہوتا ہے بلکہ محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

دوسرا شعر :- ایک چینی حکیم نے ان تینوں کے ربط باہمی کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر موسیقی کو ایک انسان فرض کر لیا جائے تو شاعری اس کے لئے بمنزلہ روح ہے اور رقص اس کا ظاہری پہلو ہے بالفاظ دگر شاعری الفاظ سے تاثیر پیدا کرتی ہے موسیقی آواز سے تاثیر پیدا کرتی ہے۔ رقص اعضاء

جسمانی کی موزوں حرکات کا نام ہے موسیقی آواز انسانی کی موزوں حرکات کا نام ہے گویا موسیقی شاعری اور رقص دونوں کی صفات اور کیفیات کی جامع ہے۔

نوٹ:۔ اس میں شک نہیں کہ موسیقی کا مرتبہ فنّی اعتبار سے جملہ فنون لطیفہ پر فائق ہے شعر اور رقص صرف انسانوں کو متاثر کر سکتے ہیں لیکن موسیقی حیوانات تک کو متاثر کر سکتی ہے آواز کا جادو ہر قسم کے جادو سے افضل ہے اسی لئے ارسطو نے موسیقی کو روح کی غذا قرار دیا ہے۔

(٭)

ضبط

طریق اہلِ دنیا ہے گلہ شکوہ زمانے کا
نہیں ہے زخم کھا کر آہ کرنا شانِ درویشی
یہ نکتہ پیرِ دانا نے مجھے خلوت میں سمجھایا
کہ ہے ضبطِ فغاں شیری فغاں روباہی و میشی

(٭)

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے ہمیں ضبط نفس کا فلسفہ سمجھایا ہے واضح ہو کہ تصوّف میں پہلے ضبط حواس کی تعلیم دی جاتی ہے پھر ضبطِ نفس کی۔ اور میرا مسلک یہ ہے کہ جو شخص اپنے اوپر قابو نہیں

پاسکتا وہ دنیا میں دوسروں کو اپنے قابو میں ہرگز نہیں لاسکتا۔ بالفاظ دگر جو شخص اپنے نفس پر حکومت نہیں کرسکتا وہ دوسروں کے دلوں پر حکومت کرنے کا کبھی مستحق نہیں ہوسکتا۔

صوفیائے کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ انسانوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے پہلے اپنے نفس پر حکومت حاصل کرلی تھی۔ اپنشدوں میں لکھا ہے کہ تمہارے اصلی دشمن پانچ ہیں۔ کام۔ کردھ۔ موہ۔ لوبہ اور اہنکار۔ ان پانچ دشمنوں کو زیر کرلو۔ ساری دنیا تمہاری غلام ہوجائے گی اور یہ بات بالکل صحیح ہے۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ دنیا والوں کا طریقہ یہ ہے کہ زمانہ یعنی اہل زمانہ کا گلہ کرتے رہتے ہیں لیکن یہ طریقہ مسلک درویشی کے بالکل خلاف ہے جو لوگ اپنے نفس پر قابو رکھتے ہیں وہ کسی کا شکوہ نہیں کرتے بلکہ اگر کوئی شخص انہیں تکلیف پہنچاتا ہے تو بھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔

دوسرا شعر:۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آہ وفغاں کرنا کمزوروں اور بزدلوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ بہادر آدمی کبھی آہ وفغاں کرکے اپنی خودی کو رسوا نہیں کرتا دیکھ لو! لومڑی یا بھیڑ بکری ذرا سی تکلیف سے چیخنے لگتی ہے لیکن شیر گولی کھاکر بھی آہ وفغاں نہیں کرتا۔

رقص

چھوڑ یورپ کے لئے رقصِ بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیمُ اللّٰہی
صلہ اُس رقص کا ہے تشنگیٔ کام و دہن
صلہ اِس رقص کا درویشی و شاہنشاہی

(٭)

شرح مشکلات

اس نظم بلیغ میں اقبال نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ رقص کی دو مختلف قسمیں ہیں۔ پہلی قسم رقص جسمانی ہے یعنی وہ رقص (ناچ) جو جسم کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے جس میں جسم رقص کرتا ہے۔ دوسری قسم رقص روحانی ہے یعنی وہ جو روح کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ جس میں روح رقص کرتی ہے اور جس طرح دونوں کی نوعیت اور کیفیت میں فرق ہے اسی طرح ان کے ثمرات میں بھی فرق ہے۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اقبال روح کے رقص کو پسند کرتے ہیں بلکہ اس کے شیدائی ہیں

اقبال کی نظر میں روح کے رقص کی جو قدر و منزلت ہے اس کا کچھ اندازہ اس شرح کے ناظرین کو اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جاوید نامہ کے آخری باب میں اقبال نے اپنی قوم کے نوجوانوں کو چند نصیحتیں کی ہیں (عنوان اس باب

کا "خطاب بہ جاوید سخنے بہ نژادِ نو" ہے) اور اس سلسلہ میں آخری نصیحت یہ کی ہے[1]۔

رقصِ تن در گردش آرد خاک را　　رقصِ جاں برہم زند افلاک را
اے مرا تسکین جانِ تا شکیب　　تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب

رمزِ دینِ مصطفےٰ گویم ترا
ہم بقدر اندر دعا گویم ترا

کہتے ہیں کہ اے مسلمان نوجوان! یاد رکھ کہ رقصِ تن تو محض تیرے جسم کو گردش میں لاتا ہے لیکن رقصِ جان ساری کائنات کو گردش میں لا سکتا ہے بلکہ اس کی بدولت تیرے اندر اس قدر طاقت پیدا ہو جائے گی کہ تو نئی دنیا پیدا کر سکے گا۔

اے میری بیقرار روح کے لئے باعثِ تسکین[2]! اگر تو اپنی روح کو رقص

---

[1] افسوس کہ اس "گنج شائیگاں" کی اشاعت کو اٹھارہ[18] سال ہونے کو آئے لیکن ابھی تک قوم کے نوجوانوں نے اس کتاب کے مطالعہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور اگر اب بھی ملک میں انگریزوں کا مدوّن کردہ نظام اور نصاب تعلیم اسی طرح جاری رہا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اقبال کا یہ پیغام صدا بصحرا ثابت ہوگا

[2] کیا یہ افسوس کا مقام نہیں کہ قوم کے جن نونہالوں کو اقبال مرحوم نے اپنے لئے باعثِ تسکین قرار دیا تھا وہ مرحوم کو تسکین دینے کے بجائے خود تسکین کی تلاش میں جوبلی۔ میجسٹک۔ نگار اور رٹز کا طواف کر رہے ہیں۔ یعنی ریت میں سے تیل نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کرنا سکھا دے تو میں تجھے دین اسلام کی حقیقت سے آگاہ کر دوں اور تجھ سے اس قدر خوش ہوں گا کہ مرنے کے بعد قبر میں بھی تیرے لئے دعا کرتا رہوں گا۔

اس اشعار سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اقبال رقص جاں کو اس قدر قیمتی کیوں سمجھتے ہیں؟ محض اس لئے کہ اس میں دین اسلام کی حقیقت مضمر ہے دین مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ مسلمان کی روح رقص کرنے لگے۔ اب ضربِ کلیم کے ان شعروں کا مطلب لکھتا ہوں۔

پہلا شعر:۔ اے مسلمان نوجوان! یہ رقص بدن تیرے لئے مناسب نہیں ہے اس تاج میں یورپ کی قوموں کو مصروف رہنے دے کیونکہ وہ مادہ پرست ہیں اور رقص بدن کے علاوہ اور کسی قسم کا رقص ان کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔

تو اپنی روح کو رقص کرنا سکھا کیونکہ اللہ نے تجھے اس لئے پیدا کیا ہے کہ تو اپنے زمانہ کے فراعنہ (اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے قانون کی اطاعت کے بجائے اپنا وضع کردہ قانون ملک میں نافذ کرتے ہیں اور اللہ کے بندوں کو اس قانون کی اطاعت کا حکم دیتے ہیں) کا مقابلہ کر سکے اور ظاہر ہے کہ یہ طاقت تجھ میں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب تو اپنے اندر شانِ کلیمی پیدا کرے اور یہ شان اس وقت حاصل ہوتی ہے جب روح رقص کر سکے۔

دوسرا شعر:۔ یاد رکھ کہ جسم کے رقص کا صلہ یا ثمرہ یہ ہے کہ انسان تھوڑی دیر کے لئے تو لطف اندوز ہو جاتا ہے لیکن رقص سے فارغ ہو کر بالکل تھک جاتا ہے اور تشنگی محسوس کرتا ہے چنانچہ اس تشنگی کو اپنی

حماقت کی بنا پر جام آتشیں سے بجھاتا ہے اور اس کا نتیجہ "خمار" کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور اس کے رفع کرنے کے لئے "صبوحی" درکار ہوتی ہے صبوحی (صبح کی شراب) سے پھر خمار لاحق ہوتا ہے اس کو دفع کرنے کے لئے پھر شراب پیتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ساری عمر اسی خمار اور سکر کے چکر میں گرفتار رہ کر حیوانوں کی سی زندگی بسر کرنے کے بعد راہی ملک عدم ہو جاتا ہے لیکن روح کے رقص کا صلہ ایسا عظیم الشان ہے کہ تیرے تصور میں بھی نہیں آسکتا جو شخص اپنی روح کو رقص کرنا سکھا دیتا ہے۔ فرشتے درویشی کا تاج اس کے سر پر رکھ دیتے ہیں۔ کون سی درویشی۔

ع وہ درویشی کہ اس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

حصّہ پنجم

سیاسیاتِ مشرق و مغرب

تمہید۔ اس باب میں اقبال نے اہلِ مغرب کی سیاست اور ان کے مختلف سیاسی نظاموں مثلاً اشتراکیت۔ جمہوریت۔ ملوکیت اور آمریت پر تبصرہ کیا ہے اور مختلف پیرایوں میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ان کی سیاست اور ان کے سیاسی نظام سب کے سب عیّاری و مکّاری اور ظلم و ستم پر مبنی ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ اور اس کے رسول کے قانون سے بیگانہ بنا کر اپنی خواہشات کا غلام بنائیں اس لئے مسلمانوں کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ ابلیس لعین کے ان فرزندوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں۔

اشتراکیت

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار
جو حرفِ قُلِ العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

(:)

شرح مشکلات اقبال نے ضربِ کلیم کے علاوہ پیامِ مشرق، جاوید نامہ، بالِ جبریل۔ مثنوی۔ پس چہ باید کرد۔ اور ارمغانِ حجاز میں بھی بیسویں صدی کی اس جدید عالمگیر تحریک کے ہر پہلو پر مختلف پیرایوں میں نقد و تبصرہ کیا ہے اور انہوں نے اپنی تصانیف میں اس مبحث پر جس

قدر لکھا ہے اگر اس کو ایک جگہ جمع کر کے اس پر تبصرہ کیا جائے تو بلا شبہ پانچسو صفحے کی کتاب بن جائے گی میں اس شرح میں اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کر سکتا صرف دو باتوں پر اکتفا کروں گا۔

پہلی بات: اقبال کو کارل مارکس اور اشتراکیت سے جو کچھ دلچسپی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مذہب کے بعض اصول اسلامی اصولوں سے جزوی مشابہت رکھتے ہیں مثلاً دونوں سرمایہ داری کے دشمن ہیں ملوکیت کے دشمن ہیں۔ کلیسائی نظام کے دشمن ہیں دونوں محنت کش طبقے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور دونوں طبقہ داری کشمکش سے معاشرہ کو آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔

دوسری بات: لیکن اقبال کو کارل مارکس کے نظریہ سے پیدا شدہ تمام نتائج سے شدید اختلاف ہے اس لئے کہ ان سب کی بنیاد جدلیاتی مادیت اور عمل و ردِّ عمل کے فلسفہ پر ہے اور ظاہر ہے کہ اسلام بلا واسطہ موثر خدا کو تسلیم کرنے کے بعد کسی ایسے نظریہ کا حامی نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد خالص مادیت پر ہو۔ کارل مارکس (Karl Marx) جو حکیمانہ اشتراکیت (Scientific Socialism) کا بانی ہے۔ یہودی الاصل تھا ۱۸۱۸ء میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ اور ہیگل کے مشہور متبع فائر باخ (Ludwig Feuerbach) کی تصانیف کی بدولت ہیگل کے فلسفہ کا پیرو بن گیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا ہو گیا اور اس نے خدا اور مذہب دونوں کا انکار کر دیا چنانچہ اس کا یہ فقرہ بہت مشہور ہے۔ (مذہب عوام کے لئے

بمنزلہ افیون ہے)

سیاسی اختلافات کی بناء پر ارباب حکومت نے اس کو جلاوطن کردیا چنانچہ اس نے کچھ عرصہ بادیہ پیمائی کرنے کے بعد لندن میں سکونت اختیار کرلی اور وہیں بحالت عسرت ۱۸۸۲ء میں وفات پائی اس کی مشہور تصنیف سرمایہ (Das Kapital) ہے جس میں اس نے ہیگل کے مشہور جدلیاتی طریق (Dialectic Method) کی مدد سے اپنے معاشی نظام کو مدوّن کیا ہے اور روس کے اشتراکی اس کتاب کو وہی مرتبہ دیتے ہیں جو عیسائی لوگ بائیبل کو دیتے ہیں اقبال نے مارکس کے فلسفہ یا معاشی نظام پر اس شعر میں بہت جامع تبصرہ کردیا ہے۔

دین آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

اس مختصر تمہید کے بعد اب نظم کا مطلب لکھتا ہوں۔

پہلا شعر:۔ قوموں کی روش توضیح طلب ہے۔ واضح ہو کہ معاشیات کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ زر (سرمایہ) موجب پیداوار دولت ہے یا محنت؟ بالفاظ دگر سوال یہ ہے کہ مؤثر اول کون ہے؟ سرمایہ یا مزدور؟ اسی کو عرف عام میں یوں کہتے ہیں کہ آج کل سرمایہ اور مزدور میں جنگ ہے۔ یورپ و امریکہ کی اکثر و بیشتر قوموں کی روش یہ ہے کہ سرمایہ موجب پیداوار دولت ہے اس کے مقابلہ میں اشتراکیت یہ کہتی ہے کہ یہی تو فساد کی جڑ ہے سرمایہ نہیں بلکہ محنت موجب پیداوار دولت ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یورپ

کی قوموں کی روش سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشتراکی روش (Reason) نے جو طریق کار اختیار کیا ہے وہ بے سود نہیں ہے اس سے ایک بڑا فائدہ مرتب ہونے کی امید ہے۔

دوسرا شعر:۔ حقیقت یہ ہے کہ زمایہ سرمایہ داری کے فرسودہ طریقہ سے بیزار ہو چکا ہے اس لئے فکر انسانی نئے طریقے ایجاد کرنے پر مجبور ہو گئی ہے اور وہ نیا طریقہ یہ ہے کہ سرمایہ نہیں بلکہ محنت موجب پیدا وار دولت ہے۔

تیسرا شعر:۔ انسان کی ہوس (دولت جمع کرنے کی خواہش) نے جن اسرار کو عوام کی نظروں سے پوشیدہ رکھا تھا وہ اسرار اب کھلتے نظر آتے ہیں۔ اسرار سے اقبال کی مراد محنت کا مؤثر اول ہونا ہے اور اسی نکتہ یا اصول کو یورپ کے سرمایہ داروں نے عوام سے پوشیدہ رکھا تھا۔

چوتھا شعر:۔ اندریں حالات میں مسلمانوں کو قرآن مجید میں تدبّر کی دعوت دیتا ہوں تاکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو سکیں کہ دنیا میں قرآنی اصول کے رائج ہونے کا وقت آگیا ہے یعنی جو اصول قرآن حکیم نے پیش کئے ہیں دنیا ان اصولوں کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو رہی ہے۔

نوٹ:۔ اسی بات کو علامہ اقبال نے ارمغانِ حجاز میں ابلیس کی زبان سے یوں ادا کیا ہے۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

پانچواں شعر:۔ چونکہ قرآن مجید کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے شاید اس دور میں اس کی حقیقت نمودار ہو جائے وہ آیت یہ ہے۔ وَ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ یعنی لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کیا یعنی کس قدر مال خرچ کریں آپ کہہ دیجئے کہ جو تمہارے ذاتی خرچ سے بچے۔ یعنی ضروری اخراجات زندگی کے لئے پس جس قدر روپیہ تمہارے پاس بچے وہ سب اللہ کی راہ میں صرف کر دو اسی آیت کا ترجمہ اقبال نے جاوید نامہ میں اس طرح کیا ہے۔

بامسلماں گفت جاں بر کف بنہ

ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ

عَفْوَ کے لغوی معنی زیادتی یا زائد کے ہیں یعنی مَازَادَ عَلَى الْحَوَائِجِ الْاَصْلِيَّةِ وَالْقُوَّةِ الْمُوَلِّدَةِ۔ یعنی جو چیز بھی انسان کی اصلی حاجات اور قوتِ مولدہ سے زائد ہو وہ عفو ہے۔

واضح ہو کہ اس آیت میں قرآن مجید نے فرد اور مملکت کے مابین معاشی تعلق کو واضح فرمایا ہے کہ ضرورت کے وقت مملک افراد سے وہ تمام روپیہ جو ان کی جائز ضروریات سے زائد ان کے پاس جمع ہو۔ لے سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی نظام حکومت میں بیک جنبشِ قلم سرمایہ داری ختم ہو سکتی ہے اور ہو جاتی ہے سرمایہ داری تو پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب فالتو روپیہ ہمیشہ کسی کے پاس جمع ہوتا رہے اور افراد کے بجائے سارا قومی سرمایہ مملکت کی تحویل میں آجاتا ہے اور مملکت اس قومی سرمایہ کو مفاد عمومی کے لئے استعمال کر سکتی

ہے اور کرتی ہے اس لئے دولت چند افراد میں محدود ہو جانے کے بجائے عوام الناس یعنی تمام افراد قوم کے لئے باعثِ آسائش بن جاتی ہے اور امیر و غریب کا شدید امتیاز تقریباً مٹ جاتا ہے اور یہی اسلام چاہتا ہے کہ ہر شخص آسائش کی زندگی بسر کرے یہ طریق کار اسلامی نظامِ معیشت کے بالکل خلاف ہے کہ قوم کے معدودے چند افراد تو عیش کریں کروڑ پتی بن جائیں اور اکثریت نانِ شبینہ کے لئے بھی ترستی رہے۔

جب یہ مسلّم ہے کہ دولت مزدور کی محنت سے پیدا ہوئی ہے تو کیا اس سے بڑھ کر کوئی ظلم ہو سکتا ہے کہ وہی مزدور نانِ شبینہ کا محتاج ہو۔

ع کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

میری رائے میں اقبال نے یہ شعر نہیں لکھا ہے بلکہ اسلامی نظامِ معیشت کی روح دو مصرعوں میں بیان کر دی ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

سرمایہ دارانہ نظام سے اقبال کو جس قدر نفرت تھی وہ پوری شدّت کے ساتھ اس شعر میں جلوہ گر ہے۔

آمدم برسرِ مطلب۔ اقبالؔ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ روس کے اس طرزِ عمل سے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ اس آیت کی صداقت دنیا پر آشکارا ہو جائیگی اس تمام نظم کو غور سے پڑھنے کے بعد اب پھر پہلے شعر کو پڑھئے تو اس کی سچائی واضح ہو جائے گی یعنی روس کی روش بے سود نہیں ہے یعنی اسلام کے حق ضرور مفید

ثابت ہوگی۔

اشتراکیت کا فتنہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کو روٹی تو دیتی ہے لیکن روح کو فنا کر دیتی ہے۔ جیسا کہ جاوید نامہ میں ہے۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لا سلا طین لا کلیسا لا الٰہ

کارل مارکس کی آواز

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش
تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش! مربع و کج دار کی نمائش
جہانِ مغرب کے بت کدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی نمائش

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے اشتراکیت کے بانی کی تعلیمات کی ایک خصوصیت کو واضح کیا ہے جو یہ ہے کہ نظام

معیشت ایسا ہونا چاہیئے جس میں مزدور کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل سکے اور سرمایہ داری میں سب کچھ ہے لیکن یہی چیز نہیں ہے تو اس سرمایہ داری کے فقدان سے یہ دنیا جہنم بن گئی ہے اس ملعون نظام میں مزدور (محنت کش طبقہ) انسان کے درجہ سے گر کر حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتا ہے کیونکہ بعض سرمایہ داروں کے کتّے بھی مزدوروں سے بہتر زندگی بسر کرتے ہیں کیا یہ انتہائی ظلم وستم نہیں کہ جو مزدور دولتمندوں کے لئے عالیشان محلات تعمیر کرتا ہے وہ خود فٹ پاتھ پر اپنی بے کیف زندگی کے دن ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کاٹتا ہے۔ اقبال نے مزدور کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں تین شعر ہیں جو میں اس جگہ لکھتا ہوں،

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد　　آبروئے دخترِ مزدور بُرد
در حضورش بندہ می نالد چو نے　　برلبِ او نالہ ہائے پے بہ پے
نے بجامش بادہ ونے در سبوست
کاخہا تعمیر کردہ خود بکوست

یعنی سرمایہ دار مزدور سے روٹی بھی چھین کر کھا جاتا ہے اور اس کی بیٹی کی آبرو بھی لے لیتا ہے[1]۔ مزدور کی حالت یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار (زمیندار) کے سامنے گریہ وزاری کرتا ہے بلکہ اس کی پوری زندگی ایک مسلسل فریاد ہے

---

[1] شاعری نہیں ہے بالکل حقیقت ہے اگر کسی کو شک ہو تو وہ دیہات میں جا کر اپنی آنکھوں سے اس تلخ حقیقت کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔

حد یہ ہے کہ روٹی جس کے لئے وہ بیچارہ دن رات محنت کرتا ہے نہ اس کے پیٹ میں ہے نہ ہاتھ میں ہے۔ ظلم کی انتہا یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار کے لئے قصر تعمیر کرتا ہے لیکن خود بے گھر رہتا ہے اسی کی محنت سے سرمایہ دار سوٹ پہنتا ہے لیکن وہ خود نیم عریاں پھرتا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب میں نظم کا مطلب لکھتا ہوں۔

پہلا شعر:۔ کارل مارکس ان علمائے معاشیات سے جو سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت کرتے ہیں۔ کہتا ہے کہ تم لوگ جس قدر اپنے علم و فن کی نمائش کرتے ہو سب بیکار ہے تمہارا علم فرسودہ ہو چکا ہے لوگوں کی مالی مشکلات کو حل نہیں کر سکتا اس لئے دنیا کو اب علم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا شعر:۔ اس کے علاوہ تمہاری کتابوں میں رکھا ہی کیا ہے تم لوگ دولت کی پیداوار کے نقشے بنا بنا کر صفحات سیاہ کرتے ہو اور مرنیہ دکھدار کے اصول کی حمایت کرتے ہو یعنی محنت کش طبقہ کو امیدیں تو بڑی بڑی دلاتے ہو لیکن عملاً اِن کی بہبود کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ تمہاری یہ منصوبہ بندیاں سب کاغذ کے پھول ہیں جن میں رنگ تو ہے لیکن خوشبو بالکل نہیں۔

تیسرا شعر:۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی خانقاہیں کلیسائیں اور مدرسے یہ سب دھوکہ کی ٹٹیاں ہیں ان کے اندر عقل انسانی ان سرمایہ داروں کی ہوس دولت کی تکمیل کے لئے عیّاری سے کام لے کر مزدوروں کو غلام بنانے کے طریقے ایجاد کرتی رہتی ہے۔

(٭)

انقلاب

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات
خودی کی موت ہے یہ اور وہ ضمیر کی موت
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آ گئی شاید جہانِ پیر کی موت

(⁂)

شرح مشکلات

پہلا شعر: اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ زندگی کا سوز و ساز نہ ایشیا میں کہیں موجود ہے نہ یورپ میں یعنی انسان اپنی زندگی کا مقصد نہ ایشیا میں رہ کر حاصل کر سکتا ہے نہ یورپ میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ایشیا میں تو غلامی کی وجہ سے لوگوں کی خودی مردہ ہو چکی ہے اور یورپ میں لادینی اور اشتراکیت کی بدولت ضمیر فنا ہو چکا ہے (ضمیر کا وجود ایمان باللہ پر موقوف ہے) چونکہ بنی آدم اس مہمل طرزِ زندگی سے تنگ آ چکے ہیں اس لئے ان کے دلوں میں اس فرسودہ نظام کو تباہ کرنے کا ولولہ پیدا ہو گیا ہے اندریں حالات میرا قیاس یہ ہے کہ جہانِ قدیم کی وفات کا زمانہ قریب سے قریب آ گیا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اقبال کی یہ پیشگوئی کچھ تو دوسری جنگ عظیم

میں پوری ہو چکی ہے اور باقی ماندہ آئندہ کچھ سالوں میں پوری ہو جائے گی کیونکہ وہ دن دور نہیں جب روس کی مادہ پرستی اور امریکہ کی زبردستی میں فیصلہ کن جنگ ہو گی اور یہ دونوں طاغوتی طاقتیں آپس میں لڑ کر فنا ہو جائیں گی۔ یعنی مغربی تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی اور اس خاکستر سے نئی دنیا پیدا ہو گی جس کی مخلوق ابلیس کے بجائے اللہ کی مرضی پر چلے گی۔ کیا خوب اقبال نے کہا ہے۔

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

خوشامد

میں کارِ جہاں سے نہیں آگاہ ولیکن
اربابِ نظر سے نہیں پوشیدہ کوئی راز
کر تو بھی حکومت کے وزیروں کی خوشامد
دستور نیا اور نئے دور کا آغاز
معلوم نہیں ہے یہ خوشامد کہ حقیقت
کہہ دے کوئی اُلّو کو اگر "رات کا شہباز

شرح مشکلات | یہ نظم اقبال نے ۱۹۳۵ء کے آخر میں لکھی تھی جب قانونِ ہند مجریہ ۱۹۳۵ء نیا نیا نافذ ہوا تھا اور اس کی رو سے اہل ہند کو پہلی مرتبہ صوبہ وار داخلی آزادی یا (پراونشل اٹانومی) حاصل ہوئی تھی۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ میں دنیا حاصل کرنے کے طریقوں سے پورے طور پر واقف نہیں ہوں لیکن ارباب نظر کی صحبت میں کچھ دنوں بیٹھنے کی بدولت مجھے بھی اس کے حصول کا طریقہ معلوم ہو گیا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر تو عہدہ، خطاب، جاگیر یا ٹھیکہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو حکومت رائج الوقت کے وزیروں کی کوٹھیوں کا طواف کر نیا دستور (قانون) نافذ ہو رہا ہے اور نئے دور کا آغاز ہے اس وقت دنیا حاصل کرنے کا بہترین موقعہ ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ

ع کر تو بھی حکومت کے وزیروں کی خوشامد

تیسرا شعر:۔ لیکن خوشامد بذات خود ایک فن (آرٹ) ہے مثلاً الّو (owl) کو اگر آپ اُلّو کہہ کر خطاب کریں گے یا اس سے کہیں گے کہ جناب آپ تو اُلّو ہیں تو وہ ضرور ناراض ہو جائے گا۔ کیونکہ حقیقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے (Truth is always bitter) لہٰذا آپ اپنی گفتگو میں آرٹ پیدا کیجئے یعنی خوشامد کیجئے مگر خوبصورتی کے ساتھ ادب کی موجودہ اصطلاح میں اس بات کو یوں ادا کرتے ہیں کہ خوشامد بھی ایک فن ہے یعنی یوں

کہئے کہ آپ تو رات کے شہباز ہیں۔

مناصب

ہوائے بندۂ مومن فسونیِ افرنگ
اسی سبب سے قلندر کی آنکھ ہے نمناک
ترے بلند مناصب کی خیر ہو یا رب
کہ ان کے واسطے تو نے کیا خودی کو ہلاک
مگر یہ بات چھپائے سے چھپ نہیں سکتی
سمجھ گئی ہے اسے ہر طبیعتِ چالاک
شریکِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے
خریدتے ہیں فقط ان کا جوہرِ ادراک

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے ہندوستان کے ان مسلمانوں کی غیر اسلامی ذہنیت پر ماتم کیا ہے جنہوں نے بلند مناصب کے لئے مذہب اور ملت دونوں سے غداری کی ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ:-

پہلا شعر:۔ میں ان مسلمانوں کی ضمیر فروشی پہ ماتم کرتا رہتا ہوں جنہوں نے چند روزہ زندگی کے لئے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے غدّاری کر کے انگریزوں سے جاگیریں۔ خطاب یا عہدے حاصل کئے۔

دوسرا و تیسرا شعر:۔ اے مسلمان! میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تیرے ان عہدوں کو قائم رکھے اور تو ساری عمر کتوں کے شکار میں مصروف رہے کیونکہ تو نے ان نعمتوں کو اپنی خودی (ضمیر اور ایمان) جیسی بیش قیمت چیز انگریز کے ہاتھ بیچ کر خریدا ہے لیکن ایک بات میں تجھ سے ضرور کہوں گا کیونکہ ہر عقلمند آدمی اس کو جانتا ہے اور وہ یہ ہے کہ۔

چوتھا شعر:۔ کوئی حکمراں قوم محکوم قوم کو حکومت میں شریک نہیں کیا کرتی وہ خطابات دے کر یا عہدے عطا کر کے صرف غلاموں کی عقل و خرد خرید لیتی ہے تاکہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں استعمال کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ ملک کے بہی خواہوں نے ساری عمر کوئی خطاب قبول نہیں کیا اس کا صلہ اللہ نے انہیں یہ دیا آج ملک میں انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے اس جذبۂ خودی کی تعریف بھرپور کی جاتی ہے جو بالکل واضح ہے۔

یورپ اور یہود

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محرومِ تسلّی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلّی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جوانمرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولّی

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ مغربی تہذیب بہت جلد فنا ہونے والی ہے اور چونکہ یہودی قوم دولتمند بھی ہے اور مذہب دوست بھی ہے اس لئے ممکن ہے کہ کلیسائی نظام ان کے قبضہ میں آجائے یعنی سیاسی اور مذہبی اقتدار انہیں حاصل ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ۔

پہلا شعر:۔ یورپ کی حکومتوں کے عہدیدار اور نیز وہ لوگ جو وہاں برسرِ اقتدار ہیں اور تاجر پیشہ لوگ اور عوام سبھی لوگ عیش و عشرت میں غرق ہیں۔ زنا، شراب اور قمار بازی ان کی زندگی کے اجزائے لاینفک بن گئے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عیش و عشرت کے باوجود ان کو اطمینان قلبی حاصل

نہیں ہے۔

دوسرا شعر:۔ یورپ کی فضا مشینوں کے دھوئیں سے بالکل تاریک ہوگئی ہے یعنی وہاں کے لوگوں کے دل۔ مادہ پرستی اور ہوسِ زر کی وجہ سے بالکل سیاہ ہوگئے ہیں روحانیت اور تقویٰ کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے اندریں حالات یہ گناہوں کی بستی اس لائق نہیں ہے کہ یہاں اللہ کی رحمت نازل ہو۔

تیسرا شعر:۔ اس لئے یورپین تہذیب (جس پر ہندو پاک کے حضرات اور خواتین دونوں مرمٹے ہوئے ہیں) چند روزہ کی مہمان معلوم ہوتی ہے عنقریب اس کا خاتمہ ہوجائے گا اور بہت ممکن ہے کہ یورپ کے یہودی چونکہ وہ بے انتہا مالدار ہیں (اور طاقت دراصل مالدار طبقہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے) یورپ میں مذہبی اور سیاسی اقتدار حاصل کرلیں۔

نفسیاتِ غلامی

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی حکما بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ

بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

(❁)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ جب کوئی قوم غلام ہو جاتی ہے تو اس قوم کے شعراء علما اور حکما سب کی ذہنیت غلامانہ ہو جاتی ہے اور یہ لوگ ادب علم اور فلسفہ کے مسائل کی تشریح اس انداز سے کرتے ہیں کہ قوم کے اندر غلامی کے جذبات پختہ تر ہو جائیں۔ کہتے ہیں کہ۔

پہلا شعر:۔ غلام قوموں میں بھی شعراء۔ علما اور حکما پیدا ہوتے ہیں۔

دوسرا و تیسرا شعر:۔ اگرچہ یہ لوگ مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہیں لیکن مقصد ان سبھوں کا ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ شیروں کو بزدلی اور مقابلہ سے فرار کا سبق پڑھایا جائے تاکہ بہادری اور سرفروشی کا جذبہ پیدا نہ ہو سکے۔

چوتھا شعر:۔ یہ لوگ علمی اور مذہبی مسائل کی تاویل و تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ غلام اپنی غلامی پر راضی رہ سکیں اور حکمراں طبقہ کے خلاف علم

آزادی بلند نہ کر سکیں۔

بلشویک روس

روش قضائے الٰہی کی ہے عجیب و غریب
خبر نہیں کہ ضمیرِ جہاں میں ہے کیا بات
ہوئے ہیں کسرِ چلیپا کے واسطے مامور
وہی کہ حفظِ چلیپا کو جانتے تھے نجات
یہ وحی دہریتِ روس پر ہوئی نازل
کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات و منات

شرح مشکلات

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ نظام کائنات کس طریق پر چل رہا ہے کیونکہ مشیت ایزدی کے طریقے فہم انسانی سے بالکل بالاتر ہیں۔

دوسرا شعر:۔ مثلاً وہی روسی عیسائی جو کلیسا کی حفاظت کو اپنے لئے باعثِ نجات سمجھتے تھے اب خود کلیسائی نظام کو تباہ کر رہے ہیں

تیسرا شعر:۔ اللہ نے روس کے ان لامذہبوں کے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ عیسائیوں کے قائم کردہ کلیسائی نظام کو فنا کر دو۔

آج اور کل

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

(٭)

شرح مشکلات

اس چھوٹی سی نظم میں اقبال نے حال اور مستقبل کے ربط کو واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ۔

پہلا شعر:۔ جو قوم آئندہ زمانہ میں عروج کے لئے اپنے آپ کو آج تیار نہیں کرتی وہ کبھی آئندہ زمانہ میں سربلندی حاصل نہیں کر سکتی جو قوم آج کوشش نہیں کرتی وہ کل کامیاب بھی نہیں ہو سکتی۔

دوسرا شعر:۔ جو قوم حال کی قدر نہیں کرتی اور موجودہ وقت کو ضائع کر دیتی ہے وہ مستقبل میں برسر اقتدار نہیں ہو سکتی اور آئندہ زمانہ میں کوئی ہنگامہ برپا نہیں کر سکتی غرض کسی قوم کے مستقبل کا اندازہ اس قوم کی موجودہ حالت سے بآسانی کیا جا سکتا ہے جو قوم آج غافل ہے کل ضرور ناکام ہو گی یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم آج کا دن تو سونے میں ضائع کر دیں اور کل

میدان جنگ میں کامیاب ہو جائیں۔

مشرق

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا
نسیمِ صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ مشرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ مشرقی قوموں کو ابھی تک کوئی صحیح رہنما نصیب نہیں ہوا۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر: میرے کلام اور پیغام کی بدولت عوام کے اندر تو کچھ بیداری پیدا ہو گئی ہے یعنی مغربی اقوام کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے لیکن عوام کا یہ جذبۂ حریت ابھی تک کسی رہنما کی تلاش کر رہا ہے۔

دوسرا شعر: مشرقی قوموں کو مغرب کی غلامی سے آزاد کرنے

کی اہلیت مصطفےٰ کمال پاشا میں تھی نہ رضا شاہ میں اس لئے مشرقی قومیں ابھی تک کسی صحیح رہنما کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

واضح ہو کہ مصطفیٰ کمال نے ترکوں کو اور رضا شاہ نے ایرانیوں کو مغرب کی غلامی سے آزاد کرنے کی جو کوششیں کیں وہ سب ناقص اور سطحی تھیں ان دونوں حکمرانوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ اگر ہم ترکوں اور ایرانیوں کو مغربی تمدن کے سانچہ میں ڈھال دیں تو یہ لوگ آزاد ہو جائیں گے حالانکہ سیاسی غلامی سے نجات پانے کے لئے سب سے پہلے ذہن کو آزاد کرنا ضروری ہے اور ذہنی تربیت کا فرض ان دونوں میں سے کسی نے انجام نہیں دیا۔

تیسرا شعر:۔ کہتے ہیں کہ میں نے مشرقی قوموں کو بیدار کرنے کے لئے جو کوشش کی ہے مغربی اقوام کی نگاہ میں یہ بہت بڑا جرم ہے یعنی ان کے زاویۂ نگاہ سے میں نے بہت بڑا قصور کیا ہے جس کی سزا ضرور ملنی چاہیئے لیکن ان دشمنان دین کو ابھی تک میرے پیغام کی تاثیر کو فنا کرنے کے لئے کوئی ذریعہ یا طریقہ ہاتھ نہیں آیا ہے۔ اس لئے یہ قومیں رات دن اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ کوئی ایسی تحریک جاری کریں جس کی بناء پر مسلمانوں کی توجہ میرے پیغام سے ہٹ کر غیر ضروری امور پر مبذول ہو جائے اور وہ غلامی سے نجات پانے کے لئے کوئی مؤثر کوشش نہ کر سکیں۔

نوٹ:۔ اشتراکی ترقی پسند ادیبوں کی اقبال دشمنی کا باعث بھی یہی جذبۂ انتقام ہے۔

سیاستِ افرنگ

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

—(❁)—

شرح مشکلات اس چھوٹی سی نظم میں اقبال نے ہمیں بڑے دلپذیر انداز میں یہ بتایا ہے کہ فرنگی سیاست سراسر شیطانی کاروبار ہے اس نظم کا اسلوب بیان اس لئے مؤثر ہو گیا ہے کہ علامہ اقبال نے خدا سے خطاب کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ :-

پہلا شعر:- اے خدا! یہ مغربی سیاست بھی خدائی کی مدّعی ہے فرق اتنا ہے کہ تیری پرستش امیر اور غریب دونوں کرتے ہیں لیکن اس کے پجاری صرف امیر اور رئیس ہیں۔

دوسرا شعر:- اور دوسرا فرق یہ ہے کہ تو نے آگ سے صرف ایک ابلیس بنایا لیکن اس سیاست نے خاک سے لاکھوں ابلیس بنا ڈالے مطلب یہ ہے کہ ہر فرنگی سیاست داں شیطان کا مرید ہے اور اللہ کا منکر ہے۔

—(❁)—

خواجگی

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم
اہلِ سجّادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ مہری کا ہے زور
سینکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام
خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی
پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

(:)

شرح مشکلات | نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ دنیا کا رنگ جو آج سے دو ہزار سال پہلے تھا وہی آج ہے جس طرح پہلے آقا اور غلام کا طبقہ موجود تھا آج بھی موجود ہے جس طرح قدیم زمانہ کے دولت مند روپے کے زور سے انسانوں کو اپنا غلام بناتے تھے اسی طرح آج بھی بنا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ :-

پہلا شعر:- دنیا کے طور طریقے آج بھی وہی ہیں جو صدیوں پہلے تھے دنیا کی ظاہری شکل بدل گئی ہے لیکن انسان کی خو اور عادت بالکل نہیں بدلی۔ مثلاً پہلے زمانہ میں اگر مذہبی پیشوا لوگوں کو اپنا غلام بناتے تھے تو

زمانہ میں یہ نیک کام اہل سیاست انجام دے رہے ہیں۔

دوسرا شعر:- آج بھی یہی کیفیت ہے کہ یا تو اہل سجادہ یعنی مذہبی پیشوا لوگوں پر حکمراں ہیں یا اہلِ سیاست یعنی ارباب حکومت لوگوں کو اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں اور اس میں نہ تو ان کی پیری کو خاص دخل ہے نہ ان کی میری (حکومت) کو قصہ اصل میں یہ ہے کہ عوام الناس ہزاروں سال سے غلامی کے خوگر ہیں۔

تیسرا شعر:- اور جب غلام خوئے غلامی میں پختہ ہو جاتے ہیں تو پھر خواجگی میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی بنی آدم غلامی کے عادی ہو چکے ہیں جس شخص میں تھوڑی سی بھی "عقل" ہوتی ہے وہ مذہبی یا سیاسی قیادت کا لبادہ اوڑھ کر عوام کو بآسانی اپنا غلام بنا لیتا ہے کوئی صالح قیادت کا جال بچھاتا ہے تو کوئی فلاح کے نام سے اپنی دوکان چمکاتا ہے چنانچہ ہماری بوڑھیاں اقبال کے اسی پیش کردہ نکتہ کو اس آسان طریق سے بیان کیا کرتی تھیں۔

دنیا کو ٹھگو مکّر سے
روٹی کھاؤ گھی شکّر سے

غلاموں کے لئے

حکمتِ مشرق و مغرب نے سکھایا ہے مجھے
ایک نکتہ کہ غلاموں کے لئے ہے اکسیر
دین ہو فلسفہ ہو فقر ہو سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اگر کسی غلام کو آزادی حاصل کرنے کی تمنا ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ اپنے اندر ذوقِ یقین پیدا کرے چنانچہ بانگ درا میں لکھتے ہیں۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اب سوال یہ ہے کہ یہ ذوقِ یقین کیا چیز ہے؟ خود اقبال نے اس موضوع پر اس قدر لکھا ہے کہ ایک مقالہ مرتب ہو سکتا ہے۔ دو لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ اس قوم کے افراد اپنے اندر یہ عزم بالجزم پیدا کر لیں کہ دنیا کی کوئی طاقت

ہم کو غلام نہیں رکھ سکتی۔ ہم ضرور بالضرور آزادی حاصل کریں گے دراصل انسان کی قوتِ ارادی ذوقِ یقین کا لازمی نتیجہ ہے۔ کہتے ہیں کہ۔

پہلا شعر:۔ میں نے مشرقی اور مغربی فلسفہ کے مطالعہ سے ایک نکتہ اخذ کیا ہے جو غلاموں کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ دین۔ فلسفہ۔ فقر۔ درویشی سلطانی وحکمرانی غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں کامیابی کے لئے عقیدہ کی پختگی بہت ضروری ہے۔ اس اصل کی روشنی میں اگر غلام قوم کے افراد آزادی کے طالب ہوں تو انہیں سب سے پہلے اپنے عقائد کو پختہ کر لینا چاہئے یعنی پہلے یہ یقین پیدا کرنا چاہئے کہ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے کسی قوم کو حق حاصل نہیں کہ ہمیں غلام بنائے اس لئے ہم ضرور غلامی کی زنجیریں توڑ کر رہیں گے۔ اس محکم یقین کے بعد عمل پیہم کی مدد سے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

واضح ہو کہ قرآن مجید نے یقینِ محکم کو ایمان اور عملِ پیہم کو عملِ صالح سے تعبیر کیا ہے۔

تیسرا شعر:۔ اور جو قوم اپنے عقائد میں پختگی پیدا نہیں کرتی اس کی گفتگو میں کسی قسم کی تاثیر نہیں ہوتی اور اس کے اعمال میں کوئی سرگرمی یا طاقت پیدا نہیں ہو سکتی۔

نوٹ:۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے اقوام میں جو تاثیر اور اعمال میں جو سرگرمی پائی جاتی تھی وہ سب عقیدہ کی پختگی کا نتیجہ تھی آج اگر مسلمان یہ عزم کر لیں کہ ہم اپنے ملک کو آزاد کرا کے رہیں گے تو انشاء اللہ وہ بہت جلد اپنے ارادہ

میں کامیاب ہو جائیں گے ہمارے مرض کی دوا نہ لندن میں ہے نہ نیک سکیس میں بلکہ خود ہمارے اندر موجود ہے۔

اہل مصر سے

خود ابوالہول نے یہ نکتہ سکھایا مجھ کو
وہ ابوالہول کہ ہے صاحبِ اسرارِ قدیم
دفعتہً جس سے بدل جاتی ہے تقدیرِ امم
ہے وہ قوّت کہ حریف اس کی نہیں عقلِ حکیم
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیرِ محمدؐ ہے کبھی چوبِ کلیمؑ

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے مسلمانوں کو یہ بتایا ہے کہ کسی نظام زندگی کو رائج کرنے کے لئے محض عقل کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ قوت بھی ضروری ہے اگر قوت نہ ہو تو دستور العمل یا معاہدہ یا آئین کی قیمت ردّی کاغذ کے پرزے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ ابوالہول نے جو کائنات کے قدیم اسرار و رموز سے واقف ہے یہ نکتہ مجھے سمجھایا ہے کہ

دوسرا شعر:- جس چیز سے قوموں کی تقدیر دفعتًا بدل جاتی ہے وہ بے بہا چیز قوت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور یہ قوت وہ چیز ہے کہ حکما کی عقل بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی بقول شخصے کہ :-

ع بیکار ہے سب فلسفہ بندوق کے آگے

تیسرا شعر:- اگرچہ قوت کی صورت اور نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قوت کی ضرورت ہر زمانہ میں رہی ہے اور رہے گی یہی قوت (PPOPY) کبھی حضرت موسیٰؑ کے عصا کی شکل میں نمودار ہوتی ہے کبھی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔

قوت کے بغیر آپ بہتر سے بہتر نظام حیات کو بھی دنیا میں نافذ نہیں کر سکتے اسی لئے قرآن مجید نے جہاں مومنوں کو بہترین امت قرار دیا ہے وہاں ان کی ایک صفت یہ بھی بیان کی ہے کہ ان میں نیکی کا حکم دینے کی طاقت ہو گی اگر یہ طاقت نہ ہو تو پھر مومن مومن نہیں رہتا بلکہ راہب بن جاتا ہے۔ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ الخ یعنی اے مسلمانو تم بہترین قوم ہو جو انسانوں کی بھلائی کے لئے پیدا کی گئی ہو اور تمہاری خصوصیت یہ ہے کہ تم بھلائی اور نیکی کا حکم کرتے ہو۔

اب یہ بات ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ نیکی کا حکم وہی شخص دے سکتا ہے جس میں حکم دینے کی قوت ہو۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے اسی نکتہ کو اس شعر میں بیان کیا ہے۔

نہ ہو مذہب میں گر زورِ حکومت
تو وہ کیا ہے نرا اک فلسفہ ہے

میں نے اس کا فارمولا بنایا ہے جو حسب ذیل ہے۔

حق مع القوۃ — دین یا مذہب
حق بغیر القوۃ — فلسفہ یا تصوف

Truth plus Power = Religion
Truth without power = philosophy.

(÷)

ابی سینیا

(۱۸- اگست ۱۹۳۵ء)

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ قاش قاش
تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش
اے وائے آبروئے کلیسا کا آئنہ
رومانے کر دیا سرِ بازار پاش پاش
پیرِ کلیسیا! یہ حقیقت ہے دلخراش

(÷)

شرح مشکلات

جب ۱۸ اگست ۱۹۳۵ء کو اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ اٹلی نے بلا وجہ ابی سینیا (Abyssinia) پر حملہ کر دیا ہے تو علامہ کو بہت افسوس ہوا اور انہوں نے اپنے تاثرات قلبی کا اس طرح اظہار کیا۔

پہلا شعر:۔ یورپ کی مردار خور (بلکہ حرام خور) حکومتوں نے اٹلی کے اس ظالمانہ اقدام کی کوئی مذمت نہیں کی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان شیطانی حکومتوں نے دل میں یہ سوچا ہے کہ جب اطالیہ اس ملک کو فتح کرے گا تو ہم بھی اپنا حصہ لینے پہنچ جائیں گے لیکن یورپ کے اِن گدھوں کو ابھی یہ خبر نہیں ہے کہ ابی سینیا (حبشہ) کی لاش اس قدر زہر آلود ثابت ہو گی کہ جو کھائے گا وہ مر جائے گا۔

واضح ہو کہ اقبال نے یہ پیشگوئی ۱۹۳۵ء میں کی تھی جبکہ دوسری جنگ عظیم کے آثار کہیں نمایاں نہیں تھے لیکن ان کی یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہو گئی۔(۱) مسولینی کو جس نے ایک بے گناہ ملک پر چڑھائی کی تھی سپاہی کی موت نصیب نہیں ہوئی بلکہ وہ ایک کتے کی موت مارا گیا۔

(ب) علاوہ بریں چار سال کے بعد تمام اقوام یورپ جنہوں نے اس ظلم کا تماشا دیکھا تھا اور ظالم کی مذمت سے چشم پوشی کی تھی۔ قہر الٰہی میں گرفتار ہو گئیں۔ اس نے بھی عذاب کا بھیانک منظر دیکھا۔

دوسرا شعر:۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تہذیب مغرب اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی ہے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نام نہاد تہذیب نے اہل یورپ کو شرافت سے بالکل معرّا کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان مہذب قوموں

نے لوٹ مار اور قتل و غارت کو اپنا ذریعۂ معاش بنا رکھا ہے جس طرح بھڑیا بے گناہ بھیڑ بکریوں کی تلاش میں رہتا ہے اسی طرح یہ اقوام بے گناہوں کا خون بہاتی رہتی ہیں۔

تیسرا شعر:۔ افسوس! اٹلی نے حبشہ پر حملہ کر کے کلیسا (مسیحیت) کی عزت سر بسر خاک میں ملادی اور پیر کلیسا یعنی پوپ آف روم کو بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اٹلی کا یہ فعل انسانیت کی توہین ہے

نوٹ:۔ اقبالؔ نے پوپ پال سے خطاب کر کے دراصل اس اعتراض کا جواب دیا ہے جو کلیسا اسلام پہ کیا کرتی تھی کہ اسلام غارتگری کی تعلیم دیتا ہے (حالانکہ اسلام مسلمانوں کی بداعمالیوں کا ذمہ وار نہیں ہے) علامہ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ پوپ اٹلی کے اس ظالمانہ اقدام کی کیا توجیہ کرے گا؟ یہی نا کہ مسیحیت عیسائیوں کے افعالِ بد کی ذمہ وار نہیں ہے تو یہی جواب ہم بھی دے سکتے ہیں۔ پہلے شعر میں علامہ نے جو پیش گوئی[1] وہ حقیقت میں دنیا کے سامنے واضح ہو گئی

---

[1] علامہ مرحوم نے ۱۹۲۶ء میں مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر صرف پیشگوئیوں کو کسی شخص کے دعویٔ نبوت کی صداقت کا معیار قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر ان لوگوں کو چاہیئے کہ مجھے بھی فلکی نبی تسلیم کر لیں۔

ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام

(بھوپال (شیش محل) میں لکھے گئے)

لاکر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں
زنّاریوں کو دَیرِ کہن سے نکال دو
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیّلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
مُلّا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

شرحِ مشکلات اس نظم میں اقبال نے ایک دلکش انداز میں فرنگی سیاست کو بے نقاب کیا ہے عنوان کا مطلب یہ ہے کہ یورپ کی حکومتیں بلا استثنا، سب کی سب شیطان کی مطیع ہیں اور اسی کی معنوی اولاد ہیں۔ علامہ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:- ابلیس نے اپنے فرزندوں کو یہ حکم دیا ہے۔ کہ ہندوستان کے برہمنوں کو سیاسی مسائل میں اس حد تک الجھا دو کہ وہ اپنے مذہب کے اصول سے بیگانہ ہو جائیں۔

واضح ہو کہ ہندوؤں کے مذہب میں "دَیا" (یعنی دوسروں پہ مہربانی کرنا) سب سے بڑی نیکی ہے چنانچہ ان کی بعض مذہبی کتابوں میں یہ مقولہ درج ہے کہ "دَیا ہی دھرم ہے" لیکن ابلیسی سیاست نے ان کو مذہب سے بیگانہ کر دیا ہے۔

دوسرا شعر:- مسلمان اگرچہ فاقہ کش ہیں لیکن اس کے باوجود ہر وقت مذہب کے نام پہ سر کٹانے کے لئے تیار رہتا ہے اس لئے اس کے دل سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بالکل نکال دو۔

تیسرا شعر:- عربوں کو خوبصورت موٹریں ریشمی کپڑے اور دیگر سامانِ عیش و عشرت (خصوصاً ہر قسم کے اعلیٰ سگریٹ) کثیر تعداد میں سپلائی کرو اور ان کے خیالات کو اپنے سانچے میں ڈھال دو تاکہ حجاز اور یمن سے اسلام بالکل خارج ہو جائے اور یہ خطّہ بھی دوسرا عراق اور مصر بن جائے۔

چوتھا شعر:- اب رہے افغانی تو ان کا علاج یعنی ان کی دینی

غیرت کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ یہ سب لوگ ملّاؤں کے کہنے پہ چلتے ہیں اس لئے سرحد اور آزاد علاقہ اور افغانستان میں جس قدر علمائے کرام موجود ہیں سب کا خاتمہ کر دو۔

پانچواں شعر:۔ باقی ماندہ مسلمانوں کو ان کی قومی روایات سے بیگانہ کر دو اس کی صورت یہ ہے کہ ایسا لٹریچر شائع کرو جس کے مطالعہ سے مسلمان نوجوان اپنی ملّی روایات اور اپنے بزرگوں کے طور طریقوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں[1] اور اسی قسم کی کتابیں ان کے نصاب تعلیم میں داخل کر دو۔

واضح ہو کہ ابلیس اس تلقین کو ایک تشبیہ کے ذریعہ سے ذہن نشین کراتا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر آہو کو مرغزار ختن سے نکال کر کسی دوسرے ملک میں رکھا جائے تو وہ زندہ تو رہے گا لیکن اس کی ناف میں وہ جوہر پیدا نہ ہو سکے گا جس کی وجہ سے وہ ساری دنیا میں مشہور ہے اور تمام دنیا کے آہوؤں پر تفوق رکھتا ہے اسی طرح اگر تم (اہل انگلستان و فرانس و اطالیہ وغیرہ) مسلمانوں کو ان کی ملّی روایات سے بیگانہ بنا دو تو وہ حیوانات ناطق کی حیثیت سے زندہ تو رہیں گے لیکن ان کے دل میں وہ سوز پیدا نہ ہو سکے گا جس کی بدولت وہ کفر کا مقابلہ کر سکتے ہیں ان کا وجود و عدم دونوں یکساں ہو جائیں گے بایں معنی کہ وہ تمہارے یعنی میرے قائم کردہ نظام کو درہم برہم نہیں کر سکیں گے بلکہ صاف لفظوں میں اس "صداقت"

---

[1] نام نہاد ترقی پسند ادیب اس ابلیسی فرمان پر نہایت خلوص کے ساتھ عمل کر رہے ہیں۔

کا اعلان کریں گے کہ ۱۳۵۰ سال کا فرسودہ نظام اس ترقی یافتہ دور میں ہمارے لئے کارآمد نہیں ہو سکتا۔

چھٹا شعر:۔ اقبال کا جرم یہ ہے کہ وہ مسلمان نوجوانوں کے دل میں اسلام کی تڑپ پیدا کر رہا ہے اور انہیں عشق رسول کا درس دے رہا ہے لہٰذا اس کو یہ سزا دو کہ وہ چمن سے نکل جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کمیونسٹ ادیبوں اور شاعروں کو اقبال کی تحقیر اور اس کے کلام اور پیغام کی تردید و تنقیص پر آمادہ کردو۔

نوٹ:۔ واضح ہو کہ ہند و پاک کے کمیونسٹ ادیب نہایت منظم طریقے سے ابلیس کے اس مشورہ پر عمل کر رہے ہیں چنانچہ کوئی تو یہ کہتا ہے کہ اقبال فاشزم کا حامی تھا۔ مسلمانوں کو تیرہ سو سال کے غیر مہذب زمانہ کی طرف لے جانا چاہتا تھا اور کوئی یہ کہتا ہے کہ "اقبال کا پیغام قوموں کے بمنزلہ افیون ہے کیونکہ وہ ان کو مذہب اور خدا کا پابند بناتا ہے۔" مقصد ان تنزل پسندوں کا یہ ہے کہ اقبال پر ایسے ایسے الزامات عائد کرو اور اس کے کلام کو اس رنگ میں پیش کرو کہ مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ ہر سمجھدار آدمی کو اس سے نفرت ہو جائے یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ ادیب جب اقبال پر کچھ لکھتا ہے تو جب تک اس پر رجعت پسندی کا الزام عائد نہیں کر لیتا اپنے مقالہ کو مکمل نہیں سمجھتا اور ارباب نظر سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ کمیونزم کی لغت میں کسی شخص کی مذمت کے لئے رجعت پسندی سے شدید تر اور کوئی لفظ نہیں ہے میں اپنے اس دعوے کے ثبوت میں مسٹر عزیز احمد کی تازہ ترین تالیف موسومہ "اقبال نئی تشکیل" ص ۱۵۷ سے ایک

اقتباس پیش کرتا ہوں۔

جمال الدین افغانی کی زبانی اقبال نے ملوکیت اور اشتراکیت پر ایک ساتھ حملہ کیا ہے یہ ایسی غلطی ہے جو جمال الدین افغانی سے سرزد ہو سکتی ہے مگر الفاظ تو بہرحال اقبال کے ہیں اور اقبال کو اس مقام پر رجعت پسندی کے الزام سے بری کرنا مشکل ہے۔

واضح ہو کہ یہ الزام وہ شخص عائد کر رہا ہے جس نے اپنی کتاب میں اشتراکی ادیبوں کے مقابلہ میں کئی مقامات پر اقبال کی حمایت کی ہے لیکن بہرحال چونکہ مصنف خود اشتراکیت بلکہ اشتمالیت کا مقلد ہے اس لئے اقبال پر رجعت پسندی ہی کا الزام عائد کرنے سے وہ خود بھی باز نہ رہ سکا غالباً اس تصریح کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اقبال کا سب سے بڑا جرم یہی ہے کہ اس نے ملوکیت کے ساتھ اشتراکیت پر بھی حملہ کیا ہے اور یہ جرم مذہب اشتراکیت میں ناقابل معافی ہے اقبال ہی پر کیا منحصر ہے جو مسلمان بھی اشتراکیت پر اعتراض کرے گا وہ ان ترقی پسندوں کی رائے میں رجعت پسند قرار پائے گا۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ اس تعصب اور تنگ نظری کے باوجود یہ اشتراکی ادیب اپنے آپ کو ترقی پسند سمجھتے ہیں حالانکہ اگر ترقی پسندی اسی کا نام ہے۔ تو خدا معلوم تنزل پسندی کسے کہتے ہیں۔

جمعیت اقوام مشرق

(بھوپال (شش محل) میں لکھے گئے)

پانی بھی مسخّر ہے، ہوا بھی ہے مسخّر
کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

شرح مشکلات اقبال نے اس نظم میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر مسلمانانِ عالم (مسلمانوں کی حکومتیں) متحد ہو جائیں تو دنیا میں انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں۔

پہلا شعر:- میں نے مانا کہ مغربی اقوام نے سائنس میں بڑی ترقی کر لی ہے اور انسانوں کے علاوہ آج عناصر فطرت بھی ان کے محکوم ہیں لیکن اگر "فلکِ پیر" کے خالق کی نگاہ بدل جائے تو ان تمام اقوام کی سطوت و شوکت کا ایک آن میں خاتمہ ہو سکتا ہے۔

دوسرا شعر:- اور ان اقوام نے ایشیائی قوموں کو غلام بنانے کا جو منصوبہ باندھا ہے وہ سب یونہی دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔

تیسرا شعر:- اس کی صورت یہ ہے کہ مسلمان وہ طریقہ اختیار کریں جس کی بنا پر خالق کائنات کی نگاہ بدل سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام مسلمانانِ عالم متحد ہو جائیں اور جب وہ اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی مدد فرمائے گا کیونکہ اس کا قانونِ سنت اللہ یہی ہے کہ جب تک کوئی قوم خود اپنی زندگی کی گہرائیوں میں انقلاب نہیں پیدا کرتی اللہ بھی اس قوم کی تائید نہیں فرماتا۔ پس اگر وہ طہران کو عالم مشرق کا جنیوا بنالیں یعنی جس طرح مغربی اقوام نے اپنی جمعیت بنائی ہے (اشارہ ہے لیگ آف نیشنز کی طرف جس کا مرکز جنیوا تھا) وہ بھی اپنی جمعیت بنالیں تو گمان غالب یہی ہے کہ دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو سکتا ہے یعنی کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے گی۔

سلطانیِ جاوید

غوّاص تو فطرت نے بنایا ہے مجھے بھی
لیکن مجھے اعماقِ سیاست سے ہے پرہیز
فطرت گوارا نہیں سلطانیِ جاوید
ہر چند کہ یہ شعبدہ بازی ہے دلآویز

فرہاد کی خارا شکنی زندہ ہے اب تک
باقی نہیں دنیا میں ملوکیتِ پرویز

شرح مشکلات

اس نظم میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ افراد کی سلطنت ہمیشہ قائم نہیں رہتی لیکن ان کی جد وجہد کی داستان ہر زمانہ میں لوگوں سے خراج تحسین وصول کرتی رہتی ہے مثلاً اشوک نے تمام ہندوستان فتح کر کے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر دی تھی اگرچہ وہ تو اس کی وفات کے کچھ عرصہ کے بعد ختم ہو گئی لیکن اس نے بنی آدم کی بہتری کے لئے جو جد وجہد کی تھی اس کو صفت دوام حاصل ہو گئی اسی طرح بطلِ اسلام غازی صلاح الدین ایوبیؒ نے جو سلطنت قائم کی تھی وہ تو مٹ گئی لیکن اس کا کارنامہ ابھی تک زندہ ہے وہ کارنامہ کیا تھا؟ اس کی وہ جد وجہد جو اس نے اسلام کی سربلندی کے لئے کی تھی۔ غرض فطرت کو سلطانی جاوید پسند نہیں ہے خارا شکنی پسند ہے وہ سلطنتوں کو مٹاتی رہتی ہے لیکن جد وجہد کے ثمرات اور کارناموں کو باقی رکھتی ہے۔

پہلا شعر:۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ مجھے اللہ نے یہ لیاقت عطا فرمائی ہے کہ میں بات کی تہ کو پہنچ جاتا ہوں جس طرح غواص سمندر کی تہ میں پہنچ کر موتی نکال کر لاتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ لیکن میں سیاست کی گہرائیوں میں اس لئے غوطہ

زن نہیں ہوتا کہ فطرت کی نظر میں سلطنتوں کا قیام کوئی وقعت نہیں رکھتا سلطنتیں بنتی رہتی ہیں اور بلبلوں کی طرح ٹوٹتی رہتی ہیں پس جو شے بذات خود پائدار نہیں اس میں غور و خوض بھی چنداں مفید نہیں۔

جس طرح عقلمند آدمی کی نگاہ میں شعبدوں کی کوئی وقعت نہیں اسی طرح میری نظر میں سلطنتوں کی کوئی قیمت نہیں جس طرح ایک شعبدہ باز تھوڑی دیر کے لئے ہتھیلی پر سرسوں جما کر مناظرین کو خوش کر دیتا ہے لیکن دراصل اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی اسی طرح سلطنتیں بنتی رہتی ہیں اور بگڑتی رہتی ہیں۔

تیسرا شعر:۔ مثال کے طور پر بلوکیتِ پرویز پر غور کر لو آج دنیا میں پرویز کی سلطنت کا وجود نہیں ہے اور سوائے مورخوں کے کوئی اس کا نام بھی نہیں جانتا ہے۔ لیکن فرہاد کی خارا شکنی (جدوجہد) کا قصہ آج بھی زبان زد خلائق ہے۔

جمہوریت

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ہ سٹنڈل

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اگرچہ آج کل دنیا میں ہر شخص جمہوریت کا ثنا خواں ہے اور اس کو بہترین طرزِ حکومت سمجھتا ہے لیکن دراصل یہ کوئی قابلِ تعریف و تحسین طریق حکومت نہیں ہے کیونکہ اس میں سب سے بڑا اور بنیادی نقص یہ ہے کہ اس طرزِ حکومت میں انسانوں کی عقل و خرد کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

پہلا شعر:- مثلاً عقل کا تقاضا یہ ہے کہ دس عقلمند آدمی ایک ہزار بلکہ ایک لاکھ بیوقوفوں پر فوقیت رکھتے ہیں لیکن اس طرزِ حکومت میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ دس عقلمند آدمی کیا کہتے ہیں بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ نوّے آدمی خواہ ان میں ایک بھی عقلمند نہ ہو۔ کیا کہتے ہیں؟ یعنی انسانوں کو شمار کیا جاتا ہے ان کی بات کا وزن نہیں کیا جاتا اقلیت کی بات یا رائے خواہ کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو مردود ہے۔ اور اس کے مقابل میں اکثریت کی رائے خواہ وہ کتنی ہی غیر معقول کیوں نہ ہو مقبول ہے۔

دوسرا شعر:- جمہوری طرزِ حکومت میں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ حق و صداقت کس طرف ہے بلکہ وہاں اس بات کو دیکھا جاتا ہے کہ اکثریت کس طرف ہے۔

اقبال کی نظم کا مطلب تو یہاں ختم ہو گیا اب میں ایک بات کا اور اضافہ کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جمہوری طرزِ حکومت میں دراصل حکومت جمہور کی نہیں ہوتی (اگرچہ بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ جمہوری حکومت میں جمہور کی

حکومت کرتے ہیں بلکہ ان گنتی کے چند افراد کی ہوتی ہے جو

(ا) اپنی دولت۔ عہدہ۔ اثر و رسوخ۔ جاگیر یا خاندانی تفوق کی بنا پر عوام (جمہور) کے ووٹ (رائے) خرید سکیں۔ یا جو

(ب) اپنی عیاری۔ زمانہ سازی یا چرب زبانی کی بدولت جمہور کو اپنی ہمدردی یا خیر خواہی یا اپنی صالحیت اور روحانیت کا یقین دلا سکیں بالفاظ دگر انہیں سبز باغ دکھا سکیں۔ یا جو

(ج) کسی اصول یا اخلاقی ضابطہ کے پابند نہ ہوں مثلاً ملک کی آزادی کے بعد جو لوگ آزادی کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے ہوں اور ہندوستانیوں کے لئے سمِ قاتل قرار دے چکے ہوں وہ آزادی کے بعد اسی سمِ قاتل کو بے تکلف آبِ حیات سمجھنے لگیں اور خدائی فوجدار بن کر اس کی زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے رات و دن پوسٹر بازی اور تقریروں میں مصروف رہیں اور محتاج اصلاح ہونے کے باوجود قوم کی اصلاح کے اجارہ دار بن جائیں اور کبھی اس حقیقت کے سمجھنے کی کوشش نہ کریں کہ

ع او خویشتن گم است کرا رہبری کند

یورپ اور سوریا

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا
نبیِّ عفت و غم خواری و کم آزاری
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لئے
مئے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے بنی آدم کی ایک مشہور خصوصیت یعنی احسان فراموشی کو ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھایا ہے کہتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ ملک شام نے فرنگیوں کو ایک ہی (حضرت عیسیٰ ؑ) عطا کیا جس نے دنیا کو پاکیزگی۔ ہمدردی اور خیر خواہی کا درس دیا۔

دوسرا شعر:۔ لیکن فرنگیوں نے جب اس ملک پر قبضہ کیا تو ان اصولوں کی ترویج کے بجائے اہل شام کو دنیا کی تین بڑی لعنتیں عطا کیں یعنی شراب۔ جوا۔ اور فاحشہ عورتیں۔ بالفاظ دگر نیکی کا بدلہ بدی سے دیا

نوٹ:۔ ملک شام ہی پر کیا منحصر ہے ان منحوس فرنگیوں کے قدم جس ملک میں بھی گئے انہوں نے انہی لعنتوں کو رائج کیا دور جانے کی کیا ضرورت ہے

ہندوستان ہی کو دیکھ لیجئے۔

مسولینی

(اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے)

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم؟
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج
آلِ سیزر چوبِ نَے کی آب یاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کُشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

(۲۲ اگست ۱۹۲۵ء بھوپال اشیش محل میں لکھے گئے)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے مسولینی کے کیریکٹر یا طرزِ عمل یا اس کے وضع کردہ نظامِ حکومت (Fascism) کی حمایت نہیں کی ہے بلکہ اس کے پردہ میں اس کے مخالفوں کی عیاری کا راز فاش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ جو مغربی قومیں اس کو موردِ الزام بنا رہی ہیں وہ اس سے بڑھ کر ظالم ہیں بلکہ اس کو ان پر ایک پہلو سے تفوق حاصل ہے وہ یہ ہے کہ مسولینی اپنی ملوکیت کو جمہوریت کے پردہ میں چھپا کر دنیا کو دھوکہ نہیں دیتا (اگر فاشزم مذموم ہے تو امپریلزم بھی مذموم ہے)

نوٹ:۔ اس موقع پر مجھے اکبر الہ آبادی کا ایک شعر یاد آگیا جو میرے مطلب کو بڑی خوبی کے ساتھ واضح کر سکتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

اسے اقرارِ اغوا ہے یہ اغوا کو چھپاتے ہیں
علیہ اللعن ہے شیطان لیکن ان سے اچھا ہے

یعنی شیطان اور انگریز دونوں انسانوں کو راہِ راست سے بہکاتے ہیں لیکن شیطان کو انگریزوں پر ایک فضیلت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ

ع اُسے اقرارِ اغوا ہے یہ اغوا کو چھپاتے ہیں

پہلا شعر:۔ مسولینی کہتا ہے کہ یورپ کی جمہوریت نواز قومیں بلاوجہ مجھ سے ناراض ہیں حالانکہ میرا طرزِ عمل اگر مذموم ہے تو ان کا طرزِ عمل بھی مذموم ہے۔

دوسرا شعر:۔ تم اور میں اور۔ ہم دونوں ایک ہی تہذیب کے علمبردار ہیں تمہاری سیاست بھی لادینی ہے میری سیاست بھی لادینی ہے

حقیقت ایک ہی ہے صرف طریق کار کا فرق ہے دراصل ہم تم دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں

تیسرا شعر:۔ تم کس منہ سے مجھ پر حبشہ کے شہر پر حملہ کرنے کا الزام عائد کر سکتے ہو؟ کیا تم نے میری طرح دنیا کی کمزور قوموں کو اپنا غلام نہیں بنایا۔؟

چوتھا شعر:۔ کیا تم نے بے گناہ اور کمزور قوموں کے حکمرانوں کو نیست و نابود نہیں کر دیا مثلاً دہلی تو موجود ہے لیکن شاہ دہلی کہاں ہے؟

پانچواں شعر:۔ کیا یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ حکومت اٹلی تو زمین کے غیر آباد حصوں کو آباد کرنے میں اپنا خزانہ خالی کر رہی ہے اور تم لوگ بنجر زمینوں سے بھی خراج وصول کر کے اپنے خزانے معمور کرتے رہو؟ (آل سیزر سے مراد اٹلی کے حکمراں ہیں)

چھٹا شعر:۔ کیا یہ ایک حقیقتِ ثابتہ نہیں کہ تم نے (اشارہ بجانب انگلستان۔ فرانس۔ ہالینڈ وغیرہ) غریب صحرا نشینوں (افریقہ کی قوموں) کے گھر بار تباہ کئے۔ تم نے کاشتکاروں کی کھیتیاں تباہ کیں۔ تم نے کمزور حکومتوں کے تختے الٹ دیئے۔ تم نے بیگناہ لوگوں پر بم برسائے۔

ساتواں شعر:۔ میں تو تمہارے ہی نقش قدم پر چل رہا ہوں تہذیب کے پردہ میں جو غارتگری اور قتل انسانی تم نے کل روا رکھا تھا میں آج روا رکھتا ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ جو کام تم مدتوں سے کرتے رہے ہو وہی اب میں کر رہا ہوں تم امپیریلزم کے حامی ہو میں فاشزم کا وکیل

ہوں لیکن مقصد تو ان دونوں تحریکوں کا ایک ہی ہے بیگناہ قوموں کا خون بہانا اور انہیں اپنا غلام بنانا۔

گلہ

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

شرح مشکلات واقعی خوب نظم ہے اور آخری شعر تو پوری نظم کی جان ہے اقبال کہتے ہیں کہ:-

پہلا شعر:- خدا جانے ہندوستان کا حشر کیا ہوگا اور کبھی اس ملک کو آزادی نصیب ہوگی یا نہیں؟ اب تک یہ ملک تاج برطانیہ کا سب

سے قیمتی گوہر ہے۔

نوٹ:۔ واضح ہو کہ یہ مصرع دراصل انگریزوں کے اس مقولہ کا ترجمہ ہے۔ (India is the Bright-Jewel in the British crowl)

دوسرا شعر:۔ انگریزوں نے سرمایہ دارانہ نظام قائم کر کے اس ملک کے کاشتکاروں اور مزدوروں کی یہ حالت کر دی ہے کہ وہ قبر کے مردے معلوم ہوتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ ان کی روح اور ان کا بدن دونوں غیروں کے قبضہ میں ہیں یعنی نہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں اور نہ اپنے اعضائے جسمانی کو اپنی مرضی سے استعمال کر سکتے ہیں اور ان کی جسمانی محنت کا ثمرہ تو زمیندار وصول کر لیتا ہے کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ان غریبوں کے پاس رہنے کو مکان بھی نہیں ہے اور مکان تو بڑی چیز ہے یہ تو اپنے جسم کے بھی مالک نہیں ہیں الغرض انگریزوں کی غلامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ مکان باقی رہا نہ مکین۔

چوتھا شعر:۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود مجھے یورپ سے گلہ نہیں ہے بلکہ تجھ (ہندوستان کے کاشتکاروں اور مزدوروں اور محنت کش طبقوں) سے گلہ ہے کہ تو انگریزوں یا ان کے ایجنٹوں کی غلامی پر راضی کیوں ہے۔

واضح ہو کہ اس نظم میں اقبال نے ہم کو انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کا مشورہ دیا ہے اور یہ کوئی نیا مشورہ نہیں ہے ۱۸۵۷ء میں ہماری قوم کے علماء نے متفقہ طور پر یہی مشورہ بلکہ فتویٰ دیا تھا کہ انگریز کی اطاعت

حرام ہے اور میری دعا یہ ہے کہ اللہ وہ دن جلد لائے جب ہم ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کے خلاف بغاوت کر سکیں۔

انتداب

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے
نہیں زمانۂ حاضر کو اس میں دشواری
جہاں قمار نہیں زن تنک لباس نہیں
جہاں حرام بتلاتے ہیں شغلِ مے خواری
بدن میں گرچہ ہے اک روحِ ناشکیب و عمیق
طریقۂ اَب و جد سے نہیں ہے بیزاری
جسور و زیرک و پُر دَم ہے بچۂ بدوی
نہیں ہے فیضِ مکاتب کا چشمۂ جاری
نظر وہ انِ فرنگی کا ہے یہی فتویٰ
وہ سرزمیں مدنیّت سے ہے ابھی عاری

شرح مشکلات

واضح ہو کہ اس دلکش طنزیہ نظم میں اقبال نے ہمیں انتداب کی لعنتوں سے آگاہ کیا ہے یعنی انگریز اور دوسری

طاغوتی قومیں جب مسلمانوں کے کسی ملک پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں تو دنیا میں یہ اعلان کرتی ہیں کہ ہم اس خطّہ کو مہذّب بنانا چاہتے ہیں اس لئے اس پر اپنی حکم داری (انتداب) قائم کر رہے ہیں یعنی ہمارا مقصد اس ملک پر قبضہ کرنے سے بہت مستحسن ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ یہ شیطانی جماعتیں جس ملک پر قبضہ مخالفانہ کرتی ہیں وہاں ہر قسم کی برائیاں رائج کر دیتی ہیں اور محکوم قوم کو ان برائیوں میں اس درجہ منہمک کر دیتی ہیں کہ پھر وہ قوم جذبۂ جہاد سے بالکل بیگانہ اور الگ تھلگ ہو جاتی ہے۔

مثلاً امریکہ کے طرزِ عمل پر غور کرو عصرِ حاضر کا فرعون حجاز بلکہ عرب پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا ہے تو اس نے اس کی صورت یہ نہیں اختیار کی کہ فوجیں بھیج کر قبضہ کر لیتا اور بلا وجہ تمام دنیا کی مخالفت مول لیتا بلکہ وہ سلطان بن سعود کی وساطت سے عربوں کو اپنا رہا ہے اور اس تہذیب کی ابتداء خود حضرت جلالۃ الملک، اور اس کے خاندان سے کرتا ہے۔ سلطان کو اللہ نے زر سے نوازا ہے اس لئے بڑی آسانی سے کفّار کے آلۂ کار ہی میں آجائے گا۔ اور اب اس دیندار اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول بادشاہ کی بدولت جو سرزمینِ حجاز برکاتِ تہذیب وتمدنِ اسلام سے بہرۂ اندوز ہو رہی ہے اور وہ دن دور نہیں جب بادیہ نشینوں کا یہ ملک تہذیب وتمدنِ اسلام کے اعتبار سے ایک نمایاں شان رکھتا ہے کیا یہ مصر، شام اور عراق ولبنان کا ہم پلّہ ہو جائے گا۔ اقبال کہتے ہیں۔

پہلا شعر۔ عصرِ حاضر میں یورپ کی جو قومیں برسرِ اقتدار ہیں ان کو یہ معلوم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ کونسا ملک غیر مہذب ہے۔

دوسرا شعر:۔ اس بات کے معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی ملک کے لوگ جُوا نہیں کھیلتے اور وہاں کی عورتیں اپنے جسم کو غیروں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے بچانے کے لئے اسلامی لباس پہنتی ہیں اور اگر وہاں کے لوگ شراب نوشی کو حرام سمجھتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ اور کشمکشِ باطنی کے باوجود بزرگوں کے طور طریقوں کا احترام کیا جاتا ہے یعنی ملّی روایات پر عمل کیا جاتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ اور اگر وہاں کے دیہاتی بہادر عقلمند اور صاحب حوصلہ ہیں اور اگر ان کے گاؤں میں اسکول قائم نہیں ہیں تو۔

پانچواں شعر:۔ یورپ کے تمام عقلمندوں کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ سرزمین بالکل غیر مہذب ہے اس لئے انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اسے مہذب بنائیں اور اس لئے اس پر اپنا تسلط قائم کریں۔

نوٹ:۔ ایران۔ مصر۔ ترکی۔ شام اور عراق کی مسلمان عورتیں تو تہذیب کے تمام مدارج طے کر چکی ہیں لیکن سعودیہ عربیہ کی عورتیں اسلامی اصول کی بڑی شدّت سے پابندی کرتی ہیں فللہ الحمد (چنانچہ ابھی چند سال ہوئے ایک ترکی خاتون کو حُسن کے مقابلہ میں اول درجہ کا انعام ملا تھا)

(٭)

لادین سیاست

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی
خدا نے مجھ کو دیا ہے دلِ خبیر و بصیر
مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں
کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیوِ بے زنجیر
متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہراوّلِ لشکر کلیسیا کے سفیر

(٭)

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا کہ فرنگیوں کی سیاست لادینی اور الحاد پر مبنی ہے اس لئے یہ شیطانی نظام کسی صورت سے بھی بنی آدم کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا اور یہ فساد اس لئے رونما ہوا ہے کہ فرنگیوں نے یہ شیطانی اصول اختیار کر لیا ہے کہ مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں ہے کہ۔

پہلا شعر:۔ قرآن اور حدیث کے مطالعہ نے میرے اندر ایسی

بصیرت پیدا کردی ہے کہ میں حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہوں۔

دوسرا شعر:۔ چنانچہ جب میں نے فرنگیوں کی سیاست کا مطالعہ کیا تو مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ان کی سیاست اللہ کے قانون سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی بلکہ شیطانی تعلیمات پر مبنی ہے اس لئے جو لوگ اس سیاست کو اختیار کرتے ہیں وہ نیکی اور پاکیزگی سے معرّا ہو کر حیوان بن جاتے ہیں اور ان کی طبیعت میں سختی اور بے اعتنائی آجاتی ہے اور ان کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ چونکہ مغربی اقوام نے اپنی سیاست کو مذہب سے جدا کر دیا ہے اس لئے ان کی مثال اس دیو کی سی ہے جو ہر قسم کی اخلاقی قیود سے آزاد ہو جائے اور ہر وقت انسانوں کو تباہ و برباد کرنے پر آمادہ رہے۔

چوتھا شعر:۔ چنانچہ جب یہ مغربی اقوام کسی ایشیائی ملک پر زبردستی قبضہ کرنا چاہتی ہیں تو پادریوں کو بطور آلۂ کار استعمال کرتی ہیں اور خود حملہ آور ہونے سے پہلے ان کو اپنے لشکر کا ہراوّل (مقدمۃ الجیش) بنا کر مذہب عیسوی کی تبلیغ کے لئے بھیج دیتی ہیں اور یہ لوگ لادینی سیاست کی تبلیغ کر کے ان قوموں کی فتوحات کے لئے راستہ صاف کر دیتی ہے۔

——(:)——

دامِ تہذیب

اقبالؔ کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے
ہر ملّتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار
یہ پیرِ کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے
بجلی کے چراغوں سے منوّر کئے افکار
جلتا ہے مگر شام و فلسطیں پہ مرا دل
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
ترکانِ جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

شرح مشکلات

اقبال نے اس نظم میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ یورپ کی حکومتوں کا طریق کار یہ ہے کہ وہ ایشیائی ممالک میں ایسی عیاری کے ساتھ اثر و رسوخ قائم کرتی ہیں کہ نادان قومیں ان کے پھندے میں پھنس جائیں۔ مثلاً انہوں نے عربوں سے یہ کہا کہ ترک تمہارے اوپر ظلم کر رہے ہیں اور انہوں نے بلاوجہ تمہیں اپنا غلام بنا رکھا ہے ہم تمہاری مدد کے لئے تیار ہیں تم ہمارا ساتھ دو ہم تمہیں غیر مہذب ترکوں کے پنجے سے رہائی بھی دلا دیں گے

اور مہذب بھی بنائیں گے یعنی تمہارے ملک میں مدرسے اور شفاخانے قائم کریں گے۔ ریلیں بنائیں گے۔ صنعت و حرفت کو فروغ دیں گے وغیرہ وغیرہ چونکہ عرب بیوقوف تھے اس لئے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے جال میں پھنس گئے اور اب اپنی تقدیر کو رو رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ مجھے اہل یورپ کی شرافت میں کچھ شک نہیں ہے
یہ شریف لوگ دنیا کی ہر مظلوم قوم کے ہمدرد ہیں۔

دوسرا شعر:۔ چنانچہ انہوں نے جس ملک پہ اپنا اقتدار قائم کیا وہاں پاکیزہ خیالات سے دلوں کو منور کرنے کے بجائے بجلی کے قمقموں سے لوگوں کے دماغ روشن کر دیئے۔

تیسرا شعر:۔ لیکن شام اور فلسطین کے حال زار پہ مجھے سخت افسوس آتا ہے اور ان کی نجات کی کوئی تدبیر میری سمجھ میں نہیں آتی۔

چوتھا شعر:۔ انگریزوں نے ان لوگوں کو ظالم ترکوں کے پنجہ سے تو بیشک نجات دلادی لیکن اب یہ لوگ تہذیب کے پھندے میں اس طرح گرفتار ہو گئے ہیں کہ ان کی رہائی کی کوئی امید نہیں ہے۔

جن لوگوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد سے شام۔ عراق۔ فلسطین۔ شرق اردن اور مصر کے حالات کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ جب سے یہ ممالک ترکوں کی عمل داری سے آزاد ہوئے ہیں ہر قسم کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں خصوصاً فلسطین کے عرب تو پچیس سال سے خانہ جنگی کی لعنت میں گرفتار ہیں اقبالؔ نے عربوں کی اسی حماقت پہ یہ دلخراش تبصرہ کیا ہے کہ۔

ع بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

نصیحت

اک مردِ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے
منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر
بیچارے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم
بڑے پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر
سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

شرح مشکلات اس دلپذیر نظم میں اقبالؔ نے مغربی سیاسیات کے ایک اہم پہلو کو بے نقاب کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں جو کام تلوار سے لیا جاتا تھا اس زمانہ میں تعلیم سے لیا جاتا ہے۔ علامہ اقبالی کہتے ہیں کہ:۔

پہلا شعر:۔ ایک فرنگی سیاست داں نے اپنے بیٹے سے یہ کہا کہ سطحی باتوں پر توجہ کرنے کے بجائے حقائق پر غور کر یعنی حکومت کے رموز سمجھ۔

دوسرا شعر:۔ محکوم قوموں پر اپنی حکومت کے مخفی اصول کبھی واضح مت کر۔ اگر تو ان کو اپنے طریق کار سے آگاہ کر دے گا تو وہ تیرے جال میں ہرگز نہیں پھنس سکیں گے۔

تیسرا شعر:۔ حکومت کے اسرار و رموز ہمیشہ محکوموں سے پوشیدہ رکھے جاتے ہیں اور حکومت کا طریقہ یہ ہے کہ محکوم کو تلوار سے زیر نہیں کیا کرتے۔

چوتھا شعر:۔ بلکہ ان کے لئے ایسا نصاب تعلیم مدوّن کرتے ہیں کہ اس کی بدولت ان کی خودی مردہ ہو جائے اور حریت کے جذبات فنا ہو جائیں اور جب وہ خوئے غلامی میں پختہ ہو جائیں تو پھر ان پر حکومت کرنا آسان ہو جاتا ہے یہ نصابِ تعلیم دراصل ایک تیزاب ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ انسانی خودی، تو کیا چیز ہے؟ سونے کا پہاڑ بھی مٹی کا ڈھیر ہو جائے گا

پانچواں شعر:۔ انگریزوں نے اسی نظام اور نصاب تعلیم کی بدولت مسلمانوں کی خودی کو فنا کر دیا۔ چنانچہ سو سال میں یہ حالت ہو گئی ہے کہ آزادی مل جانے کے بعد بھی ہماری خودی بدستور مردہ ہے اور ہماری حکومت تعلیم تجارت۔ معاشرت۔ معیشت اور تہذیب غرضکہ زندگی کے کسی شعبہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ہر بات میں وہی انگریزیت جلوہ گر ہے چنانچہ ہم اردو کے بجائے انگریزی زبان اور قومی لباس کے بجائے انگریزی لباس

اور مسجد کے بجائے کلب کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہماری عورتوں کا حال مردوں سے بھی بدتر ہے۔

واضح ہو کہ جو بات اقبال نے پانچ شعروں میں واضح کی ہے اسی بات کو اکبر الہ آبادی نے صرف ایک شعر میں بیان کر دی ہے اور سچ یہ ہے کہ معنویت اور تاثیر کے لحاظ سے ان کا یہ شعر اقبال کی پوری نظم سے کم نہیں ہے

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ایک بحری قزاق اور سکندر

سکندر

صلہ تیرا تری زنجیر یا شمشیر ہے میری
کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی

قزاق

سکندر! حیف تو اس کو جوانمردی سمجھتا ہے
گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی
ترا پیشہ ہے سفّاکی مرا پیشہ ہے سفّاکی
کہ ہم قزاق ہیں دونوں تو میدانی میں دریائی

شرح مشکلات اس نظم میں اقبالؔ نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ملوکیت اور قزاقی (لوٹ مار) میں صرف نام کا فرق ہے دراصل دونوں ایک ہیں۔

سکندر

پہلا شعر:۔ سکندر نے ایک بحری ڈاکو سے کہا کہ تیری رہزنی اور لوٹ مار سے بحری مسافر بہت عاجز اور پریشان ہیں اس لئے میں تجھے یا قید میں رکھوں گا یا قتل کر دوں گا اس جرم کی سزا بہرحال دوں گا۔

قزاق

دوسرا شعر:۔ یہ بات سن کر اس دانشمند ڈاکو نے سکندر سے یہ کہا کہ مجھے یہ تیری بات سن کر بہت رنج ہوا کیونکہ تو نے یہ بات کہہ کر اپنے پیشہ اور اپنے ہم پیشہ لوگوں کی سخت توہین اور رسوائی کی ہے۔

تیسرا شعر:۔ کیا تو اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ تیرا پیشہ بھی تو میری طرح لوٹ مار اور قزاقی اور سفاکی اور خونریزی اور قتل و غارت ہی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ میں دریا میں لوٹ مار کرتا ہوں تو خشکی میں قتل و غارتگری کرتا ہے۔

جمعیتِ اقوام

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتہ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

(❁)

شرح مشکلات

اقبال نے اس نظم میں اس جمعیۃ اقوام کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ کے کفن چوروں نے اپنے فائدہ کے لئے قائم کی تھی۔

اسی جنیوا والی لیگ آف نیشنز کے متعلق اقبال نے پیام مشرق اور ضرب کلیم میں کئی نظمیں لکھی ہیں۔ جس زمانہ میں اقبال نے یہ نظم لکھی تھی جمعیۃ مذکورہ اپنی بے ایمانی اور ناانصافی کی وجہ سے ساری مشرقی دنیا میں بدنام ہو چکی تھی اور اس کا بھرم بالکل نکل چکا تھا اسی لئے اقبال نے یہ قیاس ظاہر کیا کہ عنقریب یہ لیگ آف نیشنز ختم ہو جائے گی چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد ایسا

ہی ظہور میں آیا۔

کالج کے نوجوانوں کی اطلاع کے لئے یہ صراحت ضروری ہے کہ لیگ آف نیشنز کا طرزِ عمل ایسا ہی شریفانہ اور عادلانہ تھا جیسا کہ آج کل کی یو۔ این۔ او۔ (U-N-O) یعنی تنظیمِ اقوام متحدہ کا ہے جو لیگ آنجہانی کی سچی اور اصلی جانشین ہے۔

پہلا شعر:۔ جمعیت اقوام اب عنقریب ختم ہونے والی ہے اور وہ دن دور نہیں ہے جب ہم یہ خبر پڑھیں گے کہ اس کا خاتمہ ہو گیا۔

دوسرا شعر:۔ اس کی موت تو قطعی ہے لیکن پیرانِ کلیسا اس کے حق میں بڑے درد دل کے ساتھ دعائیں کر رہے ہیں کہ ابھی یہ کچھ دنوں اور جیتی رہے۔ تقدیر سے یہاں مراد ہے خدائی فیصلہ با خاتمہ۔ مبرم بمعنی قطعی یعنی جو ٹل نہ سکے) تقدیر کی دو قسمیں ہیں۔ تقدیرِ مبرم اور تقدیرِ معلق۔

پیرانِ کلیسا بھی اقبال کی خاص اصطلاح ہے اس سے مراد ہیں وہ اربابِ سیاست جو اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے مذہب کی حمایت کرتے ہیں۔

پیرانِ کلیسا کے لغوی معنی تو ان پادریوں کے ہیں جو رومی یا پروٹسٹانی کلیسا میں بلند مناصب پر فائز ہوں مثلاً بطریق یا اسقف اعظم لیکن اقبال کی مراد ان مذہبی پیشواؤں سے نہیں ہوا کرتی۔

نوٹ:۔ میں نے اس شرح میں لفظوں اور اصطلاحوں کی تشریح بہت کم کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام میں نے فرہنگ اقبال کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔

تیسرا شعر:۔ اگرچہ اس کا خاتمہ تو یقینی ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ فرنگی اقوام کی یہ (داشتہ یا خادمہ) ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے یعنی ان عیار فرنگی اقوام کی شیطانی چالوں اور فریب کاریوں کی بدولت کچھ دنوں اور قائم رہے۔

نوٹ:۔ اس جمعیت اقوام سے علامہ کو جس قدر نفرت تھی اس کا اندازہ اس شعر سے بخوبی ہو سکتا ہے انہوں نے اس کے لئے داشتہ کا لفظ استعمال کیا ہے جو اپنی رکاکت کی وجہ سے ان کے شایانِ شان نہیں ہے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ جوش بلیح آبادی اور اسی وضع و قماش کے دوسرے تنزل پسندوں کی شاعری میں تو بالکل جائز اور موزوں ہے لیکن اقبال کے یہاں اس کا استعمال ذوقِ سلیم پہ گراں گذرتا ہے مگر کیا کیا جائے جمعیت مذکورہ کی حقیقی حیثیت (یا اس زمانہ میں یو۔ این۔ او۔ کی حقیقی حیثیت) کو واضح کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا۔

دوسرے مصرع میں (ابلیس کے تعویذ) سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ علامہ مرحوم مغربی حکومتوں اور ان کے سیاست دانوں کو سراسر ابلیس کے غیر تنخواہ یاب گماشتے یقین کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ابلیس کے ان سیاسی فرزندوں کی تردید میں اپنا پورا زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔

(جزاہ اللہ تعالیٰ)

شام و فلسطین

رندانِ فرانسیس کا میخانہ سلامت
پُر ہے مئے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا
ہے خاکِ فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا
مقصد ہے ملوکیّتِ انگلیس کا کچھ اور
قصّہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا

(٭)

شرح مشکلات

اس نظم میں علامہ اقبال نے فرنگی سیاست کو بے نقاب کیا ہے۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ حکومت فرانس نے حکومت برطانیہ سے ساز باز کر کے شام پر اپنا تسلط قائم کیا اور وہاں تہذیب مغرب کی تمام برائیاں (خصوصاً شراب نوشی) عام کر دی۔

دوسرا شعر:۔ شامیوں کے اخلاق تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ دونوں حکومتوں نے فلسطین کے یہودیوں کو در پردہ عربوں کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کیا اور یہ عذر تراشا کہ فلسطین میں چونکہ یہودی ایک زمانہ میں

حکمراں رہ چکے ہیں اس لئے یہ ان کا آبائی اور قومی وطن ہے اور یہاں انہی کو حکمراں ہونا چاہیئے۔

اقبال یہ کہتے ہیں کہ اگر فرزندانِ ابلیس کی یہ دلیل صحیح تسلیم کرلی جائے تو پھر ہسپانیہ عربوں کو ملنا چاہیئے کیونکہ ان کے آبا و اجداد بھی اس ملک میں سات سو سال تک حکومت کر چکے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ اقبال کہتے ہیں کہ شام اور فلسطین پر فرانس اور برطانیہ کے قبضہ کا مقصد یہ نہیں کہ وہ ان ملکوں سے کوئی تجارتی فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں بلکہ عربوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ قوم ہمیشہ ان کی دست نگر رہے۔

سیاسی پیشوا

امید کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے
یہ خاکباز ہیں رکھتے ہیں خاک سے پیوند
ہمیشہ مور و مگس پر نگاہ ہے ان کی
جہاں میں ہے صفتِ عنکبوت ان کی کمند
خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیّلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے سچے سیاسی پیشوا (مسلمان سیاستداں) کی شناخت بتائی ہے۔ کہتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ موجودہ سیاسی لیڈر خواہ مشرقی ہوں یا مغربی رہنمائی کے اہل نہیں ہیں کیونکہ ان کا زاویہ نگاہ سراسر مادہ پرستانہ ہے ان کے خیالات بالکل پست ہیں اور صرف دنیاوی منفعت پر مرکوز رہتے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ یہ لوگ ہمیشہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں کی طرف متوجہ رہتے ہیں مثلاً فلاں ملک کے تیل کے چشمے قبضہ میں آجائیں۔ فلاں ملک کی خام اشیاء کا اجارہ حاصل ہوجائے وغیرہ اسی لئے ان کی کمند (تدابیر) مکڑی کے جالے کی طرح کمزور ہوتی ہے اور اسی لئے ان کی پالیسی (Policy) آج کچھ ہے تو کل کچھ ہے۔

تیسرا شعر:۔ مبارک ہے وہ قوم جس کا لیڈر (امام) فرشتوں کا سا پاکیزہ تخیل اور بلند جذبات رکھتا ہے۔

واضح ہو کہ انسان کی شخصیت میں تین قوتیں (Psychology) پائی جاتی ہیں۔ شعور (تخیل) احساس (جذبات) اور ارادہ (عمل) اقبال نے اس شعر میں تخیل اور جذبات کا ذکر کیا ہے۔ تیسری قوت کا ذکر نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی انسان میں صحیح شعور اور اس کے مناسب حال جذبہ عمل پیدا ہوجائے یا موجود ہو تو پھر عمل لازمی طور سے سرزد ہوگا۔

عمل جس کا نام ہے وہ نفسیاتی اعتبار سے اوّل الذکر دو چیزوں کے پوری قوت کے ساتھ موجود ہوجانے پر موقوف ہے مسلمان قوم آج عمل سے محروم ہے

اس کی وجہ یہی تو ہے کہ پوری قوم صحیح اسلامی شعور اور صحیح مناسب حال اسلامی جذبات سے محروم ہے جب قوم میں نہ شعور ہو نہ جذبہ تو اس سے عمل کا صدور نفسیاتی طور پر ناممکن ہے عمل صالح (جہاد) تو شعور اور احساس پر منحصر ہے۔

آؤ دنیا کے سب سے بڑے اور کامیاب ترین پیشوا (محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) کے طرز عمل کا مطالعہ کریں آپ نے سب سے پہلے عربوں کے اندر یہ صحیح اسلامی شعور پیدا کیا یعنی انہیں یہ بتایا کہ اللہ ایک ہے اس کے علاوہ تم پر اس کائنات میں کوئی طاقت نہ تو حکمراں ہے اور نہ حکمراں ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے علاوہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا وہ تم جیسی ہے یا تم سے کمتر ہے۔ بہرحال جو تم جیسی ہے وہ تم پر کیوں حکمراں ہو؟ تم خود اس پر کیوں حکمراں نہ ہو؟ چونکہ یہ صورت عقلاً مذموم ہے اس لئے کہ اس سے فتنہ پیدا ہوگا۔ لہٰذا تم اور وہ مساوی ہو گئے نہ وہ تم پر حکومت کرے نہ تم اس پر حکومت کرو۔

اب رہی وہ چیز جو تم سے کمتر ہے اُسے عقلاً تم پر حکمرانی کا حق نہیں بلکہ تم کو اس پر حکمرانی کا حق ہے۔

خلاصہ اس بحث کا یہ نکلا کہ جو تمہارے برابر ہے وہ خود تمہاری نوع ہے یعنی سب انسان برابر ہیں اس لئے کوئی انسان کسی انسان پر حکمراں نہیں ہو سکتا یعنی کوئی کسی کا غلام نہیں ہے انسان کے علاوہ جو کچھ ہے حیوانات وحوش وطیور نباتات وجمادات یہ سب تم سے کمتر ہیں اس لئے عقلاً تمہارے خادم اور مطیع ہیں پس ثابت ہو گیا کہ اگر کسی کو انسان پر حکمرانی کا حق پہونچتا ہے تو وہ صرف اللہ ہے اس لئے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ ایک مذہبی حقیقت ہی نہیں بلکہ ایک منطقی صداقت

بھی ہے اور کائنات میں اس سے بڑی کوئی صداقت نہیں ہے اور اسلام اسی حقیقتِ کبریٰ کا علمبردار ہے۔

جب یہ صداقت عربوں کے دل میں اتر گئی تو نفسیاتی اصطلاح میں ان کے اندر صحیح شعور پیدا ہو گیا اور اقبال نے اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں لَا شَرِیْکَ لَہٗ

جب صحیح شعور پیدا ہو گیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اندر صحیح جذبہ (Emotion) پیدا کیا اور اس کے لئے ان کے قلوب میں اس حقیقت کو جاگزیں کیا کہ دیکھو محبت کرنا ایک فطری جذبہ ہے لیکن محبت کے لائق وہ ہستی ہے جسے فنا نہ ہو۔ اور جس میں کوئی عیب و نقص نہ ہو کیونکہ اگر عیب ہے تو وہ کامل نہیں اور جو کامل نہیں اس سے وفا کی امید نہیں ہو سکتی (خدا معلوم کس وقت بے وفائی کر بیٹھے) جو تمہاری محبت کا صلہ دے سکے (انسان خود محتاج ہے وہ تمہیں کیا دے سکتا ہے) جو تمہاری دستگیری کر سکے اور ایسی ہستی صرف اللہ ہی کی ہے پس تم اللہ کو اپنا محبوب بناؤ۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ اور اس سے محبت کا طریقہ یہ ہے کہ میری اتباع کرو۔ اور چونکہ اتباع کے لئے محبت شرط ہے اس لئے مجھ سے محبت کرو میری محبت تمہیں اللہ تعالیٰ سے ملا دے گی لیکن میں رب تک پہنچنے کے لئے واسطہ ہوں میرے بغیر رب تک نہیں پہنچ سکو گے۔ یہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقلد کو اللہ کے رسول سے محبت نہیں ہوتی اسی لئے وہ غیر رسول سے محبت کرتے

ہیں جو رب کی محبت کا باعث نہیں بنتا۔

جب صحابہ کرام رضؓ نے اس دلنواز تعلیم کو قبول کیا تو ان کے اندر وہ چیز پیدا ہو گئی جسے اقبال عشقِ رسول سے تعبیر کرتے ہیں اور اس جاہل اور کم سواد شارح اقبال کی رائے میں یہی چیز اقبال کے سارے فلسفہ کا خلاصہ ہے یا ان کی شاعری کا محور ہے۔

قصہ مختصر جب صحابہ کرام رضؓ کے اندر صحیح شعور کے بعد صحیح جذبہ پیدا ہو گیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ممتحن کی حیثیت اختیار کی اور تیرہ ۱۳ سال تک جو کچھ پڑھا پڑھایا تھا اس کا یعنی شعور اور جذبہ کی واقفیت کا امتحان لیا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ میری تعلیم مؤثر ہو گئی ہے یا ابھی کچھ کسر باقی ہے تاریخ اسلام نے اس عظیم الشان امتحان کو ہجرت کے دلفریب نام سے تعبیر کیا ہے۔

الغرض جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ لیا کہ قوم میں صحیح شعور اور صحیح (مناسب حال) جذبہ پیدا ہو گیا ہے تو ۲ھ میں عمل صالح (جہاد) کرنے کا حکم دے دیا اور دنیا اس اولین عمل صالح کو جنگ بدر کے نام سے یاد کرتی ہے۔

واضح ہو کہ صحیح شعور اور صحیح جذبہ پیدا کرنے میں تو پندرہ سال کی طویل مدت صرف ہوئی لیکن جب یہ دونوں چیزیں پیدا ہو گئیں تو پھر عمل کرنے کے لئے نہ کسی مدت کی ضرورت لاحق ہوئی نہ کوشش کی صرف اجازت ملنے کی دیر تھی جونہی اجازت ملی عمل ظہور میں آگیا یعنی ادھر یہ آیت نازل ہوئی۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ

جن لوگوں (یعنی مسلمانوں) سے کافر برسرپیکار ہو گئے ہیں ان کو اب اجازت دی جاتی ہے کہ وہ جہاد کریں کیونکہ کافروں نے پیش قدمی کر کے ان پر ظلم کیا ہے اور اب عقلاً مسلمانوں پر مدافعت فرض ہو گئی ہے اور ہم کفار کو مطلع کئے دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر یقیناً قادر[1] ہے ادھر مسلمانوں نے عمل کرنا شروع کر دیا۔

میرا مقصود اس تفصیل سے یہ دکھانا ہے کہ بنیادی چیز صحیح شعور اور جذبہ ہے جب یہ دونوں چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں تو عمل صالح خود بخود سرزد ہوتا ہے اس کو ایک مثال سے مزید واضح کرتا ہوں۔ زید کی بیوی بیمار ہے۔ بکر نے اس سے کہا کہ اس کے مرض کی دوا خالد کے پاس ہے جو کلکتہ میں رہتا ہے۔ گویا صحیح شعور (علم) پیدا ہو گیا۔ تو بیوی نے کہا اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے تو جس طرح ہو سکے وہ دوا حاصل کرو۔ بیوی کے اس قول نے صحیح جذبہ پیدا کر دیا۔ اب زید کو عمل (زحمت سفر برداشت) کرنے میں ہرگز دیر نہیں لگ سکتی وہ فوراً اپنی بیوی صاحبہ کو لے کر کلکتہ روانہ ہو جائے گا۔ کیونکہ اس مرض کی دوا وہاں موجود ہے۔

(۹)

---

[1] اللہ تعالیٰ نے مدد کا وعدہ اس وقت فرمایا جب مسلمانوں نے حصول نصرت کی شرائط ایمان اور محبت رسول بدرجۂ اتم پوری کر دیں آج کل کے مسلمان اگر ان شرطوں کو پورا کر دیں تو اللہ بھی یقیناً ان کی مدد فرمائے گا۔

نفسیاتِ غلامی

سخت باریک ہیں امراضِ اُمَم کے اسباب
کھول کر کیسے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی
دینِ شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی
ہو اگر قوّتِ فرعون کی درپردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی!

—(:)—

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے غلاموں کی نفسیاتی کیفیت کو واضح کیا ہے کہ غلامی کی بدولت ان کی نگاہ میں ایسی کجی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ شیر کو لومڑی سمجھنے لگتے ہیں اور عیب کو ہنر یقین کرنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ قوموں کی بیماریوں کے اسباب بہت پیچیدہ اور مخفی ہوتے ہیں یعنی کسی قوم کے زوال اور اس کی محکومی کے اسباب کا سمجھنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اگر ان کی تفصیل کی جائے تو بلا مبالغہ ایک طومار مرتب ہو جائے گا میں اس کا خلاصہ ایک فقرہ میں بیان کرنا چاہتا ہوں اور

وہ یہ ہے کہ :-

دوسرا شعر:- غلامی سے قوم کی ذہنیت اس درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ وہ سونے کو پیتل اور پیتل کو سونا سمجھنے لگتی ہے اس کو یعنی اس قوم کے علماء و مشائخ اور ائمہ کو شیروں کے دین یعنی اسلام میں لومڑیوں کی عیاری (غلامی کی تعلیم) کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

تیسرا شعر:- چنانچہ اس قوم میں جو شخص مصلح اور امامِ زماں ہونے کا مدعی ہوتا ہے وہ بھی اس کو غلامی کی تلقین کرتا ہے اور انگریزوں کی وفاداری کا درس دیتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر یہ شخص جو حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کا آرزومند ہے وہ الہام اور مکالماتِ الٰہیہ کا دعویٰ بھی کرے تو اس کے سب دعاوی اور الہامات قوم کے حق میں لعنت کے سبب بن جاتے ہیں کیونکہ اسلام اور غلامی ایک دوسرے کی ضد ہیں جو شخص مسلمانوں کو غیر اللہ کی غلامی کا سبق پڑھاتا ہے وہ خود ہی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

—(:)—

غلاموں کی نماز

(ترکی وفد ہلالِ احمر لاہور میں)

کہا مجاہدِ ترکی نے مجھ سے بعدِ نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام
وہ سادہ مردِ مجاہد، وہ مومنِ آزاد
خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نمازِ غلام
ہزار کام ہیں مردانِ حُر کو دنیا میں
انہیں کے ذوقِ عمل سے ہیں اُمتوں کے نظام
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم
کہ ہے مرورِ غلاموں کے روز و شب پہ حرام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
درائے سجدہ غریبوں کو اور کیا ہے کام
خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملّت کی زندگی کا پیام

شرح مشکلات ۱۹۳۵ء کے آغاز میں ترکی وفد متعلقہ ہلالِ احمر لاہور آیا تھا اور حضرت علامہ مرحوم سے ملاقات کے بعد اس کے ارکان نے مرحوم سے درخواست کی کہ شاہی جامع مسجد کے جلسہ میں جو بعد نماز منعقد ہوگا ضرور شرکت فرمائیں۔ اختتام جلسہ کے بعد رئیس الوفد نے مرحوم سے امام کے طولِ قرأت وسجدہ پر اپنے تعجب کا اظہار کیا۔ اقبالؔ چونکہ بہت ذکی الحس تھے اس لئے انہوں نے نظم کی صورت میں اپنے تاثرات کا اظہار کر دیا۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ترک مجاہد نے مجھ سے کہا کہ تمہارے امام اس قدر طویل سجدے کیوں کرتے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ بات یہ ہے کہ ترک تو مجاہد ہوتے ہیں انہیں کیا خبر کہ غلامی کی نماز کیسی ہوتی ہے؟

تیسرا شعر:۔ آزاد قوموں کے افراد کو اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لئے ہر وقت مصروف عمل رہنا پڑتا ہے یعنی وہ جہاد کی تیاری میں مصروف رہتے ہیں۔

چوتھا شعر:۔ لیکن غلاموں کو غلامی کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کام نہیں ہوتا لہٰذا غلاموں کے لئے یا ان کی نظر میں زمانہ بار روز و شب ساکن رہتا ہے کیونکہ زمانہ تو مقدار حرکت کا نام ہے اور غلاموں میں حرکت عمل کی ہوتی نہیں تو ان کی نظر میں زمانہ بھی ساکن ہو جاتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ اگر ہندوستان کے مسلمان طویل سجدہ کرتے ہیں

تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے طویل سجدوں کے علاوہ اور ان غریبوں کو کام بھی کیا ہے؟ نہ قواعد پریڈ سے کوئی تعلق ہے نہ اپنے گھوڑے کی نگہداشت سے کوئی علاقہ ہے نہ اپنے ہتھیاروں کی صفائی کی ضرورت ہے نہ رات کو سرحدوں کی حفاظت کا کام ہے نہ جسمانی ورزش کا خیال ہے نہ مسلمانوں کے گھروں پر جا کر انہیں جہاد کی ترغیب دینے کی ضرورت ہے غلامی کی نعمت نے مسلمانوں کو ان تمام زحمتوں سے مامون اور بری الذمہ کر دیا ہے۔

چھٹا شعر:۔ اللہ تعالیٰ ہندوستان کے ائمہ مساجد کو وہ سجدہ نصیب کرے جس میں ملّت کی زندگی کا پیام ہے یعنی جس کی بدولت ملّت زندہ ہو جائے۔

یوں تو میلہ بھی نمائش بھی دلآرام بھی ہے
یہ تو سب کچھ ہے بتاؤ کہیں اسلام بھی ہے

فلسطینی عرب سے

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے اُمّتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذّتِ نمود میں ہے

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے عربوں کو ساحرانِ فرنگ کے طلسم سے رہائی حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے جن لوگوں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ علامہ کے دل میں ملت اسلامیہ کی بہبود کا کس قدر درد تھا وہ رات و دن فلسطینی عربوں کے غم میں گھلتے رہتے تھے اور یہ نظم ان کے خلوص اور محبت کی جو انہیں اس قوم کے ساتھ تھی بڑی حد تک عکاسی کر سکتی ہے۔

واضح ہو کہ مجھ سے علامہ مرحوم نے خود ایک مرتبہ یہ فرمایا تھا کہ مجھے عربوں سے غیر معمولی محبت ہے کیونکہ یہ لوگ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک نسبت رکھتے ہیں۔ یعنی عربی بولتے ہیں۔ وہ زبان جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تکلّم فرماتے تھے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ اے فلسطین کے عرب! میں جانتا ہوں کہ تیرے وجود میں ابھی تک وہی آتش موجود ہے جس کے سوز سے زمانہ (دنیائے کفر) ابھی تک فارغ نہیں ہوا ہے یعنی کفارِ فرہنگ ہنوز مطمئن نہیں ہوئے ہیں کہ ہم نے عربوں کو زیر کر لیا ہے وہ ابھی تک اس آگ کو جو صلاح الدین ایوبی بلکہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بھڑکائی تھی بجھانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ سوز سے اقبال کی مراد وہ جذبۂ جہاد ہے جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے پیدا ہوا تھا۔ اور اکبر الہ آبادی نے اپنے اس مشہور شعر میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے یہ شعر اس نظم میں ہے جس میں ایک انگریز لڑکی مسلمان قوم سے اپنی نفرت و بغض و حسد کا سبب بیان کرتی ہے

چنانچہ کہتی ہے۔

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہیں نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد

اللہ اکبر۔ اکبر الٰہ آبادی نے ایک شعر میں انگریز کی پوری ذہنیت اسی قوم کی ایک لڑکی کی زبان سے واضح کر دی ہے۔

دوسرا شعر:۔ لیکن اے فلسطینی عرب! میں تجھے ایک مشورہ دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تیرے مرض کی دوا جنیوا (لیگ آف نیشنز) میں ہے نہ لندن (حکومتِ برطانیہ) میں۔

اے میرے بھولے مجاہد! فرنگ (اقوام یورپ) کی رگِ جاں تو خود یہودیوں کے پنجہ میں ہے وہ بھلا کیسے اور کیونکر تیری مدد کر سکتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ اس لئے تو مجھ سے رہائی کی ترکیب سن! غلامی سے نجات کا طریقہ صرف ایک ہی ہے ابھی تک دوسرا طریقہ ایجاد نہیں ہوا اور وہ یہ ہے کہ مسلمان

۱۔ پہلے خودی کی پرورش کرے یعنی اسے نقطۂ کمال تک پہنچائے۔

۲۔ پھر اس کے اظہار کی لذت کا احساس پیدا کرے۔

بالفاظ دگر پہلے شعورِ خودی پیدا کرے پھر جذبہ بمنود خودی ان دو باتوں کے بعد عمل یا جہاد خود بخود سرزد ہو گا اور اس شدت کے ساتھ کہ اس کے سامنے پہاڑ بھی قائم نہیں رہ سکتا یہ شعور کہ میرے سامنے غیر اللہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے انسان کو "سیل بے پناہ" بنا دیتا ہے۔

نوٹ :۔ کاش ارباب اقتدار اقتصادی پروگرام کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی خودی کی پرورش کا بھی کوئی پروگرام مدوّن فرمائیں تاکہ قوم حصول مقصد کی طرف پہلا قدم تو بڑھا سکے۔

اقبال نے کہنے کی حد تک سب کچھ کہہ دیا ہے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان کے ارشادات پر عمل کریں اور میں اپنے یقین کی پوری طاقت کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک ارباب حکومت خود عمل کرنا شروع نہیں کریں گے عوام میں عمل کا جذبہ اور داعیہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ بچپن ہی میں میرے بزرگوں (والدین) نے یہ حقیقت میرے دل پر نقش کر دی تھی کہ "جیسا راجہ ویسی پرجا" لہٰذا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ راجہ تو ہوٹلوں میں بیٹھ کر فرنگ کے کمالات رقص کی داد دے اور پرجا مسجدوں میں جا کر خودی کی تربیت کرے۔

مشرق و مغرب

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ مشرقی اور مغربی دونوں ملکوں کی قومیں اس وقت روحانیت تقویٰ اور پاکیزگی سے محروم ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر مختلف اخلاقی امراض میں مبتلا ہیں وہ وہ اس سے بے خبر ہیں کہ نجات تو ہم کو اپنے ہی کرموں سے ملے گی۔

پہلا شعر:۔ مشرقی ممالک میں اس محرومی (مرض) کا سبب سیاسی اور ذہنی غلامی ہے یعنی ایشیائی قومیں سیاسی طور سے تو فرنگی اقوام کی غلام ہیں اور ذہنی اعتبار سے جاہل صوفیوں اور تنگ نظر ملّاؤں کی غلام ہیں اس غلامی نے ان کے اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ غلام قوم کا دل مردہ ہو جاتا ہے یعنی خودی مردہ ہو جاتی ہے۔

اب رہے مغربی ممالک۔ تو یہاں کی قوموں کے مرض کا سبب جمہوری نظام ہے یہ نظام بظاہر بہت دلفریب ہے لیکن اس کے اندر بہت سی خرابیاں مضمر ہیں مثلاً جمہوریت میں ہر دولتمند آدمی یہ چاہتا ہے کہ مجھے زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل ہو جائے اس غرض سے وہ اپنی پارٹی بناتا ہے اور اس طرح متعدد پارٹیاں پیدا ہو جاتی ہیں اب ان پارٹیوں میں حصول اقتدار کے لئے رقابت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ہر پارٹی اپنی مخالف پارٹی کو ہر ممکن طریق سے نیچا دکھانے کی کوشش کرتی ہے اور جائز اور ناجائز حق اور ناحق سچ اور جھوٹ کی تمیز مٹا دیتی ہے۔

اس کے علاوہ ہر پارٹی ووٹ حاصل کرنے کے لئے ہر ناجائز طریقہ کو بلا تامل اختیار کر لیتی ہے اس طرف لالچ اور دھمکی جھوٹ اور عیاری کا بازار

گرم ہو جاتا ہے اندریں حالات خدا اور ضمیر شرافت اور آدمیت اصول اور انصاف غرضکہ ہر نیکی اور اچھائی سے یکسر دوری ہو جاتی ہے اور انسان اپنی خواہش کا غلام بن جاتا ہے جمہوری نظام میں کوئی شخص جو اقتدار کا خواہشمند ہے یہ نہیں دیکھتا کہ خدا کا فرمان کیا ہے بلکہ صرف ایک چیز مدّ نظر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ووٹ کس طرح حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ دونوں باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ضمیر مردہ ہو جاتا ہے اگر مشرق میں بنی آدم دیگر اقوام کے غلام ہیں تو مغرب میں بنی آدم ہوس اقتدار کے غلام ہیں یعنی غلامی دونوں جگہ موجود ہے اور اسی کو اقبال نے قلب و نظر کی رنجوری سے تعبیر کیا ہے۔

اگرچہ اقبال نے اس مرض کا علاج اس نظم میں بیان نہیں کیا لیکن ان کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ انہوں نے اس کا ثانی علاج متعدد مقامات میں بتایا ہے اور وہ یہ ہے کہ سب قومیں انسانوں کی غلامی کی بجائے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اختیار کر لیں پس ہر مسلمان کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ دنیا سے ملوکیت کو ختم کرنے کی کوشش کرے کیونکہ ملوکیت اور خدا پرستی دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ اور کوئی شخص بنی آدم پر حکمران نہیں ہو سکتا۔ لہذا جب تک ملوکیت باقی ہے اصلاح کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔

نفسات حاکمی

(اصلاحات)

یہ مہر ہے بے مہریٔ صیاد کا پردہ
آئی نہ مرے کام مری تازہ صفیری
رکھنے لگا مرجھائے ہوئے پھول قفس میں
شاید کہ اسیروں کو گوارا ہو اسیری

—(✣)—

شرح مشکلات اس نظم میں اقبال نے حکمراں قوم کی ذہنیت یا پالیسی کی وضاحت کی ہے کہ جب حکمراں قوم یہ دیکھتی ہے کہ محکوم قوم کے اندر بے چینی پیدا ہو چلی ہے اور ایجی نیشن کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے تو وہ کمال عیاری سے کام لے کر اصلاحات کا کھلونا ہاتھ میں دے دیتی ہے اور اصلاحات (Reforms) کی ترقی یافتہ صورت درجۂ نوآبادیات (Daminian statys) کہلاتی ہے یہ درجۂ غلامی ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے چنانچہ مصر کو دیکھ لیجئے۔ بظاہر یہ ملک آزاد ہے یہاں بادشاہ بھی ہے اس کا قصر بھی ہے۔ پارلیمان بھی ہے مجلس وزراء بھی ہے غرض کہ بظاہر سب کچھ ہے لیکن دراصل "وہی ڈھاک کے تین پات والا مضمون ہے یعنی انگریز

بہادر جس طرح ۱۹۱۵ء میں اس ملک پر حکمراں تھا اسی طرح آج ۱۹۵۱ء میں بھی اسی کا تسلط ہے۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ یہ اصلاحات داخلی آزادی یا درجۂ نو آبادیات بظاہر تو مہر (مہربانی) ہے لیکن در پردہ صیّاد کی بے مہری کا نشان ہے میرا احتجاج افسوس کہ میرے کام کچھ بھی نہ آیا۔

دوسرا شعر:۔ مجھے قفس سے تو باہر نکالا نہیں (جو میں چاہتا ہوں) ہاں اس میں کچھ مرجھائے ہوئے پھول بیشک رکھ دیئے ہیں تاکہ میں اس کو گلشن سمجھ کر چیخ و پکار سے باز آجاؤں اور اپنے نفس کو یہ فریب دے سکوں کہ مجھے حقیقی آزادی نصیب ہو گئی۔

(٭)

ششم حصّہ

محرابِ گل افغان کے افکار

محرابِ گُل افغان کے افکار

۱

میرے کہستاں! تجھے چھوڑ کے جاؤں کہاں
تیری چٹانوں میں ہے میرے اب و جد کی خاک
روزِ ازل سے ہے تو منزلِ شاہین و چرغ
لالہ و گل سے تھی نغمۂ بلبل سے پاک
تیرے خم و پیچ میں میری بہشت بریں
خاک تری عنبریں! آب ترا تابناک

باز نہ ہوگا کبھی بندۂ کبک و حمام
حفظِ بدن کے لئے روح کو کردوں ہلاک

اے مرے فقرِ غیور فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعتِ انگریز یا پیرہنِ چاک چاک

(٭)

تمہید

اس باب میں اقبال نے محراب گل افغان کی زبان سے اپنے افکار اور خیالات ظاہر کئے ہیں یہ ایک فرضی نام ہے اور اس کی ضرورت انہیں اس لئے محسوس ہوئی کہ انہوں نے بعض نظموں میں اسلوب بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ اس فرضی نام کے بغیر کلام میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی مثلاً پہلی نظم میں وہ سرحد کے کوہستان سے خطاب کرتے ہیں اور یہ اسلوب بیان اس امر کا متقاضی ہے کہ متکلم خود وہیں کا باشندہ ہو۔

دراصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دل میں ملت کا درد اس درجہ تھا کہ میں بذریعہ الفاظ بیان نہیں کر سکتا وہ ساری عمر ملت اسلامیہ کے درد میں تڑپتے رہے یہ مبالغہ نہیں ہے بالکل حقیقت ہے میں نے ۱۹۲۴ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک چودہ سال ان کی صحبت میں گذارے اور میں شہادت دے سکتا ہوں کہ میں نے خود بارہا انہیں ملت کی بربادی کے غم میں بچوں کی طرح روتے دیکھا ہے اور اس درد ملت کا راز یہ ہے کہ وہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت کرتے تھے اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

قوم کی تباہی ان سے برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر افغان بیدار ہو جائیں گے تو شاید ایشیا میں اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا کچھ انتظام ہو جائے گا اس لئے انہوں نے ساری عمر افغانوں کی خودی کو بیدار کرنے کی کوشش کی ۱۹۳۳ء میں افغانستان جانے سے کچھ دنوں پہلے میرے ایک اعتراض کے جواب میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ

"تم جذباتی ہو اس لئے نادر شاہ سے ناراض ہو یہ دیکھو کہ بچہ سقہ کو ختم کر کے اس نے کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے میں جلبِ منفعت کے لئے نہیں جا رہا ہوں مجھے محض اسلامی اخوت کا جذبہ کھینچے لئے جا رہا ہے کیا عجب کہ میں اس قوم کی بیداری میں کوئی حصہ لے سکوں۔"

مرحوم نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ:

"ہندوستان کے مسلمان تو کئی سو سال سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں انگریز کا مقابلہ اگر کر سکتے ہیں تو وہ مسلمان کر سکتے ہیں جو پشاور اور کابل کے درمیانی علاقے میں رہتے ہیں کاش اللہ کا بندہ ان کوہستانی شیروں کو بیدار کر سکے۔"

ان نظموں میں اقبال نے درپردہ مسلمانوں کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا ہے کہ کوہستانی صحرائی یا بدوی زندگی خودی کی تربیت کے لئے بہت موزوں ہے اور میں اس باب میں اقبال سے بالکل متفق ہوں کہ پاکستان کی اخلاقی فضا تو پرورش خودی کے لئے بالکل موزوں نہیں ہے ان شہروں میں

کالج۔ اسکول۔ بورڈنگ۔ ہوٹل۔ کیفے۔ کافی ہاوس (R.C.C) کلب اور سینما۔ ٹیلی ویژن۔ الامان۔ الحفیظ۔

یہ تعلیم گاہیں اور تفریح گاہیں نہیں ہیں بلکہ وہ مقامات ہیں جہاں مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی اسلامی روح بغیر کارد و خنجر ذبح کی جاتی ہے اور بڑی بے دردی کے ساتھ ذبح کی جاتی ہے اور جب تک موجودہ نظام تعلیم کو تبدیل نہ کیا جائے اصلاح حال کی کوئی صورت نہیں ہے۔

۱

اس نظم میں محراب گل اپنے کو ہندستانی وطن سے خطاب کرتا ہے کہ

پہلا شعر:۔ اے میرے وطن! مجھے تجھ سے بے حد الفت ہے میں تجھے کسی قیمت پر غیروں کے حوالہ نہیں کر سکتا میری تمام خاندانی روایات تیری چٹانوں سے وابستہ ہیں اور ان میں میرے بزرگوں کی ہڈیاں اور گوشت پوست مدفون ہیں۔

واضح ہو کہ اس شعر سے اس محبت کا اظہار ہوتا ہے جو ہر شخص کو اپنے وطن سے قدرتی طور پر ہوتی ہے اس جگہ یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اقبال تو یہ کہتے ہیں۔

ع مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہان ہمارا

پھر وہ افغانوں کو اپنے کو ہندستانی وطن سے محبت کرنے کی تلقین کیوں کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وطن کے دو معنی ہیں۔

۱۔ وطن بمعنی وطنیت یعنی ایک سیاسی تصوّر جس کی رو سے ایک شخص صرف اپنے وطن سے محبت کرتا ہے اور دوسرے ملکوں یا قوموں سے نفرت کرتا ہے اور اپنے وطن کو وہ درجہ دیتا ہے جو اسلام نے اللہ کو دیا ہے اس معنی وطن کی محبت اقبال کے یہاں مذموم ہے۔

۲۔ وطن بمعنی وہ ملک جہاں ایک شخص پیدا ہوا ہو اور اس سے قدرتی طور پر محبت ہوتی ہے یہ محبت اقبال کے یہاں محمود ہے اور اسی اعتبار سے شیخ سعدی نے یہ رباعی لکھی تھی جو زبان زد خاص و عام ہے۔

حبِّ وطن از ملک سلیماں خوشتر — خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
یوسف کہ بمصر پادشاہی می کرد — می گفت گدا بودن کنعاں خوشتر

اقبال نے جو یہ کہا ہے کہ

ع مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

یہ قول وطن سے محبت کے خلاف نہیں ہے بلکہ نظریۂ وطنیت کے خلاف ہے یعنی اقبال وطن پرستوں سے یہ کہتے ہیں کہ جو مرتبہ تم اپنے مخصوص وطن کو دیتے ہو وہی درجہ ہم ساری دنیا کو دیتے ہیں تم اپنی ساری ہمدردی ایک مخصوص خطۂ ارضی سے وابستہ کرتے ہو لیکن ہم اپنی ہمدردی ساری دنیا سے وابستہ کرتے ہیں کیونکہ ہم جس اللہ پر ایمان لائے ہیں وہ صرف اٹلی یا انگلستان جرمنی یا فرانس کا رب نہیں ہے بلکہ ربُّ العالمین ہے ساری کائنات کا پرورش کرنے والا ہے اس لئے ہم اس کے پرستار ہونے کی حیثیت سے مجبور ہیں کہ کسی قوم سے نفرت نہ کریں کسی سے دشمنی نہ کریں سب انسانوں کو اپنا بھائی سمجھیں

سب کی خیر خواہی کریں۔

اب رہا اپنا وطن اس سے محبت کرنا بالکل قدرتی بات ہے اور اگر کوئی دشمن ہم پر حملہ آور ہو تو ہم اپنے وطن کی حفاظت میں اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے لیکن تم وطن پرستوں کی طرح ہم اپنے وطن کو اپنا معبود نہیں سمجھتے مثلاً اگر ہمیں اپنے وطن میں اللہ کا نام لینے کی اجازت نہ ہو یا ہم وہاں اسلامی زندگی بسر نہ کر سکیں تو پھر ہم اپنے وطن سے بخوشی ہجرت کر کے دوسری جگہ چلے جائیں گے جہاں ہم اللہ کا نام لے سکیں وطن کی محبت ہمیں ترک اسلام پر آمادہ نہیں کر سکتی اگر ہمارے سامنے یہ دو صورتیں ہوں کہ یا اسلام ترک کرو یا وطن ترک کرو۔ تو ہم بلا تامل دوسری صورت اختیار کریں گے۔ یہی مفہوم اس مصرع کا ہے

ع مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

دوسرا شعر:۔ اے میرے کوہستان! تیری سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تو قدیم زمانہ سے باز۔ شاہین۔ چرغ اور دوسرے شکاری پرندوں کا مسکن ہے اور بلبل کے نغموں اور گلاب اور لالہ کے پھولوں سے پاک ہے۔

بظاہر یہ شعر بہت آسان ہے اور اس میں کوئی لفظ مشکل نہیں ہے لیکن اقبال نے رمز و ایماء سے کام لے کر اس میں بڑے شاندار معانی پوشیدہ کر دیئے ہیں شاہین تو ایک مشہور و معروف شکاری پرندہ ہے اور اقبال کا محبوب ہے کیونکہ وہ ان خصوصیات کا حامل ہے جو وہ اپنی قوم کے نوجوانوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن چرغ غیر معروف ہے۔

واضح ہو کہ یہ شکاری پرندہ چرغ جسامت میں شاہین سے بڑا اور باز کے برابر ہوتا ہے اور جس طرح ہر شکاری پرندہ میں ایک خصوصیت ہوتی ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ زبردست پرندہ چیل جیسی طاقتور اور چالاک ہستی کا شکار کرتا ہے جو خود دوسروں کا شکار کرتی ہے چرغ کی چونچ اس قدر طاقتور ہوتی ہے کہ وہ اس کی مدد سے چیل کی گردن کی ہڈی توڑ دیتا ہے اور اپنے سے بڑے پرندے کو اپنی چونچ میں اس طرح لٹکائے اڑتا ہے جس طرح چیل چوہے کو چونچ لٹکا لیتی ہے۔

چرغ اور چیل کی لڑائی بلا مبالغہ دنیا کے دلکش ترین مناظر میں سے ہے یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس منظر کو مدۃ العمر فراموش کر سکے اگرچہ اس دلکشی کا اظہار لفظوں سے کسی طرح ممکن نہیں تاہم میں اس جنگ کا تھوڑا سا حال ضرور بیان کرونگا تاکہ ناظرین پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ اقبال نے چرغ کا تذکرہ بلاوجہ نہیں کیا۔

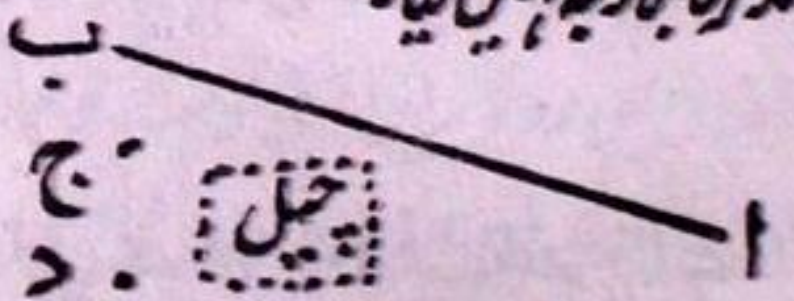

قاعدہ یہ ہے کہ جنگل میں پہنچ کر چرغ کی آنکھوں سے ٹوپی اتار کر اُسے اشارہ سے کوئی چیل دکھا دیتے ہیں تو وہ مقام الف سے چڑھائی شروع کرتا ہے۔ عموماً الف اور ب کا فاصلہ ایک ہزار فٹ سے کم نہیں ہوتا یہ اس لئے کہ چیل اگر فوراً آگاہ ہو جائے تو چرغ کی چڑھائی کا لطف جاتا رہے تھوڑی دیر کے بعد چیل جس کی آنکھ بہت تیز ہوتی ہے بلکہ تیزی میں ضرب المثل ہوتی ہے

چرغ کو دیکھ لیتی ہے اور اونچی ہونے لگتی ہے چرغ بھی ساتھ ساتھ اونچا ہوتا ہے اور اپنی جسمانی طاقت اور بازوؤں کی بے پناہ قوت کی بدولت جب چیل نقطہ ج پر پہنچتی ہے تو وہ نقطہ ب پر پہنچ جاتا ہے یعنی چیل سے ۱۵ تا ۲۰ فٹ بلند تر۔ یہاں سے وہ کندے تول کر چیل پر گرتا ہے (ٹھیک جس طرح آج کل تیراک اوپر سے حوض میں گرتا ہے) چیل کن انکھیوں سے دیکھتی رہتی ہے اور جس وقت چرغ اس سے ایک فٹ کے فاصلے پر رہ جاتا ہے نہایت پھرتی کے ساتھ کاوا کاٹ دیتی ہے جسے شکاریوں کی اصطلاح میں ڈاج دینا (Dodge) کہتے ہیں۔ چرغ اس سرعت کے ساتھ آتا ہے وہ نقطہ د ال تک ڈوب جاتا ہے اور چیل فوراً اونچی ہو جاتی ہے۔ اب چرغ مقام د ال سے کمال سرعت کے ساتھ پلٹ کر خطِ مستقیم پر پھر چیل کا تعاقب کرتا ہے اور اس صعود یعنی بالکل سیدھی چڑھائی میں اپنی جسمانی طاقت۔ حوصلہ بازوؤں کی قوت اور سرگرمی (بلکہ اقبال کی اصطلاح میں پڑ دمی) کا وہ مظاہرہ کرتا کہ دنیا کا کوئی پرندہ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔

الغرض وہ دوبارہ چیل سے ۱۵ یا ۲۰ فٹ بلند ہوتا ہے واضح ہو کہ چیل اب اس مقام پر نہیں ہے بلکہ کچھ فاصلہ پر ہوتی ہے جسے میں نے نقطہ ہ سے واضح کیا ہے اور پھر پہلا سین (منظر) دوبارہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے تماشائی لوگ ایسے از خود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ اس موقع پر خود تماشا بن جاتے ہیں میں نے بعض اوقات چرغ کو بیس مرتبہ اسی طرح چیل پر گرتے دیکھا ہے اور بعض اوقات تین تین میل تک جنگل میں بھاگتا چلا گیا ہوں تاکہ یہ منظر نگاہوں سے اوجھل

نہ ہو جائے۔

انجام کار ایک دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ چیل چرغ کی زد میں آجاتی ہے اور وہ اس کی گردن پکڑ کر ایک ہی جھٹکے میں اسے اَدھ مو اکر دیتا ہے اور پنجے کے بجائے چونچ ہی میں لئے ہوئے زمین پر اترتا ہے۔ تماشائیوں کا یعنی شکاریوں کا ہجوم بے تحاشا اس کے پاس جا پہنچتا ہے اور باز دار (جس نے اس کو سدھایا ہے) چیل اس کے پنجے سے نکال کر مرغ کا سینہ یا ران اس کو کھانے کے لئے دیتا ہے جب تک میں نے چرغ کو ڈوب کر دوبارہ چڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اقبال کا یہ مصرع میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

ع پُر دم ہے اگر تو۔ تو نہیں خطرۂ افتاد

اب ہم اس شعر کے مفہوم پر غور کرتے ہیں۔ اقبال نے کوہستان کی دو خوبیاں بیان کی ہیں۔ (۱) یہ علاقہ شاہین اور چرغ کا مسکن ہے۔ (۲) یہاں گل (گلاب) لالہ اور بلبل نہیں ہوتا۔

اور اقبال یہی دو خوبیاں اپنی قوم کے نوجوانوں میں دیکھنی چاہتے تھے وہ چاہتے تھے کہ قوم کے نوجوان اپنے اندر شاہینی صفات پیدا کریں اور آرائش جسمانی اور رقص و موسیقی سے اجتناب کریں کیونکہ ان باتوں سے نسوانی صفات پیدا ہوتی ہیں اور جد و جہد کا جذبہ سرد ہو جاتا ہے۔

جب محراب گل اپنے کوہستانی وطن کی یہ خوبیاں بیان کرتا ہے تو وہ در پردہ قوم کو یہ پیغام دیتا ہے کہ شاہین اور چرغ کی طرح اپنے بازوؤں میں طاقت پیدا کرو اور بلبلوں کی طرح رنگ و بو پر فریفتہ مت ہو۔

یہ باتیں چونکہ صحرائی زندگی میں پیدا ہوتی ہیں اس لئے اقبال اس طرز زندگی کو شہری زندگی پر ترجیح دیتے ہیں حضرات انبیاء علیہم السّلام کی زندگیوں کے مطالعہ سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سیرت کی تشکیل اس خطّہ میں ہو سکتی ہے جو نغمۂ بلبل سے پاک ہو اسی چیز کو اقبال نے اس مصرع میں بیان کیا ہے۔

ع ہوائے دشت و شبیب و شبانی شب و روز

تیسرا شعر:۔ اے میرے کوہستانی وطن! تو مجھے اس قدر عزیز ہے کہ تیرے خم و پیچ میری نگاہ میں بہشت بریں ہیں تیری خاک میری نگاہ میں عنبر کی طرح قیمتی اور خوشبودار ہے اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ تیرا پانی نہایت چمکدار اور شفاف ہے۔

چوتھا شعر:۔ جس طرح باز کبھی تیتر اور کبوتر کی غلامی نہیں کر سکتا اسی طرح میں کبھی انگریز کی غلامی نہیں کر سکتا اور ایسا کر بھی کیسے سکتا ہو سکتا ہوں؟ بیشک مجھے "خان بہادر" کا خطاب بھی مل جائے گا اور موٹر بھی میرے پاس ہو گی لیکن میرا ضمیر (کائنات میں سب سے قیمتی چیز خدا کی سب سے بڑی نعمت) مردہ ہو جائے گا اور جب ضمیر مردہ ہو گیا تو انسان اور گدھے یا گھوڑے میں کوئی فرق نہیں رہتا یعنی ضمیر کے مردہ ہو جانے کے بعد پھر حضرتِ انسان کے پاس وہ چیز کونسی ہے جس کی بدولت اسے حیوان پر تفوق یا برتری حاصل ہو سکتی ہے؟ محرابِ گل کی رائے میں غلامی سے انسان پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ صرف "حیوان" باقی رہ جاتا ہے اور اس حیوان اور دیگر حیوانات

میں کوئی فرق نہیں ہے۔

پانچواں شعر:۔ محراب گل اپنی لشان فقر سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اگر میں انگریز کی غلامی اختیار کر لوں تو آج میری ظاہری حالت میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ جب وہ پشاور یا کوئٹہ میں دربار منعقد کرے گا تو دوسرے غلاموں کے ساتھ مجھے بھی شرکت کی دعوت آئے گی اور خلعت فاخرہ عنایت ہو گا لیکن میں اس خلعت پر جو ضمیر فروشی کے بعد حاصل ہو اپنی پھٹی ہوئی شلوار کو ترجیح دیتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ محراب گل کا فیصلہ صحیح ہے۔

۲

حقیقتِ ازلی ہے رقابتِ اقوام
نگاہِ پیرِ فلک میں نہ میں عزیز نہ تو
خودی میں ڈوب زمانے سے نا امید نہ ہو
کہ اس کا زخم ہے درپردہ اہتمامِ رفو
رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں لَا شَرِیْکَ لَہٗ

۲

پہلا شعر:۔ اس نظم میں اقبال نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اسی وقت سے مختلف اقوام میں رقابت کا بازار گرم ہے کیونکہ رقابت کا جذبہ افراد کی فطرت میں داخل ہے اور دنیا میں پہلی خونریزی (اشارہ ہے ہابیل کے بے گناہ مقتول ہونے کی طرف) اسی جذبۂ رقابت یا حسد کا نتیجہ تھی اور یہ سلسلہ اسی طرح تا قیامت جاری رہے گا۔

اندریں حالات اگر ہمارے اندر بدقسمتی سے یہ غلط عقیدہ راسخ ہو جائے کہ ہم "فلک پیر" یعنی کارکنانِ قضا و قدر کی نگاہوں میں محبوب ہیں اس لئے ہم کو دوسری قومیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ تو یہ ہمارے حق میں بہت مضر ثابت ہوگا کیونکہ اگر ہم یہ یقین کر لیں کہ ہم "اللہ میاں کے لاڈلے ہیں اور ہمیں کوئی زیر نہیں کر سکتا تو لامحالہ کچھ عرصہ کے بعد ہم جد و جہد اور تنازع للبقاء سے بے گانہ ہو جائیں گے اور یہ بیگانگی ہمارے حق میں بلا مبالغہ پیام موت ثابت ہوگی۔

سب سے پہلے یہ عقیدہ بنی اسرائیل میں پیدا ہوا انہوں نے دعویٰ کرنا شروع کیا کہ ہم خداوند کے لاڈلے بیٹے ہیں ہمیں نہ اس دنیا میں کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے نہ اس دنیا میں لیکن اس عقیدہ کا نتیجہ دنیا نے بہت جلد دیکھ لیا کہ یہود ساری دنیا میں ذلیل و خوار ہیں اس کے بعد مسلمانوں میں یہ بھی عقیدہ پیدا ہو گیا اور اس کا نتیجہ آج بیسویں صدی میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں تفصیل

کی ضرورت نہیں صرف ایک فقرہ میں ہماری حالت بیان کی جاسکتی ہے کہ آج کوئی قوم ہم سے زیادہ ذلیل وخوار نہیں ہے۔

ع برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

دوسرا شعر:۔ پس جب یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ۔

(۱) ۔ اقوام عالم میں رقابت کا جذبہ فطری طور پر موجود ہے۔

(ب) ۔ خدا کی نظر میں سب قومیں یکساں ہیں کوئی قوم اس کی محبوب (Favorite) نہیں ہے جو قوم بھی اس کے قوانین کی پابندی کرے گی وہ دنیا میں سربلندی حاصل کرے گی۔

تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ "خودی میں ڈوب جائیں" (ڈوبنے سے اقبال کی مراد ہے۔ پہلے اپنی مخفی طاقتوں کا شعور حاصل کرنا پھر ان طاقتوں کو بروئے کار لانا) یعنی اپنی خودی کی تربیت کرکے اسے نقطۂ کمال تک پہنچا دیں اور اس حقیقت کو مدنظر رکھیں کہ اس سلسلہ میں اگر دشواریاں مصیبتیں۔ پریشانیاں اور تکالیف پیش آئیں تو ہرگز کبیدہ خاطر نہ ہوں کیونکہ یہ زخم درپردہ اہتمام رفو ہے یعنی خودی ہمیشہ آزمائشوں اور مصیبتوں کی بھٹی میں پڑ کر کندن بنتی ہے کیونکہ میل کچیل کے صاف کرنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔

تیسرا شعر:۔ اے مسلمان! تو یورپ کی قوموں کی ظاہری شان وشوکت سے ہرگز مرعوب نہ ہونا اگر تو اس صداقت کو اپنے دل ودماغ کی گہرائیوں میں اتار دے کہ جس طرح تخلیق اور ربوبیتِ کائنات میں کوئی ہستی اللہ تعالیٰ کی شریک نہیں ہے اسی طرح حکومت اور فرماں روائی میں بھی کوئی شخص اس

ایزدِ متعال کا شریک و سہیم نہیں ہے تو میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت (مثلاً امریکہ یا روس) تجھ کو زیر نہیں کر سکیں گی۔

واضح ہو کہ ایک عرصہ سے مسلمانوں کی نکبت اور زبوں حالی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اس حقیقتِ کبریٰ اور صداقتِ عظمیٰ سے بالکل بیگانہ ہو گئے ہیں کہ لَا شَرِیْکَ لَہٗ کا مطلب صرف یہی نہیں کہ ذات کے اعتبار سے اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے بلکہ صفات و عبادت اور اطاعت کے لحاظ سے بھی کوئی ہستی اس کی شریک یا ندِ مقابل یا ہمسر نہیں ہے مسلمان مدتوں سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ شرک جس سے بڑا کوئی گناہ نہیں بفحوائے آیت آیت قرآنی اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ۔ بیشک اللہ اس جرم یا گناہ کو کبھی معاف نہیں کرے گا کہ کوئی انسان کسی کو اس کا شریک قرار دے شرک صرف اس بات کا نام ہے کہ کوئی شخص اللہ کے ساتھ کسی اور ہستی کو بھی اس کا ہمسر یا شریک تسلیم کرے حالانکہ شرک کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ واضح ہو کہ شرک کی چار قسمیں ہیں۔

(ا) ۔ شرک فی الذات :۔ جس کی تشریح اوپر بیان ہو چکی ہے اس کی رو سے مجوسی جو دو خداؤں کو مانتے ہیں اور نصاریٰ جو تین خداؤں کو تسلیم کرتے ہیں اور ہنود جو بقول رگِ وید ۳۳ خداؤں پر ایمان لاتے ہیں سب مشرکوں کی فہرست میں داخل ہیں۔

(ب) ۔ شرک فی الصفات :۔ یہ ہے کہ ایک شخص خدا کو تو ایک مانتا ہے لیکن اس کی صفات میں دوسروں کو بھی شریک کرتا ہے مثلاً اللہ کی ایک صفت یہ

ہے کہ وہ بیماروں کو اچھا کرتا ہے اور مصیبتوں کو دور کرتا ہے اور مشکل کشا ہے۔ حاجت روا ہے۔ دستگیر ہے۔ بلاؤں کو دفع کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اب اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ زید۔ یا فلاں پیر اجمیری یا فلاں ہجویری یا فلاں شخص میں یہ سب قدرت ہے کہ وہ بذات خود بیماروں کو صحت دے سکتا ہے زندگی بخش سکتا ہے اور مصائب کے وقت انسانوں کی دستگیری کر سکتا ہے یا مشکل کشائی کر سکتا ہے یا اولاد دے سکتا ہے تو وہ شخص مشرک ہے اگرچہ عرف عام میں اس کو مشرک نہیں کہتے ہیں لیکن قرآنی تعلیمات کی رو حقیقی مشرک ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح شرک فی الذات کا معتقد ہوتا ہے۔

(ج) ۔ شرک فی العبادت :۔ یہ ہے کہ انسان کسی دوسری ہستی کی توقیر یا تعظیم اسی رنگ اور طرز میں کرے جس رنگ میں وہ اللہ کی توقیر یا تعظیم کرتا ہے یا جس طرح اللہ کو سجدہ کرتے ہیں غیر اللہ کو سجدہ کرنے لگے[1]۔

(د) ۔ شرک فی الحکم :۔ یہ ہے کہ کوئی مسلمان اللہ کے قانون کے علاوہ کسی انسان یا غیر اللہ کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت کرے چنانچہ قرآن حکیم میں صاف ارشاد ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ اور جو کوئی حکم نہ کرے اس چیز کے موافق جو اللہ نے اتارا ہے سو وہی لوگ کافر ہیں۔ یعنی مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں اور ہر معاملہ

---

[1] حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نے اسی لئے دربار عام میں زمینِ مرید جہانگیر میں اکبر بادشاہ مرتد کو سجدہ نہیں کیا تھا کیونکہ یہ فعل سراسر مشرکانہ ہے۔

میں اور ہر بات میں قرآن حکیم کے فیصلہ کے علاوہ اور کسی کتاب یا ضابطہ یا قانون کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کر سکتا۔

افسوس کہ مسلمانوں نے ملوکیت کی لعنت میں مبتلا ہو جانے کی بدولت شرک کی اس چوتھی قسم کو اپنے عقائد سے خارج کر دیا اور اس کی ذمہ داری بلاشبہ ان امراء و علماء سوٗ اور مشائخ سوٗ پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ملوکیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ چنانچہ ان کے اس غیر اسلامی طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان رفتہ رفتہ اس حقیقت سے بالکل بیگانہ ہو گئے کہ سلاطین کے نافذ کردہ قوانین کی اطاعت بھی شرک ہے۔

میں اپنے یقین کی پوری قوت کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کرتا ہوں کہ آج تمام دنیا کے مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ان کو اس حقیقت کبریٰ سے پھر آگاہ کیا جائے کہ جس آئین کی بنیاد قرآن اور سنت نبوی پر نہ ہو اس کی اطاعت قطعاً ناجائز ہے۔

(٭)

۳

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سوٗ بدل جائے

وہی شراب وہی ہائے و ہو رہے باقی
طریقِ ساقی و رسم کدو بدل جائے
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

۳

اس نظم میں اقبال نے محراب گل کی زبان سے دعا کا فلسفہ بیان کیا ہے اور اس کے ضمن میں اس حقیقت کو دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے کہ دعا کے ساتھ ساتھ جدوجہد بھی ضروری ہے۔

واضح ہو کہ اسلام الیسا دین یا دستور حیات ہے جو نہ انسان کو محض دعا پر بھروسہ کرنے کی تلقین کرتا ہے اور نہ محض ذاتی جدوجہد پر اعتماد کرنا سکھاتا ہے بلکہ وہ ان دونوں ضروری باتوں میں ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے یعنی دعا بھی کرو اور جدوجہد سے بھی غافل نہ ہو۔

دعا یعنی اللہ کو پکارنا بمعنی اینکہ اس سے اپنی حاجت یا ضرورت کو پورا کرنے کی التجا کرنا یہ فعل دین اسلام کی روح ہے بلکہ نفس مذہب کا دار و مدار دعا ہی پر ہے۔ دعا ثبوت ہے اس بات کا کہ بندہ اپنی عاجزی بیچارگی درماندگی اور کمزوری کا اقرار کر رہا ہے اور اللہ کو اس کائنات کا خالق رازق مالک اور حاکم تسلیم کر رہا ہے اس دوگونہ اعتراف سے انسانی روح کا اللہ کی ذات

سے ایک دارالفہم طریق پر رابطہ (Communion) یا رشتہ یا علاقہ پیدا ہو جاتا ہے اور چونکہ انسان کی پیدائش سے مقصد بھی یہی ہے اس لئے میں نے دعا کو مذہب کی روح سے تعبیر کیا ہے اور میری کیا حقیقت ہے؟ یہ نکتہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک سے اخذ کیا ہے۔ جو یہ ہے اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔

بعض لوگ اپنی کوتاہ بینی سے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب ہماری دعاؤں سے قضاء (مشیّتِ ایزدی یا نظام کائنات) نہیں بدل سکتی تو پھر دعا کرنے کی کیا ضرورت ہے یا اس کا کیا فائدہ ہے؟ جب ہماری دعاؤں سے اللہ کے فیصلوں میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تو ہم اس فعل عبث کا ارتکاب بھی کیوں کریں؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دعا کی غرض و غایت یہ نہیں ہے کہ تم مشیتِ ایزدی میں مداخلت کر دیا۔ خدا سے یہ درخواست کرو وہ دنیا کا نظام تمہاری خواہش کے مطابق چلائے بلکہ دعا سے مقصد یہ ہے کہ۔

۱۔ بندہ کے دل میں ہر وقت اپنی بندگی کا احساس پیدا ہوتا رہے۔

۲۔ بندہ ہر وقت اپنے خالق اور معبود سے رابطہ استوار کرتا رہے

۳۔ بندہ اپنے آپ کو فاعل یا موثر حقیقی نہ سمجھنے لگے۔

واضح ہو کہ دنیا میں ہر قسم کی بے دینی اور خرابی کا سرچشمہ یہی غلط عقیدہ تو ہے کہ انسان اپنے آپ کو فاعل یا مؤثر حقیقی سمجھتا ہے لیکن دعا کرنے سے انسان کے اندر نہ کبھی تکبر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک سکتا ہے۔

۴ ۔ بندہ دعا کے ذریعہ سے ذکر الٰہی کا خوگر ہو جاتا ہے اور اللہ کو یاد کرنا اور یاد کرتے رہنا یہ سب سے بڑی نیکی ہے جس سے بڑی نیکی کوئی نہیں ہے چنانچہ قرآن مجید صاف لفظوں میں ارشاد فرماتا ہے وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر سب عبادتوں اور نیکیوں سے بڑھ کر ہے۔

اب ہم نظم کا مطلب لکھتے ہیں

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ یہ تو بیشک ممکن نہیں ہے کہ تیری دعا سے اللہ اپنے فیصلوں کو بدل دے یعنی ہو گا تو وہی جو وہ چاہتا ہے مثلاً زید ایک شریف آدمی ہے وہ ہندہ سے نکاح کا طالب ہے اس لئے دعا کرتا ہے اب اگر اس کی یہ آرزو مشیت ایزدی کے مطابق نہیں ہے تو اس کی یہ دعا بھی قبول نہیں ہو گی لیکن دعا پر مواظبت و استقامت کرنے سے یہ ضرور ممکن ہے کہ خود تیرے اندر انقلاب پیدا ہو جائے وہ یہ کہ تو اپنا رابطہ اللہ تعالیٰ سے استوار کرے اور یوں تیرے اندر اس کے قوانین کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

اگر ایسا اطاعت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو یقیناً انقلاب ہو جانا ممکن ہے پھر تو یہ حقیقت ضرور تجھ پر منکشف ہو گی کہ اگر ایک طرف اللہ نے کائنات کا انتظام اپنے دست قدرت میں رکھا ہے تو دوسری طرف ہمیں جد و جہد کا بھی حکم دیا ہے یعنی ہم سے اللہ نے صاف لفظوں میں فرما دیا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔ یعنی اللہ نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ

وہ کسی قوم کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم پہلے خود اپنے ضمیر کی گہرائی میں تبدیلی نہ کرے جب ہم اس قانون پر غور کریں گے تو یقیناً ہمارے اندر صحیح اسلامی شعور پیدا ہو جائے گا اور قرآن مجید میں جس قدر قوانین بیان کئے گئے ہیں ان کا مقصد صحیح شعور پیدا کرنا ہی تو ہے اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ انقلاب کا وقوع شعور پر موقوف ہے۔

دوسرا شعر:۔ قرآن حکیم شعور میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور جب کسی فرد یا قوم کے شعور میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے تو وہ قوم اپنی خودی میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے اور جب کسی قوم کی خودی میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے تو پھر قوم دنیا میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ اقبال نے جاوید نامہ میں قرآن حکیم کی اس صفت کو ان اشعار میں بیان کیا ہے۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — این کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

واضح ہو کہ قرآن حکیم آسمان کے نیچے انقلاب کا سب سے بڑا پروگرام ہے لیکن ہم مسلمانوں کی جہالت کے باعث اس زمانہ میں یہ انقلابی منشور یہ زندگی کا پیغام محض گنڈوں اور تعویذوں کا خزانہ بن کر رہ گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اے مسلمان! اگر تو سچے معنوں میں مسلمان بن جائے تو عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے یعنی یہی دنیا جس میں آج تو کسی جگہ عزت کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ یہی دنیا جس میں کوئی قوم تجھ سے خائف نہیں ہے اسی دنیا میں تو سربلند ہو سکتا ہے اور اقوام عالم تجھ سے مرعوب

ہو سکتی ہیں۔

نوٹ:۔ اسی لئے میں گذشتہ بیس سال سے اپنی قوم کو بڑے خلوص کے ساتھ یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ اگر سربلندی کامیابی اور حکمرانی کی آرزو ہے۔ تو افراد قوم اپنی خودی میں انقلاب پیدا کریں۔ اس کے بغیر خارجی دنیا میں کوئی انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا۔

"یہی وجہ ہے کہ انگریز کی نگاہ کرم کے صدقہ میں پاکستان بن جانے کے باوجود مسلمانوں کی زندگی میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہو سکا اور نہ ہو سکتا ہے جو عریانی۔ فحاشی اور عیاشی قیام پاکستان سے پہلے سندھ اور پنجاب میں پائی جاتی تھی وہی بلکہ اس سے بڑھ کر آج پائی جاتی ہے کیا اب بھی مسلمانوں کو اس قانون کی صداقت میں کوئی شک و شبہ باقی ہے کہ زندگی اپنے حوالی میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں انقلاب پیدا نہ کرے۔" (دیباچہ پیام مشرق ص۹)

تیسرا شعر:۔ اے مسلمان! اگر تو قرآن حکیم کے مقرر کردہ خطوط پر اپنی خودی میں انقلاب پیدا کرے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اگرچہ شراب بھی وہی رہے گی اور اس کی سرمستی بھی وہی رہے گی لیکن ساقی کا طریقہ اور مے نوشی کا انداز بدل جائے گا۔ یعنی یہ دنیا بھی وہی رہے گی اور اس کے علائق بھی وہی رہیں گے اور اس میں جو قوانین نافذ ہیں وہ بھی وہی رہیں گے یعنی یہ نہیں ہوگا کہ انقلاب کے بعد پانی پیاس بجھانا چھوڑ دے گا لیکن تیرے ساتھ اللہ کا طرز عمل بدل جائیگا یعنی آج اللہ کی نظر کرم تجھ پر نہیں ہے غیروں پر ہے پھر یہ صورت بدل جائیگی

ساقی کی نگاہ کرم تجھ پر بھی ہوگی۔

چوتھا شعر:۔ اس شعر کے دو مطلب ہیں۔ پہلا مطلب یہ ہے کہ تو عموماً خدا سے یہ دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ! میری فلاں فلاں آرزوئیں پوری ہو جائیں مثلاً مجھے دولت عطا کر۔ یا حکومت میں کوئی بڑا عہدہ عطا کر۔ یا مجھے شہرت اور دنیاوی جاہ و منزلت عطا کر۔ وغیرہ لیکن میں تیرے حق میں یہ دعا کرتا ہوں کہ خدا کرے تیری یہ آرزوئیں بدل جائیں اور تو خدا سے یہ دعا مانگا کرے کہ اے اللہ! مجھے دین کی خدمت کی توفیق عطا فرما۔ قرآن و حدیث کی اشاعت کی توفیق عطا فرما۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ میری دعا یہ ہے کہ تو اس طرح اللہ کی محبت میں فنا ہو جائے کہ اپنی تمام آرزوؤں کو اس کی مرضی کے تابع کر دے یعنی کوئی آرزو باقی نہ رہے۔ صرف یہ آرزو رہ جائے کہ اے اللہ! میں صرف تیری رضا کا طالب ہوں اور جو کچھ تو میرے لئے پسند کرے اسی کو اپنے لئے پسند کرتا ہوں یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر بندہ مومن مشیت ایزدی سے کامل ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے۔ اقبال نے اس مقام کو اپنے کلام میں کئی جگہ بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے صرف ایک شعر اس جگہ نقل کرتا ہوں۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مؤمن قضائے حق شود

یعنی جب مومن قرآن مجید کی اس آیت پر عامل ہو جاتا ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اے میرے

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ اعلان فرمادیں کہ میری نماز اور جملہ مراسم دینی (یعنی قربانی) اور میری زندگی اور میری موت (میرا جینا اور میرا مرنا) سب اللہ ہی کے لئے ہے جو پروردگار ہے سارے جہان کا۔

یعنی وہ اپنے آپ کو پورے طور سے اللہ کی مرضی کا تابع بنا دیتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی مرضی اور اللہ کی مرضی میں ایک وراء الفہم مطابقت اور یگانگت پیدا ہو جاتی ہے جس طرح اگر لوہے کو آگ میں ڈال دیں تو اس میں اور آگ میں ہم رنگی پیدا ہو جاتی اور اس ہم رنگی کی بدولت وہ خود قضائے حق بن جاتا ہے یعنی وہ وہی کرتا ہے جو خدا چاہتا ہے اور خدا وہی حکم نافذ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اسی نکتہ کو اقبال کے مرشد عارف رومیؒ نے یوں بیان کیا ہے۔

از رضائش مرضیٔ حق گم شود
ایں سخن کے باورِ مردم شود

یعنی عام لوگ اس بات پر کیسے یقین لا سکتے ہیں کہ جب مومن پہلے اپنی مرضی اللہ کی مرضی میں گم کر دیتا ہے یعنی اپنے آپ کو صِبْغَةَ اللّٰهِ یا اللہ کے رنگ میں رنگین کر لیتا ہے تو پھر مرضیٔ حق اس بندۂ مومن کی رضا میں گم ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

پنجۂ او پنجۂ حق می شود
ماہ از انگشت او شق می شود

اس کا ہاتھ بلا تمثیل اللہ کا ہاتھ ہو جاتا ہے اور اس کی انگلی میں یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے ایک اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے

ہو جاتے ہیں اگر کسی کو ان اشعار کا مطلب سمجھنے میں الجھن پیدا ہو تو وہ قرآن مجید کی اس آیت کو پڑھ لے۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ اور اے میرے محبوبؐ! جب جنگ بدر میں آپ نے زمین سے کنکریاں اٹھا کر کفار کی طرف پھینکی تھیں تو دراصل آپ نے نہیں بلکہ خود اللہ نے پھینکی تھیں۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

(٭)

۴

کیا چرخِ کجرو کیا مہر کیا ماہ
سب راہرو ہیں واماندۂ راہ
کڑکا سکندر بجلی کی مانند
تجھ کو خبر ہے اے مرگِ ناگاہ
نادر نے لوٹی دلّی کی دولت
اک ضربِ شمشیر افسانہ کوتاہ
افغان باقی! کہسار باقی
اَلْحُكْمُ لِلّٰهِ اَلْمُلْكُ لِلّٰهِ
حاجت سے مجبور مردانِ آزاد
کرتی ہے حاجت شیروں کو روباہ

محرم خودی سے جس دم ہوا فقر
تو بھی شہنشاہ میں بھی شہنشاہ
قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

۴

اس نظم میں اقبال نے یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ ملک اور حکومت یہ سب فانی ہیں یعنی آج زید دنیا کو اپنی ملک سمجھتا ہے اور اس پر حکمراں ہے کل بکر اور پرسوں خالد دراصل ملک اور حکومت دونوں اللہ کے قبضہ میں ہیں وہ جسے چاہتا ہے ملک عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک اور حکومت دونوں چھین لیتا ہے اَللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ۔ اے اللہ! ملک کے مالک تو جسے چاہتا ہے ملک عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔

پہلا شعر:۔ محراب گل کہتا ہے کہ کائنات میں غور کرو تو یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ یہاں کسی شئے کو ثبات و قرار نہیں ہے آسمان، سورج چاند، ستارے سب مسافر ہیں اور ہر دم سفر میں ہیں۔ بالفاظ دگر۔

ہر شئے مسافر ہر چیز راہی
کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

دوسرا شعر:۔ دنیا کی تاریخ پر غور کرو کیسے کیسے نامور بادشاہ گذر چکے ہیں ایک زمانہ تھا کہ مشرق سے لے کر مغرب تک انہیں کے نام کا سکّہ چلتا تھا لیکن آج صرف ان کا نام تاریخ میں باقی رہ گیا ہے مثلاً سکندر کو دیکھو یونان سے جو تسخیر ممالک کے لئے نکلا تو پنجاب تک سارے ممالک فتح کر لئے لیکن چند روزہ کی علالت کے بعد راہیِ ملک عدم ہی ہو گیا۔

تیسرا شعر:۔ نادر شاہ ایرانی کی فتوحات پر نظر کرو کہاں طہران کہاں دلّی لیکن ایک معمولی سپاہی نے اپنی تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا قصہ تمام کر دیا۔

چوتھا شعر:۔ حقیقت یہ ہے کہ سکندر اور نادر اور ان کے علاوہ بہت سے نامور سلاطین اپنی اپنی نوبت بجا کر دنیا سے چلے گئے ان میں سے کوئی بھی آج باقی نہیں ہے ہاں افغان قوم باقی ہے اور یہ قوم جس ملک میں رہتی ہے وہ بھی بدستور موجود ہے بات دراصل یہ ہے کہ یہ دنیا نہ تیری ملک ہے نہ میری۔ اَلْحُکْمُ لِلّٰہِ وَالْمُلْکُ لِلّٰہ۔ حکومت اللہ ہی کی ہے اور یہ دنیا اسی اللہ کی ملک ہے۔ ملک بھی اسی اللہ کا ہے حکومت بھی اسی اللہ کی ہے انسان اسی کے حکم سے چند روزہ کے لئے حکمراں بن جاتا ہے لیکن غلطی سے اپنے آپ کو مالک اور حکمراں سمجھ لیتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ انسان اگر اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی پر کمر بستہ ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے اپنی مادّی خواہشات

کا غلام بنتا ہے اور اس کے بعد ان کی تسکین کے لئے انسانوں کی غلامی کرتا ہے۔ خواہش سے حاجت پیدا ہوتی ہے اور حاجت انسان کو غلامی پر آمادہ کر دیتی ہے یہ حاجت وہ بری بلا ہے کہ انسان تو انسان ہے شیروں کو بھی لومڑی بنا دیتی ہے۔

آنچہ شیراں را کند روبہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

چھٹا شعر:۔ لیکن اگر انسان اپنی خواہشات کو اپنا غلام بنالے یعنی اپنی خودی سے آگاہ ہو جائے تو پھر وہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرے اور یہ شانِ استغنا اسے سلاطین کا ہم پلّہ بنا دے گی۔

ساتواں شعر:۔ یاد رکھو! قوموں کی بگڑی ہوئی تقدیر صرف وہ مرد درویش بنا سکتا ہے یعنی صرف وہ مرد مومن قوموں کو سربلندی عطا کر سکتا ہے جو کسی بادشاہ کے سامنے جا کر دست سوال دراز نہ کرے بلکہ بادشاہ اگر اسے کوئی عہدہ پیش کرے تو بھی قبول نہ کرے۔

چنانچہ بزرگانِ دین کی زندگیوں پر غور کرنے سے اس شعر کی صداقت عیاں ہو سکتی ہے مثلاً سلاطین دہلی نے ہر چند کوشش کی کہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیا دربار میں تشریف لائیں۔ لیکن حضرت خود کسی بادشاہ کے دربار میں تو کیا جاتے کسی بادشاہ کو بھی اپنے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔

سلطان قطب الدین مبارک خلجی نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ کل نظام الدین

کو دربار میں حاضر کیا جائے۔" وزیر نے آنجناب کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ اگر آپ بخوشی حاضر نہ ہوئے تو میں آپ کو گرفتار کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دوں گا آپ نے قاصد سے فرمایا کہ "دیکھا جائے گا۔ کل تو ہونے دو۔

رات کو بارہ بجے کے قریب آپ ایک خاص حالت میں خانقاہ کے صحن میں چہل قدمی فرما رہے تھے اور یہ شعر وردِ زباں تھا ؎

اے روبہک چرا نہ نشستی بجائے خویش
با شیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

یہی وقت تھا جب سلطان کے محبوب غلام خسرو نے اس بدبخت کو قتل کر کے لوگوں کے لئے سامانِ عبرت مہیا کر دیا۔

۵

یہ مدرسہ یہ کھیل یہ غوغائے رو و رو
اس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نو
وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو
ناداں! ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے
اسبابِ ہنر کے لئے لازم ہے تگ و دو

فطرت کے نوامیس پہ غالب ہے ہنرمند
شام اس کی ہے مانندِ سحر صاحبِ پرتو
وہ صاحبِ فن چاہے تو فن کی برکت سے
ٹپکے بدنِ مہر سے شبنم کی طرح ضو

۵

اس نظم میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ انگریزوں نے جو کالج اور اسکول اور یونیورسٹی ہندوستان میں قائم کئے ہیں یہ محض فریب نظر ہیں ان کا مقصد انسانوں کو زیورِ علم و عمل سے آراستہ کرنا نہیں ہے بلکہ حکومت کے دفاتر کے لئے کلرک تیار کرنا اور دل و دماغ دونوں کو مردہ کر دینا ہے تاکہ آرزو اول تو پیدا ہی نہ ہو اور اگر ہو جائے تو زندہ نہ رہ سکے میرا خیال ہے کالج ہی ایسا ماحول ہے جس میں برائی کے جراثیم پلتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ محراب گل کہتا ہے کہ اے مسلمان! آنکھیں کھول کر دیکھ! یہ کالج اور اسکول یہ ان کی شاندار عمارتیں۔ یہ وسیع کھیل کے میدان یہ مخلوط تعلیم۔ یہ انٹر کالجیٹ قسم کی سرگرمیاں۔ یہ اولمپک ٹورنامنٹ۔ یہ یہ مباحثہ کی مجلسیں یہ ٹرافیاں۔ یہ انعامات۔ یہ گاؤن (Gowns) یہ ڈگریاں بظاہر یہ باتیں بہت دل خوش کن ہیں لیکن تجھے ہر لحظہ اسلامی حمیت اور دینی غیرت سے دور کر رہی ہیں یہ ایسا عیش ہے جس سے ہر لحظہ غم میں اضافہ

ہوتا رہتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ تو سمجھتا ہے کہ قوم زیور علم سے آراستہ ہو رہی ہے لیکن یہ علم جو کالجوں کے در و دیوار سے حاصل ہوتا ہے علم نہیں ہے بلکہ مسلمان کے حق میں زہر کا حکم رکھتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ اس غیر اسلامی علم سے اس کی خودی مردہ ہو جاتی ہے اس کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے اور اس ڈگری کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلتا ہے کہ وہ نوجوان جو اپنے آباؤ اجداد کی طرح (جیسے وہ ۱۸۵۷ء میں نکلے تھے) سر سے کفن باندھ کر میدان جنگ میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھاتا۔ دفتروں میں فائلوں سے سر کھپاتا رہتا ہے تاکہ "دو میٹھی جو" ہاتھ آسکیں۔

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش

تیسرا شعر:۔ اے نادان مسلمان! انگریزوں نے مقصد حیات سے بیگانہ بنانے کے لئے تجھ کو ادبیات عالیہ اور فلسفہ کی خاردار جھاڑیوں میں الجھا دیا ہے بیشک ادب اور فلسفہ اچھی چیز ہے لیکن یہ چیزیں مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ مقصود بالعرض ہیں لہٰذا اگر تو ان علوم کو جو مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں خود مقصد بنا لے گا تو تیرا مقصد تو حاصل نہیں ہوگا لیکن انگریز کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ اے مسلمان! تیرا مقصد حیات فلسفہ نہیں ہے بلکہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ یہ ہے وہ کام جس کے لئے تجھے اللہ نے پیدا کیا ہے پس تو اپنے اندر جہاد کا جذبہ پیدا کر اور اس جذبہ کے حصول کے لئے تگ و دو

اور کوشش کر مسلمان کے لئے یہ بات فخر نہیں کہ وہ اعلیٰ درجہ کا موسیقی داں ہو۔ یا شاعر ہو۔ یا مصوّر ہو بلکہ یہ کہ وہ اعلیٰ درجہ کا مجاہد ہو۔ صف شکن ہو شہسوار ہو یعنی مرد غازی ہو۔

چوتھا شعر:۔ ہنرمند کے دو معنی ہو سکتے ہیں (ا) صاحب فن مثلاً سائنسداں یا حکیم۔ (ب) صاحب کمال مثلاً مجاہد یا غازی۔

محراب گل کہتا ہے کہ صاحبِ کمال فطرت کے قوانین پر بھی غالب آجاتا ہے مثلاً پانی کا خاصہ یہ ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے لیکن انجینئر اپنے کمال فن سے اُسے اونچائی کی طرف بہا سکتا ہے۔ الغرض کمال فن کی بدولت انسان رات کو دن بنا سکتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ اور جو شخص کسی فن میں کامل ہوتا ہے وہ حیرت انگیز کارنامے دنیا کو دکھا سکتا ہے مثلاً وہ دہلی میں بیٹھ کر لندن والوں سے گفتگو کر سکتا ہے۔

محراب گل کہنا یہ چاہتا ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں (محکوموں) کے لئے جو نصابِ تعلیم مدوّن کیا ہے اس کی غرض صرف دفتروں کے لئے کلرک تیار کرنا تھا نہ ان کے اندر تحقیق و انکشاف کی صلاحیت پیدا کرنا اس لئے اگر مسلمان ترقی کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنا نظامِ تعلیم خود مدوّن کرنا چاہئے جو اس کی ذاتی صلاحیتوں کو بیدار کر سکے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں اللہ کے لئے مرمٹنے کا جذبہ پیدا کر سکے کیونکہ مسلمان اگر مجاہد نہیں تو کچھ بھی نہیں ؎

تو سرفروش نہیں ہے اگر تو کچھ بھی نہیں

۶

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک
ہے جس کے تصوّر میں فقط بزم شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

۶

اس نظم میں اقبالؔ نے ایجاد۔ تقلید۔ تجدید۔ ان تین باتوں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ یہ دنیا کوئی ساکن یا مکمل (تکمیل یافتہ) شئے نہیں ہے بلکہ ایک متحرک اور ترقی پذیر حقیقت ہے اور کمال کی طرف حرکت کر رہی ہے۔ چنانچہ اسی خیال کو اقبال نے یوں ادا کیا ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

الغرض دنیا عالم ایجاد ہے۔ یہاں ہر لحظہ نئی نئی چیزیں عالم وجود میں آتی رہتی ہیں فطرت ہر وقت تخلیق اور ایجاد میں مصروف ہے اسی طرف قرآن حکیم اشارہ فرماتا ہے۔ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَأْنٍ یعنی اللہ ہر لحظہ اپنی قدرت کی جلوہ گری میں مصروف ہے۔ (سورہ رحمٰن ع ۲)

چونکہ اس کائنات میں حرکت۔ تخلیق اور ایجاد کا اصول کارفرما ہے اس لئے قدرتی طور پر جو شخص ان صفات سے گانہ کا مظہر ہوگا یعنی جس شخص کی ذات سے ان خوبیوں کا اظہار ہوگا وہ اس دنیا میں بنی آدم کی نظروں میں محبوب اور محترم ہوگا اور ہر زمانہ میں ہر جگہ اہل زمانہ اس کی عزت۔ اتباع اور تقلید کرتے ہیں مثلاً گلیلیو۔ کیپلر۔ نیوٹن۔ مادام کیوری۔ مارکونی وغیرہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو عالمگیر عزت حاصل ہے اور قیامت تک ان کا نام زندہ رہے گا۔

دوسرا شعر۔ پس اے مسلمان! جب یہ مسلّم ہے کہ عزت صاحب ایجاد کے لئے مخصوص ہے تو پھر تو بھی صاحب ایجاد بن۔ آخر تو غیروں کا مقلد کیوں بنا ہوا ہے؟ (تقلید اپنے اوپر حرام کرلے) پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ گذشتہ تین سو سال میں دنیا میں جس قدر ایجادات ہوئی ہیں وہ سب کی سب بلا استثناء غیر مسلموں کی مرہون منت ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے کورانہ تقلید کی بدولت اپنی خودی کو ناکارہ کر دیا۔ اے مسلمان! اپنی خودی کی حفاظت کر کیونکہ یہ تو انمول موتی ہے۔

نوٹ۔ یہاں لفظِ تقلید تشریح طلب ہے کیونکہ اس کے کم از کم

دو مختلف مفہوم ہیں۔

۱۔ پہلا مفہوم۔ تقلید۔ قلادہ سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی ہیں وہ کالر جو کسی حیوان مثلاً کتے کے گلے میں پڑا ہوا ہو۔ اس لئے تقلید کے معنی ہو گئے کسی کی اطاعت کرنا بلا چون وچرا یعنی آنکھ بند کر کے بغیر کسی دلیل کے کسی کی پیروی کرنا اور بطور خود تحقیق و اجتہاد سے بکلی محترز رہنا۔ مثلاً فلسفہ ارسطو کی تقلید کے معنی یہ ہیں کہ ارسطو نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر بلا چون وچرا ایمان رکھا جائے اور اس کی حمایت کی جائے۔

۲۔ دوسرا مفہوم۔ تقلید۔ فقہا کی اصطلاح بھی ہے اور فقہی اصطلاح میں اس سے مراد ہے بغیر کسی دلیل شرعی کے فقہی مسائل میں ائمہ اربعہ۔ امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ میں سے کسی ایک امام کی پیروی کرنا۔ چنانچہ اس کی ضد غیر مقلد ہے۔ اور غیر مقلد کے معنی یہ ہے کہ جو براہِ راست اللہ کی کتاب قرآن اور حضورؐ کی بات حدیث پر عمل کرتا ہو اور وہ ان ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کی پیروی نہیں کرتا۔

چونکہ میں اس وقت شعر کا مطلب لکھ رہا ہوں اس لئے تقلید کی ہزارہ سالہ تاریخ سے قطع نظر کرتا ہوں اور صرف تیسری نوع کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں تاکہ یہ بحث مکمل طور پر سامنے آجائے

۳۔ تیسرا مفہوم۔ تقلید کی تیسری قسم صوفیانہ تقلید ہے یعنی مرشد کے احکام کی بلا چون وچرا تعمیل کرنا چنانچہ لسان الغیب فرماتے ہیں اور بہت عمدہ کہا ہے۔

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

پہلی بات یہ واضح کرنی چاہتا ہوں کہ مطلق تقلید سے کسی انسان کو مفر نہیں ہے ہر شخص مقلد ہے یعنی نقال ہے دوسروں کا۔ یا اپنے بزرگوں کا یا اسلاف کا۔ یا آباؤ اجداد کا۔ یا سوسائٹی کا۔ یا معاشرہ کا۔ یا ماحول کا کسی نہ کسی رنگ میں۔ حد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ اعلان کرے کہ میں کسی کا مقلد نہیں ہوں یعنی میں نقال نہیں ہوں تو وہ اس حماقت کا مرتکب ہو جائے گا جسے منطق میں اجتماع ضدین کہتے ہیں بالفاظ دگر جب وہ شخص یہ الفاظ زبان پر لائے گا تو اسی وقت انہی الفاظ کی بدولت وہ اپنے قول (زعم باطل) کی تردید بھی کر دے گا۔ کیونکہ اگر وہ درحقیقت کسی کا مقلد یعنی نقال نہیں ہے تو پھر اردو کیوں بولتا ہے؟ اس بات کا اعلان کرنے کے لئے اسے اپنی زبان ایجاد کرنی لازم ہے لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو یہ اعلان بھی اُسے زیب نہیں دیتا کیونکہ اس نے یقیناً اپنے والدین اور اپنی سوسائٹی کی کورانہ تقلید کی۔ کم از کم اس زبان کے سیکھنے میں جس کے ذریعہ سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہے۔

دوسری بات وضاحت طلب یہ ہے کہ اقبال نے جہاں جہاں اپنے کلام میں تقلید کی مذمت کی ہے وہاں ان کی مراد فقہی تقلید نہیں ہے بلکہ کورانہ تقلید ہے جس کو تقلید جامد کہتے ہیں یعنی کسی فلسفیانہ اسکول یا اپنے خاندان یا ماحول یا آباؤ اجداد یا کسی امام یا پیر و ولی یا کسی قوم کے رسوم

لباس یا عقائد اور خیالات کی تقلید بلا شبہ فقہی تقلید سے تو عامۃ المسلمین کو کسی طرح قرآن وحدیث کے ہوتے ہوئے ضروری نہیں ہے جو مقلد ہیں وہ لوگوں کے اقوال پر بغیر شرعی دلیل کے عمل کرتے ہیں جو بالکل درست نہیں ہے کیونکہ فقہی مسائل میں تحقیق کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہو سکتا جو لوگ جو لوگ ائمہ فقہ کی تقلید نہیں کرتے وہ مقلد نہیں کہلاتے بلکہ متبع کہا جاتا ہے یعنی اگر وہ امام ابو حنیفہ کی تقلید نہیں کرتے وہ بھی متبع ہیں یعنی اگر وہ امام ابو حنیفہ کی اتباع نہیں کرتے تو وہ امام بخاریؒ و امام مسلمؒ کی اتباع کرتے ہیں اور جو لوگ نہ ائمہ فقہ کے مقلد ہیں اور نہ ائمہ محدثین کے متبع ہیں وہ ان ائمہ کے علاوہ کسی اور کے مقلد ہیں جس کی وجہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ عقلاً ناممکن ہے کہ ہر شخص مجتہد بن جائے ٹھیک جس طرح یہ ناممکن ہے کہ دنیا میں ہر شخص انجینئر یا ڈاکٹر بن جائے یا شاعر یا مصور بن جائے۔

علاوہ بریں اقبال مسلمانوں کو ترک تقلید بمعنی فقہی تقلید کا مشورہ بھی نہیں دے سکتے تھے کیونکہ وہ ساری عمر دینی مسائل میں رسول ﷺ کی اتباع کرتے رہے پس جو شخص متبع رسول ﷺ ہو وہ دوسروں کو ترک تقلید کی تلقین کیوں نہیں کر سکتا ہے۔

اب رہی تقلید کی تیسری قسم یعنی مرشد کی تقلید تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کسی جسمانی مرض میں مبتلا ہوں اور اس کے ازالہ کے لئے کسی طبیب کی تقلید کریں یعنی جو طریقہ علاج وہ آپ کے لئے تجویز کرے اس پر بلا چون و چرا عمل کریں۔

واضح ہو کہ مرشد بھی طبیب ہی ہوتا ہے جو آپ کے قلبی امراض کا ازالہ کرتا ہے اور اس کی تقلید کا مطلب بھی یہی ہے کہ جو نسخہ وہ آپ کے لئے تجویز کرے اس پر بلا چون وچرا عمل کریں۔

ہاں یہ آپ کو اختیار ہے کہ طبیب کے انتخاب میں آپ کسی کی تقلید نہ کریں بلکہ اپنی عقل سے کام لیں اور خوب غور وفکر اور تحقیق کے بعد کسی کو اپنا معالج منتخب کریں اور یہ وہ مشورہ ہے جو دنیائے اسلام کے نامور طبیب روحانی یعنی مولانا رومؒ نے فرمایا ہے۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

پس بہ ہر دستے نباید داد دست

یعنی دنیا بہت سے ابلیس انسانوں کی شکل میں موجود ہیں اس لئے روحانی مریض کو بلا تحقیق ہر مدعی اصلاح کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدینا مناسب نہیں ہے۔

پس خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فقہی تقلید بھی ضروری ہے اور شیخ (مرشد) کی تقلید بھی ضروری ہے یہ صرف شارح کا خیال ہے لیکن اقبال نے تقلید کی ان دونوں قسموں کی ضرورت سے نیز اس شعر میں سخت انکار کیا ہے اور بار بار پڑھا سکتے ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی مریض کسی طبیب کی تقلید کرنا نہیں چاہتا تو وہ پہلے علم طب حاصل کرے پھر خود تشخیص اور تجویز کر سکتا ہے اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے دیوانی یا فوجداری مقدمہ میں کسی وکیل کی

تقلید کرنا پسند نہیں کرتا تو وہ پہلے خود قانون کا امتحان پاس کرے اس کے بعد خود اپنے مقدمہ کی پیروی کر سکتا ہے لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ خود وکیل کسی مقدمہ میں ماخود ہو جائے یا کوئی طبیب خود بیمار ہو جائے تو وہ وکیل دوسرا وکیل مقرر کرتا ہے یا وہ طبیب دوسرے طبیب سے رجوع کرتا ہے اور اگر ہر شخص کے لئے طب یا قانون پڑھنا ممکن نہیں تو پھر تقلید سے بھی مفر نہیں اس پر آپ فقہی تقلید یا شیخ کی تقلید کو قیاس نہیں کر سکتے۔

اقبال نے جس تقلید کی مذمت کی وہ تینوں قسم کی تقلید ہے اب میں خود انہیں کے اشعار سے اپنے دعوے پر دلیل پیش کرتا ہوں۔

واضح ہو کہ اقبال نے اپنے کلام میں تقلید کی مذمت بھی کی ہے اور تحسین بھی کی ہے اس تضاد کو رفع کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ وہی جو میں نے اوپر بیان کی ہے ایک جگہ تقلید کی مذمت میں لکھتے ہیں

اگر تقلید بودے شیوۂ نیک
پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

یہاں ہر اس تقلید کی مذمت کی جا رہی ہے خواہ فقہی تقلید ہو یا کورانہ جامد تقلید جس کی تفصیل اوپر مذکور ہو چکی ہے کہ اپنے بزرگوں کے طریقوں کی بلا سوچے سمجھے آنکھ بند کرے پیروی کی جائے۔ دوسری جگہ وہ اقتدا و اتباع کی تحسین کرتے ہیں نہ تقلید کی۔

نہ اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

یعنی موجودہ دور کے کوتاہ عقل علماء کے اجتہادات پر اور سلف صالحین یا ائمہ فقہ کی تقلید پر عمل کرنے کو زیادہ مناسب قرآن مجید کے احکام اور پیغمبر خدا کے فرامین کی اقتداء و اتباع ضروری و فرض ہے۔

مسلمانوں کو جس تقلید نے نقصان پہنچایا ہے۔ اقبال نے جس تقلید کی مذمت کی وہ ائمہ کی فقہی تقلید ہی تو ہے جس کو کورانہ تقلید کہتے ہیں اور اسی طرح آباء و اجداد کی تقلید یا نئے پرانے رسم و رواج کی تقلید یا مراسم خاندانی کی تقلید یا دنیاوی علوم میں متقدمین و متاخرین علما اور حکما کی تقلید مثلاً ملا نظام الدین سہالوی نے ڈھائی سو سال ہوئے عربی مدارس کے لئے ایک نصاب تعلیم مدوّن کیا تھا جو اس زمانہ کے لئے بالکل مناسب تھا لیکن ہمارے مسلمان علماء ابھی تک اسی نصاب کو پڑھ رہے ہیں اور اس میں تبدیلی کرنے کو "گناہ کبیرہ" سمجھتے ہیں۔

ہمارے زمانے میں مولانا شبلی نعمانی نے سب سے پہلے اس کورانہ تقلید کے خلاف آواز اٹھائی اور لکھنؤ میں ایک مدرسہ موسومہ ندوۃ العلما قائم کیا جس میں عربی اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔

الغرض اقبال کا مطلب یہ ہے کہ تو ہر قسم کی کورانہ تقلید سے اپنی خودی کو ناکارہ مت کر۔ تمدن۔ معاشرت۔ معیشت۔ سائنس۔ فلسفہ و معاشیات اور دیگر علوم و فنون میں اپنی عقل خداداد سے کام لے اور جس طرح مغربی اقوام دن و رات تحقیق اور تجربہ میں مشغول ہیں تو بھی ان میں

منہمک ہو کر اپنی خودی کی قوتوں کو بیدار کر اور ترقی کے میدان میں مغربی اقوام کے دوش بدوش کام کر اور اپنے لئے زندہ قوموں میں جگہ حاصل کر۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا تھا۔ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ۔ یعنی اپنے دنیاوی معاملات کو تم خود بہتر سمجھتے ہو تو اس میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تم دین کے مسائل میں بیشک میری اتباع کرو کیونکہ یہی خدائی حکم ہے ومن یطع الرَّسُوْلَ فقد اَطَاعَ اللّٰہ۔ لیکن زراعت۔ تجارت۔ آہنگری۔ خیاطی اور دوسرے تمام دنیاوی معاملات میں اپنی عقل سے کام لے سکتے ہو۔

آؤ ہم تقلید کے باطل ہونے کی ایک مثال اور پیش کرتے ہیں کہ ایک نمازی اپنے امام کے پیچھے اس کی اقتدار میں نماز ادا کر رہا ہے۔ حاجی اپنے قافلے کے ساتھ راہ بتانے والے کے پیچھے چلا جا رہا ہے لیکن نمازی اور حاجی دونوں کا ایمان ہے کہ حج اور نماز فریضۂ خدا ہے جس کے ادا کرنے کا پابند میں بھی ہوں اور میرا یہ امام بھی اور یہ راہ بتانے والا بھی اسی فریضے کا پابند ہے پس اس کی نماز اور حج تقلیداً نہیں ہے بلکہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت میں اور اس دلیل کے مان لینے میں ہے جو وہ جانتا ہے پس تقلید ائمہ کا بطلان ظاہر ہے جس کو اقبال نے اپنے شعر میں کہا ہے کہ تقلید حرام ہے اور اتباع فرض ہے پھر یہ بھی سمجھو کہ ایک بہت بڑا عالم ایک بالکل کم درجے کے شخص کے پیچھے بھی نماز پڑھ سکتا ہے بلکہ ایک مجتہد ایک عامی کے پیچھے بھی اقتدا کر کے نماز بجا لا سکتا

ہے اب تم بتاؤ کہ جب اقتداء نماز اور تقلید ایک ہی چیز ہے تو کیا مجتہد
ایک جاہل کی تقلید بھی کر سکتا ہے؟ راہ بتانے والے عموماً دیہاتی گنوار محض
بے علم ہوتے ہیں تو کیا حج کے راستے دکھانے میں انہیں آگے کر لینا اس بات
کی بھی دلیل بن سکتا ہے؟ کہ امورِ دین حلال و حرام کے مسائل میں بھی اس
کی بات بطورِ تقلید حجت شرعی مانی جائے؟ غور کرو رسول اللہ صلے اللہ علیہ
وسلم نے فرض ہجرت کے بجالانے کے وقت مدینہ شریف کا راستہ بتانے کے لئے
ایک شخص کی خدمت اجرت پر حاصل کی تو کیا تمہارے نزدیک حضور صلی اللہ
علیہ وسلم اس کے مقلد ہوئے؟ حضورؐ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ
کے پیچھے ان کی اقتدا میں نمازِ فرض ادا کی تو کیا آپ ان کے مقلد ہو گئے؟ عالم
اپنے جیسے کے پیچھے اپنے سے کم درجے والے کے پیچھے بلکہ بالکل بے علم شخص کے
پیچھے بھی نماز پڑھ سکتا ہے تو کیا اسی طرح تقلید بھی کر سکتا ہے؟ پس معلوم ہوا
کہ امامت اور سرداری کو تقلید سے کوئی تعلق نہیں۔ اور آپ یوں سمجھیں کہ
مقتدی برابر ہر ہر چھوٹے بڑے رکن میں اپنے امام کی اقتداء کرتا ہے حاجی
برابر ہر گلی کوچہ ہر دائیں بائیں میں اپنے رہبر کی مانتا ہے لیکن تم عجب مقلد ہو
کہ اصلی اصول میں اپنے امام کی نہیں مانتے۔ امام کی تو ساری عمر تلاشِ دلیل میں
اتباعِ دلیل میں گذری اور مقلد کی ساری عمر بے دلیلی میں اور اندھے پنی
میں گذرتی ہے امام قرآن و حدیث کو سب پر مقدم کرتا رہا مقلد اس امام کے
قول کو قرآن و حدیث پر مقدم کرتے ہیں امام تو ہر اختلاف کا فیصلہ وحی خدا
سے کرنا فرض جانتا ہے اور مقلد ہر اختلاف کو امام کے قول سے فیصلہ کرنے

بیٹھتا ہے۔ لہذا علامہ اقبال نے تقلید ائمہ کو بھی حرام کہا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر قسم کی تقلید حرام ہے۔ امید ہے کہ اس تفصل سے ناظرین اقبال کے مفہوم کو بخوبی سمجھ سکیں گے۔

تیسرا شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے تجدید کا لفظ استعمال کیا ہے اس کی بھی قدرے تشریح ضروری ہے۔ واضح ہو کہ تجدید اور اجتہاد میں فرق ہے اجتہاد تقلید کی ضد ہے یعنی کسی مسئلہ میں اپنی عقل سے کام لے کر استخراج یا استنباط کرنا مثلاً قرآن مجید میں شراب کو حرام قرار دیا گیا ہے لیکن چرس۔ افیون۔ گانجہ یا بھنگ کا ذکر نہیں ہے اب ایک شخص یہ دریافت کرتا ہے کہ چرس پینا جائز ہے یا نہیں؟ تو مجتہد قرآن کی نص میں مناط حکم تلاش کرتا ہے اور ذاتی غور و فکر سے جسے قرآن نے "تدبّر" سے تعبیر کیا ہے یہ معلوم کرتا ہے کہ شراب کی حرمت کا سبب نشہ ہے پس وہ ایک کلیہ بناتا ہے کہ "کُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ" یعنی ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور چونکہ چرس یا بھنگ بھی نشہ لاتی ہے اس لئے یہ بھی حرام ہے اس استنباط کو اجتہاد کہتے ہیں۔

تجدید کے لغوی معنی ہیں نیا کرنا یعنی کسی چیز کو اس کی اصلی اور حقیقی شکل عطا کرنا لیکن اصطلاح میں تجدید کہتے ہیں دین اسلام کو ان غلط خیالات رسوم عقائد اور افکار سے پاک کر کے جو مسلمانوں کی غلطی یا جہالت سے دین میں داخل ہو گئے ہیں دوبارہ اس کی حقیقی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرنا اور جو ایسا کرتا ہے اسے "مجدد" کہتے ہیں۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ جو قوم دنیاوی لذتوں میں منہمک ہو کر آخرت سے بیگانہ ہو گئی ہو بیشک اس کے لئے یعنی اس کے خیالات کی اصلاح کے لئے مجدّد کا وجود بہت ضروری ہے۔

چوتھا شعر:۔ لیکن مشرقی ممالک مثلاً ترکی۔ ایران۔ افغانستان ہندوستان میں جو "تجدید" کا شور برپا ہے اس کی تہ میں خلوص کارفرما نظر نہیں آتا یعنی ان ملکوں میں جو مجدد پیدا ہو رہے ہیں ان کا مقصد نیک نہیں (کیونکہ وہ اس منصب کی اہلیت نہیں رکھتے) ان لوگوں کی تجاویز کے جو کارنامے سامنے آ رہے ہیں ان کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہوں کہ تقلید یعنی غلامی کا سبق دے رہے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ

(۱) ترکی میں مصطفےٰ کمال نے تجدید دین کا علم بلند کیا لیکن چونکہ وہ دین اسلام کی حقیقت سے بیگانہ تھا۔ لہٰذا اس نے ترکوں میں (اسلامی رنگ پیدا کرنے کے بجائے مغربی رنگ پیدا کر دیا مثلاً عربی کی جگہ لاطینی رسم الخط کو رائج کر دیا۔ ترکی لباس کی جگہ فرنگی لباس رائج کر دیا۔ پردہ کی جگہ عریانی کو فیشن بنا دیا۔ انتہا یہ ہے کہ اسلامی آئین کی جگہ ضالط مولس ( ) نافذ کر دیا۔ اب اہل نظر خود انصاف کر سکتے ہیں کہ یہ تجدید ہوئی یا تخریب؟ مسلمان آزاد ہوئے یا اور بھی غلام ہو گئے۔

(۲) یہی کارنامہ ایران میں رضا شاہ پہلوی نے انجام دیا۔

(۳) اسی قسم کی "اصلاح" امان اللہ خان نے افغانستان میں کی۔

(۳) ہندوستان میں ایک مجدّدِ اعظم، پیدا ہوا جس نے صاف لفظوں میں مسلمانوں کو اپنی (تقلید) غلامی میں رکھ کر اس بات کی تلقین کرتا رہا کہ

اے دوستو جہاد کا اب چھوڑ دو خیال!
دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام "مجدّدین" اس دین کی حقیقت سے بیگانہ تھے جس کی تجدید کا فرض انہوں نے انجام دیا۔ نتیجہ اس "کارِ خیر" کا جو نکلا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے یعنی ان قوموں کی غلامی کی زنجیریں اور بھی مضبوط ہو گئیں۔

۷

رومی بدلے شامی بدلے، بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزندِ کہستاں اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان
موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریائے
جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ
اس بندے کی دہقانی پہ سلطانی قربان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج
عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

۷

اس نظم میں اقبال نے افغانوں کو انقلاب کا پیغام دیا ہے افغانستان کے باشندوں سے تو میں واقف نہیں ہوں لیکن سرحد یعنی آزاد علاقہ کے افغانوں کی ذہنیت سے قدرے آگاہی ضرور حاصل ہے اور میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ان لوگوں میں وہ جوہر ضرور موجود ہے جس

کی صحیح ترتیب اگر ہو جائے تو یہ لوگ انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔

(۱) ان لوگوں میں دینی حمیت اور غیرت نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے

(۲) ان لوگوں میں جہاد کا جذبہ بھی نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے۔

(۳) ان لوگوں کو انگریز اور انگریزیت دونوں سے شدید نفرت ہے۔

(۴) یہ لوگ فطرتاً بہادر بھی ہیں اور جفاکش بھی۔

اقبال مجھ سے بدرجہا زیادہ ان لوگوں کی ان خصوصیات سے آگاہ تھے اس لئے انہوں نے اس نظم میں براہ راست انہیں مخاطب کیا ہے۔

پہلا بند :۔ اے سرحد کے مسلمان! اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نظر کر کے دیکھ تو سہی ہر طرف انقلاب برپا ہے۔ ترکی میں انقلاب رونما ہو گیا اور شام میں بھی بڑی تبدیلی ظاہر ہو گئی ہے۔ اور یہی حال ہندوستان کا ہے اے سرحد کے غیور پٹھان! اللہ نے تیرے اندر بڑی بڑی صلاحیتیں ودیعت فرما دی ہیں۔ تیرا فرض یہ ہے کہ تو ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر دنیا میں اسلام کو سربلند کرے۔

"اپنی خودی پہچان"، کا مطلب اقبال کی اصطلاح میں یہ ہے کہ اے غافل افغان! اسلامی خطوط پر اپنی خودی کی تربیت کر۔ تاکہ تو ایشیا میں تمام قوموں کا سردار بن جائے۔

علامہ مرحوم نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا کہ "اگر سرحد کے پٹھانوں میں کوئی شخص صحیح اسلامی شعور پیدا کر دے تو یہ لوگ اسلام کو دوبارہ سربلند کر سکتے ہیں ساری دشواری یہ ہے کہ انہیں اپنی طاقتوں کا علم ہی نہیں ہے۔

دوسرا بند:۔ اے سرحد کے غیور مسلمانوں! اللہ نے تمہیں جسمانی طاقت بھی عطا فرمائی ہے حوصلہ بھی عطا کیا ہے اور جنگ وجدال کا شوق بھی پس اگر تم اسلام (کھیت) کی آبیاری نہ کرو تو پھر تمہاری مسلمانی کس کام کی؟ اور اسلام کو تم سے کیا فائدہ پہنچا۔

تیسرا بند:۔ تم تو سمندر ہو؟ پھر کیا سبب کہ کفار کے مقابلہ میں تمہاری تلواریں علم نہیں ہوتیں؟ تم کفر کے خلاف صف آرا کیوں نہیں ہوتے تم تو طوفان ہو۔ پھر کیا سبب ہے کہ کفر تمہارے سامنے ابھی تک قائم ہے؟ کہیں طوفان کے سامنے خس وخاشاک قائم رہ سکتا ہے۔

چوتھا بند:۔ یاد رکھو! حقیقی عظمت اور سربلندی یہ ہے کہ انسان بادشاہوں کے دربار میں جاکر ضمیر فروشی کے بجائے اپنی قوتِ بازو سے اپنا رزق پیدا کرے یا اس سلطان سے وہ دہقان بدرجہا بہتر ہے جو اپنی خودی سے غافل ہے اس سلطان سے وہ فقیر بہتر ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے اپنی خودی کو کامل کرلیا ہے۔

پانچواں بند:۔ اے سرحد کے مسلمان! یہ سچ ہے کہ تیرے علاقہ میں علم وحکمت کا چرچا نہیں ہے اور تو بھی عالم نہیں ہے لیکن یہ تیری بے علمی ہندوستان کے اکثر علماء کے علم وفضل سے بہتر ہے کیونکہ آج وہ زمانہ ہے کہ

عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان

نوٹ:۔ اس مصرع میں اشارہ ہے ان علماء کی طرف جنہوں نے محض روپے کی خاطر انگریزوں کے ناپاک مقاصد کی تائید کی اور مسلمان ہوکر

اسلام سے غدّاری کی مثالیں تو سیکڑوں ہیں صرف ایک واقعہ لکھتا ہوں جب ۱۹۴۳ء انگریزوں نے ایران پر قبضہ کیا تھا تو ان فرزندان ابلیس کے طرزِ عمل کو اہل ایران کے حق میں مفید ثابت کرنے کے لئے پنجاب سے کئی "مولوی" ایران گئے تھے اور جس ضمیر فروش نے ان کے اخراجات برداشت کئے تھے اس کو نواب کا طوق لعنت مرحمت ہوا تھا۔

(٭)

۸

زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پَر
شپرَک کہتی ہے تجھ کو کورچشم و بے ہنر
لیکن اے شہباز یہ مرغانِ صحرا کے اچھوت
ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر
ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام
روح ہے جس کی دمِ پرواز سر تا پا نظر

(٭)

۸

اس چھوٹی سی نظم میں اقبال نے اپنے محبوب شکاری پرند شہباز (Falcon) کی دو سب سے بڑی خوبیاں بیان کی ہیں۔ پرواز اور نظر اور

جن لوگوں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ اقبال یہی دو خوبیاں اپنی قوم کے نوجوانوں میں دیکھنی چاہتے تھے۔ انہیں دو خوبیوں کو انہوں نے یہ تبدیل الفاظ اس مصرع میں بیان کیا ہے۔

چیتے کا جگر چاہیئے شاہیں کا تجسّس

یعنی قوم نے نوجوانوں کو اپنے اندر یہ دو صفات پیدا کرنی لازم ہے۔

(۱) پرواز۔ جسمانی طاقت۔ ہمت۔ حوصلہ اور شجاعت پر موقوف ہے اسی کو اقبال نے چیتے کے جگر سے تعبیر کیا ہے۔

(۲) نظر اور تجسّس کا باہمی رشتہ بالکل واضح ہے شکار کی تلاش صرف نظر پر موقوف ہے چیتا یا باز اگر اندھا ہو جائے تو اس کی زندگی بالکل بیکار ہو جائے گی۔

اقبال کو شاہین اور باز سے جو اس قدر محبت تھی اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ یہ پرند ان صفات کے مظہر ہیں جو اقبال کو بیحد محبوب تھیں کیا مجھے اپنی قوم کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اسلام۔ مومن کے اندر پرواز اور نظر ہی تو پیدا کر دیتا ہے تاکہ وہ کائنات کو مسخر کر کے اس میں حکم حق جاری کر سکے اگر غور سے دیکھا جائے تو باز اور مومن کی زندگی میں بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔

۱۔ باز تمام پرندوں کا بادشاہ ہوتا ہے مومن تمام انسانوں پر حکمران ہوتا ہے

۲۔ باز کبھی پستی یا نشیب میں قیام نہیں کرتا۔ مومن بھی کبھی پستی یا ذلت میں زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ چنانچہ سلطان ٹیپو شہید کی زندگی اس اصول پر شاہد ہے۔

۳۔ باز آشیانہ نہیں بناتا۔ مومن بھی دنیا سے دل نہیں لگاتا۔
۴۔ باز مردار نہیں کھاتا۔ مومن بھی حرام چیز کو نہیں چھوتا۔
۵۔ باز کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے مومن بھی نورِ ایمان کی بدولت ان چیزوں کو دیکھ سکتا ہے جو کافر کی نگاہ سے پوشیدہ رہتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اکثر اپنی نظموں میں باز اور شاہین کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی صفات کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر پرواز اور نظر کی بدولت شہباز اور شاہین تمام پرندوں کے سردار بن سکتے ہیں تو یہ صفات قوم کے نوجوان کو بھی دنیا میں سروری عطا کر سکتی ہیں۔

محرابِ گل۔ شہباز سے کہتا ہے۔

پہلا شعر:۔ کوّا۔ جو خود بدصورت ہے۔ اپنی ظاہر بینی کی وجہ سے تیرے پروں کو بدنما کہتا ہے اور چمگادڑ جو خود روشنی کی تاب نہیں لا سکتی اور دن کی اندھی ہوتی ہے تجھ کو کور چشمی کا طعنہ دیتی ہے اور کہتی ہے کہ تو بے ہنر ہے۔

۱۔ واضح ہو کہ باز کے پر دیکھنے میں دلکش نہیں ہوتے عموماً خاکی یا مٹیالے رنگ کے ہوتے ہیں چونکہ کوا حقیقت بیں نہیں ہوتا اس لئے حقیقت بیں نہیں ہو سکتا کہ وہ باز کے پروں پر اعتراض کرتا ہے۔ یہاں چونکہ پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ باز کے پروں کی خوبی کا انحصار طاؤس کے پروں کی طرح مختلف رنگوں کی آمیزش پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کا حسن و جمال اس طاقتِ پرواز پر مبنی ہوتا ہے جو اس کے بازو میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

((میں نے باز کے بازوؤں کی طاقت کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے ایک دفعہ جبکہ ہم حسب معمول شام کے وقت شکار میں مصروف تھے ہمارے باز کا شکار کاٹھیا واڑی مرچوں کے کھیت میں چھپ گیا۔ یہاں کی مرچوں کے پودے کمر کے برابر ہوتے ہیں باز اپنی معمولی سرعت کے ساتھ اس کے تعاقب میں آیا اور جب بائیں طرف کو مڑ کر کھیت میں داخل ہوا تو اس کا بازو ایک مرچ کے پودے سے ٹکرایا۔ باز تو بندوق کی گولی کی طرح گذر گیا لیکن پودے کا بالائی حصّہ دو فٹ سے زیادہ اس طرح تنہ سے جدا ہو کر گر پڑا جیسے کسی نے چھری سے کاٹ دیا ہو۔))

اسی طرح مومن کا حال ہے ظاہر پرست دنیا کے ظاہر بیں لوگ مرد مومن کو اس کے معمولی کھدر کے لباس کی بنا پر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، (جب قادسیہ کی جنگ سے پہلے اسلامی فوج کا ایک سپاہی جو معمولی لباس میں تھا۔ رستم سپہ سالار ایران کے خیمہ میں داخل ہوا تو اس کے معمولی لباس کی وجہ سے ایرانی افسران فوج نے اس مرد مومن کو حقارت کی نظر سے دیکھا تھا وہ اس کے بازو کی طاقت کو نہ دیکھ سکے جس نے کسریٰ کی حکومت کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔) حالانکہ اس کا حسن اس کی سیرت روحانی طاقت میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

۲۔ چمگادڑ کی آنکھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ اُسے دن میں کچھ نظر نہیں آتا اسی لئے شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرّہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

۳۔ اقبال نے باز پر اعتراض کرنے کے لئے کوّے اور چمگادڑ کو منتخب

کیا ہے اس میں نکتہ یہ ہے کہ یہ دونوں خود حقیر اور ذلیل اور مجموعۂ عیوب ہوتے ہیں یعنی باز پر وہی اعتراض کرتا ہے جو خود کوتاہ بیں اور بدصورت ہوتا ہے۔

۴۔ ان پرندوں نے باز میں جو دو عیب نکالے ہیں وہی دراصل اس کی دو سب سے بڑی خوبیاں ہیں لیکن کوّا اور چمگادڑ چونکہ پست فطرت اور کور چشم۔ کور ذوق ہیں اس لئے ذوق حسن و زیبائی سے یکسر محروم ہیں۔

اسی طرح مردِ مومن پر وہی شخص زبانِ طعن دراز کرتا ہے جو خود پست فطرت اور کور ذوق ہوتا ہے اور انہیں باتوں پر اعتراض کرتا ہے جو درحقیقت مومن یا انسانیت کے لئے سرمایۂ افتخار ہوتی ہیں۔ مثلاً مومن کا ظاہر اور باطن دونوں یکساں ہوتے ہیں لیکن یہی خلوص اور صداقت آج مہذب دنیا میں سب سے بڑا عیب ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں عقلمند وہ ہے جو انتہائی عیّار۔ مکّار۔ منافق اور زمانہ ساز ہو۔ ان صفات کو موجودہ سیاسی اصطلاح میں ڈپلومیسی یعنی انگریزی میں (Diplomacy) کہتے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ لیکن اے شہباز! تو ان بیوقوفوں کے اعتراضات سے غمگین یا کبیدہ خاطر نہ ہونا کیونکہ یہ دونوں (کوّا اور چمگادڑ) صحرا کے پرندوں میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو ہندو سماج میں اچھوتوں کو حاصل ہے یہ وہ کوتاہ بیں اور تنگ نظر ہیں جو فضائے نیلگوں کی وسعت کا تصور نہیں کر سکتا اسی طرح کوا۔ جس طرح کوئیں کا مینڈک سمندر کی وسعت کا تصور نہیں کر سکتا اسی طرح کوّا جس کی دوڑ درخت سے منڈیر اور منڈیر سے صحن مکان تک ہے

یا چمگادڑ جو دن بھر غاروں میں چھپا رہتا ہے اس مسافت کا تصور نہیں کر سکتے جو شکار کی تلاش میں ہر دن تجھ کو طے کرنی پڑتی ہے۔

تیسرا شعر:۔ ان بیچاروں کو اس طائر کے احوال اور مقامات کا کیسے علم ہو سکتا ہے جو بحالتِ پرواز شکار کی تلاش میں سراپا نگاہ اور سراسر نظر (تجسّس کی انتہا کا اظہار مقصود ہے) بن جاتا ہے۔

نوٹ:۔ احوال اور مقامات۔ تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔

۱۔ حال سے وہ کیفیت مراد ہے جو قوت ارادی کے استعمال سے مومن کی روح میں پختگی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے مثلاً ایک مسلمان عموماً ہر روز نماز پڑھتا ہے لیکن کسی دن ناغہ بھی کر دیتا ہے تو تصوف کی اصطلاح میں وہ نمازی نہیں ہے۔ یا ایک آدمی عموماً سچ بولتا ہے لیکن کبھی کبھی جھوٹ بھی بول دیتا ہے تو وہ راست گو نہیں ہے کیونکہ نماز اور راست گوئی ان کے لئے ابھی تک حال، نہیں بن سکی۔

۲۔ مقام سے مراد وہ روحانی مرتبہ ہے جو مومن اپنی ہمت اور اپنے اختیار کو کام میں لا کر اتباعِ شریعت کی بدولت حاصل کرتا ہے۔

واضح ہو کہ اسلامی تصوف میں ہمت (Will Power) اور اختیار (Perception) ان دو قوتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ناظرین شاید حیران ہوں گے کہ اسلامی تصوف کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو پست ہمتی اور بے عملی کا درس دیتا ہے حالانکہ اس کی بنیاد ہی ہمت اور اختیار پر ہے۔ اسلامی تصوف کا نقطۂ آغاز ہی یہ دو اصول موضوعہ

(Postulates) ہیں کہ۔

۱۔ ہر انسان اپنی قوت ارادی کو ترقی دے سکتا ہے اور اپنے ارادہ کی بدولت تا ممکن کو ممکن کر سکتا ہے۔

۲۔ ہر انسان کو ترقی کرنے اور مقام خلافت تک پہنچنے کی آزادی حاصل ہے وہ مجبور نہیں ہے بلکہ اس معاملہ میں مختار ہے یعنی اگر وہ ہمت سے کام لے تو مرتبۂ خلافتِ الٰہیہ حاصل کر سکتا ہے۔

دراصل اسلامی تصوف پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ جاہل مسلمان صوفیوں کی غیر اسلامی زندگی اور تعلیمات کی بنا، پر وارد ہوتے ہیں۔

نوٹ:۔ آخری مصرع میں اقبال نے باز کی دو خوبیاں کی ہیں۔ پرواز اور نظر یعنی کوّے اور چمگادڑ کی تردید کی ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں ان کی جہالت اور حماقت پر مبنی ہے۔

۱۔ بظاہر باز کے پر خوشنما نہیں ہوتے لیکن ان کی خوشنمائی دمِ پرواز ظاہر ہوتی ہے باز کے پروں کی خوشنمائی طاقت پر مبنی ہے اسی طرح مومن کا حسن اس کی قوت بازو پر موقوف ہے۔

۲۔ بظاہر باز کی آنکھ دلکش نہیں ہوتی (جیسے چشمِ غزال دلکش ہوتی ہے) لیکن جب وہ فضائے آسمانی میں شکار کی تلاش کے وقت پرواز کرتا ہے تو اس وقت اس کی آنکھ میں بلا کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

اسی طرح جس وقت مومن کفن باندھ کر میدان جہاد میں نکلتا ہے تو اس کی پوری شخصیت نظر بن جاتی ہے یعنی اس وقت اس کی روح صرف ایک نقطہ

پر مرکوز ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں تک کفر کے آثار نظر آئیں انہیں مٹا دے وہ سراپا نگاہ بن جاتا ہے تاکہ اسلام کے دشمنوں کو خواہ وہ غار میں پوشیدہ ہوں یا دوستی کی نقاب اوڑھے ہوئے ہوں یا منافقت کے لباس میں ملبوس ہوں غرضکہ جہاں بھی ہوں۔ دیکھ سکے۔ پہچان سکے اور قتل کر سکے مجھے اعتراف ہے کہ اس تشریح کے باوجود میں اس مصرع کا مفہوم واضح نہ کر سکا۔

ع روح ہے جس کی دمِ پروانہ سر تا پا نظر

نوٹ:۔ اقبال نے اس نظم کے پردہ میں مسلمان قوم کے نوجوانوں کو شہبازی کا طریقہ سکھایا ہے چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں۔

ع کہ میں نے فاش کر ڈالا طریقہ شاہبازی کا

میری ایمانداری کے ساتھ یہ رائے ہے کہ اقبال نے تو اپنا فرض ادا کر دیا کہ مذہب شہبازی کے اصول مدوّن کر دیئے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایسے ادارے قائم کریں کہ جہاں مسلمان نوجوانوں کو شاہین اور شہباز کے مسلک پر گامزن ہونے کی تلقین کی جا سکے یعنی شاہینی اصولوں پر ان کی تربیت ہو سکے اصلی چیز تربیت ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں کامل تیرہ سال تک قوم کی تربیت ہی تو کی تھی جس کی بدولت مٹھی بھر مسلمانوں نے قلیل عرصہ میں قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا اور ایک نئی دنیا پیدا کر دی۔

اگر آج مسلمان نوجوان لڑکے قیس اور فرہاد کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور نوجوان مسلمان لڑکیاں شکنتلا بن کر ناظرین سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہیں۔ بالفاظ دگر دونوں اپنی متاع عزیز کو برباد کر رہے ہیں تو اس کی

ذمہ داری ان ناتجربہ کار نوجوانوں پر نہیں ہے بلکہ ان بڑے بوڑھوں پر ہے جو انہیں اس قسم کی اعلیٰ تعلیم دلوا رہے ہیں۔

۹

عشق طینت میں فرومایہ نہیں مثلِ ہوس
پرِ شہباز سے ممکن نہیں پروازِ مگس
یوں بھی دستورِ گلستاں کو بدل سکتے ہیں
کہ نشیمن ہو عنادل پہ گراں مثلِ قفس
سفر آمادہ نہیں منتظرِ بانگِ رحیل
ہے کہاں قافلۂ موجِ گہر پروائے جرس
گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے! مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس
پرورشِ دل کی اگر مدِّ نظر ہے تجھ کو
مردِ مومن کی نگاہِ غلط انداز ہے بس

۹

اس غزل میں اقبال نے بعض حقائق و معارف شعر کے دلکش لباس میں

پیش کئے ہیں. فرماتے ہیں کہ

پہلا شعر:- عشق. اقبالؔ کے یہاں رومی کی طرح عشق سے عشقِ حقیقی ہی مراد ہے اپنی سرشت (Nature) کے لحاظ سے عاشق کو بلندی اور پاکیزگی کی طرف لے جاتا ہے۔

واضح ہو کہ مرشدی رومی نے عشق کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک وہ جو مادی اشیاء سے ہوتا ہے خواہ وہ عورت ہو یا دولت ہو یا زمین ہو۔ یہ عشق عشق حقیقی نہیں ہے بلکہ ننگ یعنی انسانی خودی کی تذلیل کا باعث ہے. چنانچہ فرماتے ہیں.

عشقہائے کز پئے رنگے بود
عشق نبود عاقبت ننگے بود

دوسرا عشق وہ ہے جو اللہ سے کیا جاتا ہے اور چونکہ اللہ باقی ہے اس لئے اس کا عشق عاشق کو بھی غیر فانی بنا دیتا ہے. رومیؒ کی نگاہ میں یہی حقیقی عشق ہے اور اسی لئے صوفیا اللہ کو معشوق حقیقی کہتے ہیں۔

اس عشق حقیقی کی یہ خاصیت بلکہ طینت ہے کہ عاشق کو مادیات اور نفسیاتی خواہشات سے بالاتر کر دیتا ہے اور عشق مجازی اس کی ضد ہے اس لئے وہ نفسیاتی خواہشات میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ اسی وقت تک رہتا ہے جب تک حسن و جمال باقی رہتا ہے اسی لئے علامہ اقبالؔ نے اسے ہوس سے تعبیر کیا ہے. عشق اور ہوس دونوں میں جو فرق ہے اُسے علامہ نے شہباز اور مگس کی تشبیہ سے واضح کیا ہے یوں تو دونوں اڑ سکتے ہیں اور اڑتے

ہیں لیکن دونوں کی نوعیتِ پرواز میں بھی فرق ہے اور غایت پرواز میں بھی واضح فرق ہے۔

۱۔ مکھی کی پرواز میں وہ شدت پیدا نہیں ہو سکتی جو شہباز کی پرواز میں ہوتی ہے اسی طرح بوالہوس کی محبت اور عاشق کی محبت میں فرق ہوتا ہے

۲۔ مکھی ناپاک، کثیف اور گندی چیزوں کی طرف جاتی ہے لیکن شہباز ہمیشہ زندہ شکار کی طرف جاتا ہے اسی طرح بوالہوس کا میلان طبع کثافت کی طرف ہوتا ہے اور عاشق صادق کا جذبہ پاکیزہ اور ارفع ہوتا ہے۔

دوسرا شعر: اس شعر کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔۔۔۔

پہلا مطلب یہ ہے کہ جو حکمراں عقلمند ہوتے ہیں وہ محکوم قوم کو ایسے سبز باغ دکھا سکتے ہیں کہ وہ آزادی کے جذبہ (نشیمن) کو مذموم سمجھنے لگتے ہیں اور غلامی (قفس) کو اپنے حق میں محمود تصوّر کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی طالبعلمی کے زمانہ میں آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے ہندوستان کے بعض مشہور اُدبا کے مضامین پڑھے تھے جن کا عنوان تھا (برکات سلطنت انگلیسہ) ناظرین اس عنوان کو مدّنظر رکھ کر اقبالؔ کے اس شعر کے مفہوم سے کسی قدر آگاہ ہو سکتے ہیں یہ عنوان زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ لکھنے والا غلامی کو آزادی سے بہتر سمجھتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ انسان پابندی (قفس) سے بھاگتا ہے آزاد رہنا چاہتا ہے لیکن اگر کسی شخص میں روحانی کمال موجود ہو تو لوگ اپنی آزادی کو خیرباد کہہ کر اس کی غلامی کو بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ

جب حضرت سید احمد صاحب رائے بریلوی دہلی تشریف لائے تو ان کا مشن بھی جہاد فی سبیل اللہ کا تھا اور اسی مشن کی اشاعت اور سکھوں اور انگریزوں سے لڑنے کی ترغیب دلی میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اپنے شاگردوں اور معتقدین کو دے رہے تھے اسی اثنا میں سید احمد صاحب رائے بریلوی سے ملاقات ہوئی دونوں کے نظریئے ایک تھے لہٰذا مولانا محمد اسمٰعیل شہید نے ان کے ہاتھ پر جہاد فی سبیل اللہ کی بیعت کر کے ان کے ایسے گرویدہ ہو گئے کہ مدۃ العمر قدموں سے جدا نہ ہوئے۔

تیسرا شعر:۔ جس شخص کے دل میں عشق الٰہی کی بدولت جہاد فی سبیل اللہ کا ارادہ پیدا ہو جائے اور وہ سر کٹانے کے لئے آمادہ ہو جائے تو وہ بانگ رحیل یعنی اعلانِ جہاد کا انتظار نہیں کیا کرتا وہ مجسم اعلانِ جہاد بن جاتا ہے وہ اس کا منتظر نہیں ہوتا کہ دوسرا شخص اس کو ترغیب دے بلکہ وہ خود جہاد کرتا ہے۔ دیکھ لو سمندر کی موجوں میں ساحل سے ٹکرانے کا جذبہ چونکہ باطنی طور سے موجود ہوتا ہے اس لئے وہ کسی خارجی تحریک کا انتظار نہیں کرتیں اٹھنا ابھرنا حرکت و میلان اور آگے بڑھنا اور ٹکرانا یہ موج کی ذات میں داخل ہے اس لئے وہ کسی دوسرے کی تحریک کی محتاج نہیں ہے۔

چوتھا شعر:۔ اگرچہ کالج اور یونیورسٹی کا طالب علم بظاہر زندہ نظر آتا ہے چلتا پھرتا ہے۔ پڑھتا ہے۔ امتحان پاس کرتا ہے لیکن دراصل مردہ ہے کیوں اس لئے کہ اس کے دماغ میں جو خیالات اور دل میں جو جذبات موجزن ہیں وہ اس کے ذاتی نہیں ہیں بلکہ فرنگی کے عطا کردہ ہیں اور جو شخص ذہنی غلام ہے دوسرے کا دست نگر ہے وہ دراصل مردہ ہے جس طرح مردہ نہ اپنے

آپ کو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ دوسروں کو نفع دے سکتا ہے اسی طرح غلام نہ خود ترقی کر سکتا ہے نہ قوم کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے موجودہ نظام تعلیم کی خرابیوں پر جو کچھ لکھا ہے اگر اسے جمع کیا جائے تو بجائے خود ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے اس لئے میں اس موضوع پر عنقریب جداگانہ کتاب لکھوں گا۔

پانچواں شعر:۔ اے مسلمان! اگر تو اپنے دل کو زندہ کرنا یعنی حقیقی معنیٰ میں مومن بننا چاہتا ہے تو کسی مومن کی صحبت اختیار کر کیونکہ دنیا کا دستور یہی ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔

اقبالؔ نے اس موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا ہے اس جگہ صرف ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب دیں از نظر

اکبر الہ آبادیؒ نے بھی اسی حقیقت کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

افسوس اس بات کا ہے کہ قوم نے اکبرؔ اور اقبالؔ کی اس تعلیم کو ابھی تک درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ کاش میری قوم اس نکتہ سے آگاہ ہو جائے کہ محض آہ یوم اکبرؔ اور یوم اقبالؔ کے ہنگاموں سے دل زندہ نہیں ہو سکتا۔

۱۰

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری
عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز
کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کرّاری
نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو
یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

۱۰

اس نظم میں اقبالؔ نے محراب گل کی زبان سے مسلمان نوجوان کی خوبیاں بیان کی ہیں یعنی اقبال اپنی قوم کے نوجوانوں میں ان صفات کے متمنی تھے۔

پہلا شعر:۔ محراب گل کہتا ہے کہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے وہی مسلمان نوجوان ملت اسلامیہ کے لئے باعثِ فخر ہو سکتا ہے جو جوانی میں پاکباز

اختیار کرے اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار رہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ کی نظر میں جوانی کی عبادت سب سے زیادہ محبوب ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں ایک شعر پڑھا تھا جو اسی حدیث کا ترجمہ ہے۔

یعنی کرلے کچھ جوانی میں حصول
بندگی ہوتی ہے اس سن میں قبول

الغرض اسلامی زاویۂ نگاہ سے اس جوان کی زندگی قابلِ رشک ہے جو پارسا ہو اور مجاہد ہو اور اسلام کا عاشق ہو۔

دوسرا شعر:۔ اگر میدانِ جنگ میں جائے تو کچھار (غاب) کے شیر کی طرح حملہ کرے اور دشمنوں کی صفیں اُلٹ دے اور اگر دوستوں سے ملے تو ایسا دلکش اور مہربان ہو جیسے تاتاری خوبصورت ہرن۔

تیسرا شعر:۔ اس کے دل میں عشق الٰہی کی ایسی آگ روشن ہو کہ باطل کی تمام کائنات کو پھونک کر رکھ دے اور اگر وہ ایسا کر دکھائے تو اس میں تعجب ہی کیا ہے؟ جس طرح آگ کی ایک چنگاری سارے جنگل کو جلا کر راکھ کر سکتی ہے اسی طرح ایک مرد مومن سارے لشکرِ کفر کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ چونکہ مرد مومن کے فقر میں حیدری اور کرّاری کی شان ہوتی ہے اس لئے دنیا میں اسے وہی دبدبہ حاصل ہوتا ہے جو بادشاہوں کو حاصل ہوتا ہے۔

۱۔ حیدری کے دو معنیٰ ہیں (۱) منسوب بہ حیدرؓ۔ (۲) ہیبتِ شیر۔
۲۔ کرّاری کے معنیٰ ہیں بار بار حملہ کرنے کی شان۔

پانچواں شعر:۔ اہل دنیا سے اقبالؔ خطاب کرتے ہیں کہ اگر مومن کے پاس ظاہری ساز و سامان نظر نہ آئے تو اسے ذلت کی نگاہ سے مت دیکھو اس کے جوہر ذاتی پر نظر کرو اور اس حقیقت کو سمجھو کہ اگرچہ وہ بے کلاہ ہے لیکن اس کی بدولت قوم کو سرداری نصیب ہو سکتی ہے۔

جس وقت عرب کے نوجوان اپنے وطن کی حدود سے باہر نکلے تھے تو ان کے پاس مادی اسباب اور ظاہری سامان کچھ بھی نہ تھا لیکن جوہر ذاتی کی بدولت انہوں نے اپنی قوم کو دنیا میں سربلند کر دیا۔

اقبال نے نظم کے علاوہ اپنے بیانات میں بھی بار بار اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ کسی قوم کا مستقبل اس کے نوجوانوں کے جوہر ذاتی پر موقوف ہے اگر ان کے دل میں اپنی قوم کو سربلند کرنے کا جذبہ موجزن ہو جائے تو انقلاب رونما ہو سکتا ہے کیونکہ کامیابی کے لئے جن جن باتوں کی ضرورت ہے وہ صرف نوجوانوں ہی میں پائی جا سکتی ہیں۔ مثلاً قوت ارادی۔ جفاکشی۔ جوشِ عمل۔ سرگرمی اور قربانی کاش میری قوم کے نوجوان اقبالؔ کے پیغام کو دل میں جگہ دیں۔

نوٹ:۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید ان خیالات سے بھی ہو سکتی ہے جو مصر کے سفیر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے نے مؤتمر عالم اسلامی کے جلسہ کراچی منعقدہ ۱۱ر فروری ۱۹۵۰ء میں اپنی صدارتی تقریر میں ظاہر کئے انہوں نے کہا کہ

دنیائے اسلام کا مستقبل مسلمان نوجوانوں کی سیرت اور بلند حوصلگی پر موقوف ہے میری رائے میں مغربی تہذیب نے سائنٹفک اور مادی ترقیوں کے پردہ میں مسلمان نوجوانوں کو بڑی حد تک صراط مستقیم سے منحرف کر دیا ہے بقول اکبر الہ آبادی۔

شیطان نے دکھا کے جمالِ عروسِ دہر
بندہ بنا لیا ہے انہیں حُبِّ جاہ کا

اس لئے ہمارے علما کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ اس گمراہی کا سدِّ باب کریں جو تہذیبِ مغرب کی بدولت ان میں پیدا ہو گئی ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ ان کے ذہن کو اسلامی نظام تصورات و افکار (Islamic Ideology) کی روشنی سے منور کریں مغربی تہذیب کا لازمی نتیجہ جہالت ہے اور یہ تاریکی صرف نورِ اسلام سے دور ہو سکتی ہے جب ہمارے نوجوان اسلامی اصولوں سے واقف ہوں گے تو یقیناً اپنی زندگی ان اصولوں کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے۔

مسلمانانِ عالم کا مستقبل بلاشبہ آئندہ نسلوں کی پاکیزہ سیرت اور بلند حوصلگی پر موقوف ہے اگر ہم ان کی سیرت اسلامی اخلاق کے سانچہ میں ڈھال سکیں تو یقیناً ہم انہیں جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے مضبوط بنا سکتے ہیں اور اس کی بدولت وہ دنیاوی مشکلات کا بآسانی مقابلہ کر سکیں گے نیز اگر ہم ان کے دلوں میں زخارفِ دنیوی سے نفرت کا جذبہ پیدا کرنے میں کامیاب ہیں اسی چیز کو اقبال نے شانِ استغنا سے تعبیر کیا ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم ایک مضبوط ملّتِ اسلامیہ پیدا کر سکیں گے بقول اقبال ؎

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں
کہ پائی میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

مسلمان نوجوانوں کی صحیح تربیت کے سلسلہ میں دو باتوں کو مدّنظر رکھنا چاہیئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ انہیں اسلام کے اصولوں سے آگاہ کیا جائے دوسری بات یہ ہے کہ ان کے سامنے صحیح نمونہ پیش کیا جائے یعنی ہم خود اسلامی طریق زندگی اختیار کریں تاکہ ہمیں دیکھ کر وہ بھی اپنی زندگیوں کو اسلامی سانچہ میں ڈھال سکیں۔ علامہ اقبالؔ نے آج سے پندرہ سال پہلے اپنے خیالات کو اس شعر میں پیش کر دیا تھا۔

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

(❖)

۱۱

جس کے پرتو سے منوّر رہی تیری شبِ دوش
پھر بھی ہو سکتا ہے روشن وہ چراغِ خاموش
مردِ بے حوصلہ کرتا ہے زمانے کا گِلہ
بندۂ حر کے لئے نشترِ تقدیر ہے نوش
نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں
جو ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش

مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری
اور عیّار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش

(:)

۱۱

اس پر کیف اور پر سوز نظم میں اقبال نے بڑے دلکش انداز سے مسلمان نوجوانوں کو جہاد کی تلقین کی ہے اسی جہاد کی تلقین جس کی وجہ سے انگلستان کی عورتیں سولہویں صدی میں اپنے ضدی بچوں کو یہ کہہ کر سلا دیا کرتی تھیں

(HUSH BALE MUSH THA TURKS ARE COMING)

سو جا بچے سو جا! ترک آن پہونچے یا آرہے ہیں۔

اسی جہاد کی تلقین جو انگریز علیہ ما علیہ کی نظر میں مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم تھا اور جس کی پاداش میں انہوں نے ۱۸۵۷ء میں قلعۂ دہلی کے سامنے اکبر آبادی مسجد کو زیر زمیں دفن کر دیا اور اس کے اوپر ایڈورڈ ہفتم کا مجسمہ نصب کر دیا۔ میری رائے میں یہ مسجد نہیں تھی جو یوں مٹی کے نیچے چھپ گئی انگریز نے مسلمانوں کی غیرت ملّی کو خاک میں ملا دیا۔ کاش میری قوم کے اندر انتقام کا جذبہ پیدا ہو جائے اور ہم اس مقدس خانہ خدا کو از سر نو زندہ کر سکیں[1]

---

[1] حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اپنا شہرۂ آفاق ترجمہ قرآن حکیم اسی مسجد میں بیٹھ کر پایۂ تکمیل کو پہنچایا تھا اور اسی مسجد میں روحانی فیض کا چشمہ جاری کیا تھا۔

اس نظم کا پہلا شعر اقبال کے جذبات ملّی ہی کا آئینہ دار ہی نہیں ہے بلکہ ان کے کمال فن پر بھی شاہد ہے انہوں نے اپنی بات ایسے مؤثر انداز سے کہی ہے کہ تعریف و توصیف کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ خصوصاً لفظ پھر بھی تو سارے شعر کی جان ہے اور اس کے اندر رجائیت (Optimism) اور یقین کا جو رنگ جھلکتا ہے اس کا اندازہ صرف ذوق سلیم ہی سے ہو سکتا ہے جیسا کہ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ اے مسلمان! جس چراغ کے پرتو سے تیری گذشتہ شب روشن تھی وہ چراغ اگرچہ تیری ہی غفلت اور حماقت کی وجہ سے بجھا لیکن تو مایوس مت ہو وہ چراغ پھر بھی روشن ہو سکتا ہے۔

غور کیجئے! اقبال نے کس خوبصورتی کے ساتھ ایک شعر میں ماضی حال اور مستقبل تینوں زمانہ جمع کر دیئے ہیں۔

۱۔ شبِ دوش منور تھی۔ یعنی زمانۂ ماضی میں مسلمانوں کو سربلندی حاصل تھی۔

۲۔ چراغ خاموش۔ یعنی زمانہ حال میں وہ سربلندی حاصل نہیں ہے۔

۳۔ پھر روشن ہو سکتا ہے۔ یعنی زمانہ مستقبل میں وہی سربلندی پھر حاصل ہو سکتی ہے۔

لفظ۔ پھر بھی لفظ پر غور کیجئے! کیا آپ کو اس لفظ کے پردہ میں اقبال کے جذبات کا طوفان نظر نہیں آتا۔؟

اب سوال یہ ہے کہ وہ چراغ کیا تھا جس کے پرتو سے مسلمان کی شب گذشتہ منوّر ہوئی تھی؟ اقبال نے اگرچہ صراحتاً اس کا ذکر نہیں کیا لیکن الکنایۃ

ابلغ من التصریح علم معانی کا مسلمہ اصول ہے کہ اشارہ میں جو لطف ہے وہ صراحت میں کہاں ہے؟ ہر شخص باندک تامّل اس کا جواب دے سکتا ہے کہ (چراغ خاموش) کنایہ ہے جذبۂ جہاد سے۔ جو جذبۂ جہاد سرد ہو چکا ہے وہی جذبہ جس کے سرد کرنے کے لئے انگریز نے ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۷ء یعنی کامل تیس سال تک علما کے خلاف دار و گیر کی مہم جاری رکھی اور جب تک انہوں نے اپنی دانست میں ہر سچے عالم دین کو گرفتار کر کے کالے پانی نہیں بھیج دیا اس مہم کو بند نہیں کیا اور جب اس مہم کو بند کیا تو آئندہ اس جذبہ کا سدّباب کرنے کی غرض سے "پنجاب انتخاب ہفت کشور" میں ایک نبی" اور دوسرے بریلی میں "نبی کو خدا کا درجہ دینے والا" پیدا کیا۔ جنہوں نے ۱۸۸۷ء سے ۱۹۰۷ء تک بڑے زور آور حملوں کے ساتھ جہاد کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے اپنا فرض منصبی ادا کیا۔

غور سے دیکھو تو اقبالؔ نے ہر کتاب میں مسلمانوں کو یہی پیغام دیا ہے کہ اپنے اندر جہاد کا جذبہ پیدا کرو۔ تاکہ انگریزوں سے انتقام لے سکو پس میری رائے میں اقبال کی تعلیم کا خلاصہ دو لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کہ

جہاد سے محبت ۔ انگریز سے نفرت ۔

نوٹ:۔ انہی دو باتوں کو مدّنظر رکھ کر میں نے کلام اقبالؔ کی شرح کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ میری مدد فرمائے آمین۔

دوسرا شعر:۔ یاد رکھو! صرف وہی شخص زمانہ کا گلہ اور بدقسمتی کا شکوہ کرتا ہے جو پست ہمّت اور کم حوصلہ ہوتا ہے مومن کبھی ناکامی سے مایوس نہیں ہوتا اگر تقدیر یعنی اللہ کی مشیت کی بنا پر اسے کسی معاملہ میں کامیابی نصیب

نہیں ہوتی تو وہ اس نشتر (نیش) کو شہد (نوش) سمجھتا ہے اس لئے وہ ہر ناکامی کے بعد دگنی طاقت سے کام لیتا ہے اور انجام کار مشکلات پر غالب آتا ہے۔

نوٹ:۔ مشہور انگریزی شاعر براؤننگ (Browning) نے بھی اس موضوع پر ایک نظم لکھی ہے جس میں وہ یہ کہتا ہے کہ ناکامی کا مطلب یہ ہے کہ کوشش میں کچھ کمی رہ گئی تھی اس لئے دوبارہ کوشش کرو پس ناکامی باعثِ رنج و ملال نہیں ہے بلکہ عقلمند کے لئے پیام مسرت ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس نظم کا جو میں نے سنہ ۱۹۱۷ء میں پڑھی تھی ایک مصرع اب تک یاد ہے (The welcome of a failure) یعنی اگر یہ بات ہے کہ ناکامی پیام مسرت ہے تو پھر ہر ناکامی کو خوش آمدید کہنا چاہئے۔

نوٹ:۔ میں نے اس شعر کی تشریح میں تقدیر کے معنی "مشیت ایزدی" کئے ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ خود اللہ نے مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے کہ اے مسلمانو! یاد رکھو اس کائنات میں کوئی انسان۔ جن۔ فرشتہ۔ بادشاہ شیطان۔ غرضیکہ کوئی ہستی تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتی اگر تمہیں کوئی تکلیف پہونچ سکتی ہے تو صرف اللہ یعنی میرے حکم سے پہنچ سکتی ہے پس تم دنیا میں کسی حکومت یا طاقت سے خوفزدہ اور مرعوب نہ ہونا کیونکہ کسی میں تمہیں نقصان پہنچانے کی طاقت ہی نہیں ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰىنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (سورہ توبہ آیت ۵۲) اے میرے محبوب! آپ فرما دیجئے کہ ہمیں ہرگز کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی سوائے

اس تکلیف کے جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے۔ وہی ہے ہمارا کارساز پس مسلمانوں کو لازم ہے کہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں۔

اس آیت کی شرح تو اس وقت لکھوں گا جب خدا کے فضل سے قرآن حکیم کی خصوصیات کے عنوان سے ایک مستقل کتاب لکھوں گا اس وقت صرف اس بات پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہی آیت تو مسلمانوں کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی جس کی بناء پر ان میں اس قدر طاقت پیدا ہو گئی تھی کہ انہوں نے تسخیر ایران کے زمانہ میں ایک دفعہ طغیانی کی حالت میں دریا کے اندر گھوڑے ڈال دیئے تھے چنانچہ جب وہ ساحل پر پہونچے تو ایرانی سپاہی یہ کہہ کر بھاگ کھڑے ہوئے "دیوان آمدند" دیوان آمدند" کیونکہ انہیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ کوئی انسان طغیانی میں دریا کو عبور کر سکتا ہے پس یہ لوگ انسان نہیں ہیں بلکہ دیو ہیں۔

تیسرا شعر:۔ اے مسلمانو! یاد رکھو! اور اے نوجوانوں! کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش ہو سکتے ہو یعنی تم کو اگر بلبل کی آواز یا کسی عورت کی تصویر متاثر کر سکتی ہے تو تم ہرگز میدانِ جنگ میں کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکتے۔ بات یہ ہے کہ میدان جنگ میں شمشیر زنی وہ شخص کر سکتا ہے جو فولاد کا جگر رکھتا ہو لیکن جو شخص عورتوں کی دلکش آواز سے مغلوب ہو سکتا ہے وہ دشمن کو کس طرح مغلوب کر سکتا ہے۔ اس وقت ایک تاریخی واقعہ یاد آگیا جو نہایت برمحل ہے۔

وہ واقعہ یہ ہے کہ شہزادہ مراد نے قلعہ گوالیار کے بعض ذمہ دار افسروں کو گرانبہا رشوت دے کر کمند کے ذریعہ سے فرار ہونے کا انتظام کیا

ت کے تین بجے فرار ہونے سے قبل یہ بیوقوف شہزادہ اپنی ہندو محبوبہ سے (جس کا نام اس وقت یاد نہیں آتا) رخصت ہونے کے لئے اس کے کمرے میں آیا۔ جو گارڈ روم سے ملحق تھا وہ (وفا کی دیوی) اس سے لپٹ گئی اور وہ بے اختیار چیخ مار کر رونے لگی اس کے چیخنے سے تمام سنتری دروازہ پر جمع ہو گئے اور راز فاش ہو گیا۔

نوٹ:۔ میں نے اس ہندو عورت کو وفا کی دیوی سے تعبیر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وفا کے اعتبار سے ہندو عورت اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ واقفِ رموز عاشقی حضرت امیر خسرو دہلویؒ فرماتے ہیں۔

در محبت چوں زنِ ہندو کسے فرزانہ نیست
سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

چوتھا شعر:۔ محراب گل کہتا ہے کہ اے مسلمان نوجوان! میں دیکھتا ہوں کہ تیری طبیعت لہو و لعب کی طرف مائل ہے ابھی تک تیرے اندر ناسمجھ بچوں کی سی عادتیں پائی جاتی ہیں جو ہر دلکش اور میٹھی چیز کو دیکھ کر مچل جاتے ہیں اور یورپ کے عیار جو تیرے ملک پر مسلط ہیں ٹافی اور چاکلٹ کی تجارت میں ماہر ہیں ایسا نہ ہو کہ تو ان مٹھائیوں کی طرف مائل ہو کر مقصدِ حیات سے غافل ہو جائے۔

اس شعر میں اقبالؔ نے بڑا زبردست نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے اگر کوئی شخص انگریزی مٹھائی پسند کرتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ انگریزی تہذیب کو بھی پسند کرنے لگے گا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ انگریزوں کی سوسائٹی کو

پسندیدہ نظروں سے دیکھنے لگے گا اور جب یہ حالت رونما ہو جائے گی تو وہ ان کے خلاف صف آرا کیسے ہو سکتا ہے۔؟

شکر پارہ فروشی۔ سے سینما۔ ٹیلویژن۔ ریڈیو۔ محافل رقص و سرود۔ ہوٹلوں کی زندگی۔ مغربی طرز معاشرت اور مخلوط تعلیم بھی مراد ہو سکتی ہے اور یہ وہ لعنتیں ہیں جو نوجوانوں کو میدان جنگ تو بڑی چیز ہے جد و جہد سے بھی بیگانہ بنا رہی ہیں اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ آج کا نوجوان لڑکیوں سے زیادہ اپنا وقت اور روپیہ جسمانی آرائش پر صرف کرتا ہے اور بسا اوقات اس پر عورت ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

(٭)

۱۲

لادینی و لاطینی اِک پیچ میں اُلجھا تو
وارد ہے ضعیفوں کا لَا غَالِبَ اِلَّا ھُو
صیّادِ معانی کو یورپ سے ہے نومیدی
دلکش ہے فضا لیکن بے نافۂ تمام آہو
بے اشکِ سحرگاہی تقویمِ خودی مشکل
یہ لالۂ پیکانی خوشتر ہے کنارِ جو
صیّاد ہے کافر کا نخچیر ہے مومن کا
یہ دیر کہن یعنی بت خانۂ رنگ و بو

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو



۱۲

اس غزل میں اقبال نے بعض حقائق و معارف بیان کئے ہیں یعنی فلسفہ کو شعر کی زبان میں ادا کیا ہے۔

پہلا شعر:- پہلے شعر میں اگرچہ مخاطب مذکور نہیں ہے لیکن قرینہ دلالت کرتا ہے کہ ترکوں سے خطاب ہے کیونکہ اسی قوم نے مصطفٰے کمال کی زیر ہدایت حکومت ترکی کی ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے لادینی تہذیب اور لاطینی حروف کو اختیار کیا۔

لادینی سے مراد ہے یہ نظریہ کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہے مصطفٰے کمال نے اپنی کوتاہ بینی کی بدولت یہ رائے قائم کی کہ اگر ہم یہ اعلان کر دیں گے کہ ہم بھی مسلمان ہیں اور حکومت کا مذہب بھی اسلام ہے تو یورپ کی حکومتیں ہم سے ناراض ہو جائیں گی اس لئے اس نے یہ اعلان کیا کہ ترکی ایک لادین اسٹیٹ (Secular State) ہے یعنی اسلامی اصول ترک کر کے میکیاولی کا اصول اختیار کر لیا کہ سیاست کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ بات مصطفٰے کمال کی دینی کم مائگی پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ اسلام میں سیاست اور مذہب جدا نہیں ہیں علاوہ بریں

انگلستان کا بادشاہ تو تحافظ دین عیسوی کے لقب پر فخر کرتا ہے پس اگر مصطفےٰ کمال بھی یہ اعلان کر دیتا کہ میں محافظ دین اسلام ہوں تو کوئی حرج نہ تھا لیکن وہ یورپین تہذیب سے اس درجہ مرعوب ہو گیا کہ اس نے لادینی کے علاوہ لاطینی حرف تہجی بھی قبول کر لئے۔

۱۹۲۴ء سے پہلے ترکی زبان کا رسم الخط ترکی یا فارسی تھا لیکن تجدد کے شوق میں مصطفےٰ کمال نے اپنی زبان کا رسم الخط بھی بدل دیا اور اب ترکی زبان لاطینی زبان میں لکھی جاتی ہے۔

چونکہ علامہ کا دل مصطفےٰ کمال کی اس غیر اسلامی روش سے بہت ملول ہو گیا تھا اس لئے انہوں نے اپنے رنج و غم کا اظہار اس طرح کیا کہ اے نادان ترک! تو بڑی حماقت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اے بیوقوف! کیا تو سمجھتا ہے کہ حکومت کو لادینی بنا کر اور لاطینی حروف اختیار کر کے تو طاقتور قوموں کی صف میں شریک ہو سکے گا؟ یاد رکھ! تیرے ضعف کا علاج یہ نہیں کہ تو یورپ کی کورانہ تقلید کرے بلکہ تجھے لازم ہے کہ اپنے عقائد درست کرے دنیا میں طاقت حاصل کرنے کے لئے تجھے اس عقیدہ کو ذہن نشین کرنا چاہئے کہ لَاغَالِبَ اِلَّا هُوْ یعنی اللہ کے علاوہ اور کوئی طاقت مجھ پر غالب نہیں آسکتی۔

واضح ہو کہ لَاغَالِبَ اِلَّا هُوْ کی ترکیب قرآن حکیم کی آیت سے ماخوذ ہے۔ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ یعنی اللہ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ میں اور میرے رسولؐ بلاشبہ غالب رہیں گے۔

دوسرا شعر:۔ صیاد معانی سے مراد ہے وہ شخص جو حقیقت

یا روحانیت کا طالب ہو فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ یورپ کی تہذیب سے روحانیت یا پاکیزگی اخلاق کا درس لے تو وہ یقیناً اس کوشش میں ناکام رہے گا کیونکہ یورپ میں یہ جنس بالکل ناپید ہے یورپین تہذیب تو مادہ پرستی پر مبنی ہے اگرچہ یہاں کی فضا بھی دلکش ہے اور آہو بھی موجود ہیں لیکن (نافہ) جس پر آہو کی قدر و قیمت کا انحصار ہے ناپید ہے یعنی یورپ میں متمدن سوسائٹی (فضا) بھی ہے اور درسگاہیں اور اساتذہ بھی ہیں مگر ان کے اندر روحانیت اور اخلاق حسنہ کا مطلق وجود نہیں ہے۔

تیسرا شعر:۔ اشک سحر گاہی کے بغیر خودی کی تقویم یعنی تربیت اور اس کا استحکام ناممکن ہے۔ واضح ہو کہ اقبال نے اس مصرع میں لفظ مشکل ناممکن کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

خودی کو لالۂ پیکانی سے تشبیہ دے کر اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ جس طرح آبِ جو (نہر کا پانی) لالہ پیکانی کی شگفتگی کے لئے ضروری ہے اسی طرح اشک سحر گاہی کی نشوونما اور اس کے ارتقا کے لئے شرط اولین ہے۔ لالۂ پیکانی میں لفظ پیکانی لالہ کی صفت ہے یعنی جب تک لالہ غنچہ کی حالت میں رہتا ہے اس کی شکل پیکان (نوک تیر) سے ملتی جلتی ہے گویا اس لفظ سے لالہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔

واضح ہو کہ اقبال کے فلسفہ میں اشک سحر گاہی یا آہ سحر گاہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے شاید ناظرین متعجب ہوں کہ فلسفہ جیسے خشک موضوع کو اشک سحر گاہی سے کیا رابطہ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے یہاں لفظ فلسفہ کو نظام افکار کے معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے۔ بیشک فلسفہ کے اصطلاحی معنی میں اشک

اور آہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن اقبال کی تصانیف میں ہمیں دونوں قسم کا فلسفہ مل سکتا ہے۔

۱۔ فلسفہ بمعنی مجرد غور و فکر جو الٰہیات یا امور عامہ میں کیا جائے (فلسفہ کی اصطلاح میں امور عامہ سے ہیولیٰ۔ صورت۔ حرکت۔ سکون۔ زمان اور مکان سے متعلقہ مسائل مراد ہیں) اس اعتبار سے اقبال کا فلسفہ ان کی انگریزی کتاب "فکر اسلامی کی تشکیل جدید"

(Reconstruction of Religious Thought.)

میں مل سکتا ہے اور اس میں "اشکِ سحر گاہی" کا تذکرہ نہیں ہے۔

۲۔ فلسفہ بمعنی دین اسلام کے حقائق و معارف کی تشریح اس اعتبار سے اقبال نے اپنا فلسفہ۔ اسرار خودی اور رموز بیخودی مدوّن کیا ہے اس امتیاز کو میں نے اس لئے واضح کر دیا ہے کہ اقبال محض اصطلاحی معنوں میں فلسفی نہیں ہیں وہ دین اسلام کے وکیل اور شارح بھی تو ہیں اور مسلمانوں کی نگاہ میں ان کی کچھ قدر و قیمت ہے۔ وہ اسی حیثیت سے ہے۔

اس تمہید کے بعد اب مقصود کی طرف واپس آتا ہوں اقبال نے جیسا کہ سب جانتے ہیں خودی کا فلسفہ پیش کیا ہے یہ خودی کا فلسفہ دراصل اصطلاحی معنی میں فلسفہ نہیں جیسا ڈیکارٹ یا ہیوم۔ کانٹ یا ہیگل کا فلسفہ بلکہ اسلامی شریعت اور شریعت کے باطن یا مغز یعنی طریقت کی بیسویں صدی میں فلسفیانہ انداز میں توجیہ ہے چنانچہ مثنوی "پس چہ باید کرد" کا مطالعہ کرنے سے میرے دعوے کی صداقت واضح ہو سکتی ہے مثالاً ایک شعر نقل کئے دیتا ہوں۔

پس طریقت چیست اے والا صفات
شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات

خودی کا فلسفہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ اگر ایک مسلمان شریعت محمدیہ کی اتباع کامل کرے تو اس کے اندر شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے اور یہی شان فقر خودی کی معراج یا اس کی تکمیل ہے۔

اب اتباع عشق کے بغیر ناممکن ہے اور عاشق کے لئے اشک سحر گاہی یا آہ سحر گاہی بمنزلہ وظیفہ حیات ہے بلکہ منطقی اصطلاح میں عشق اور آہ لازم و ملزوم ہیں یہ ناممکن ہے کہ عاشق محبوب کو یاد کرے اور اس کی آنکھ اشک آلود نہ ہو جائے چنانچہ ایک شاعر لکھتا ہے۔

ہے درد اپنا سحر کو نالہ و فریاد کر لینا
بہر صورت کسی پردہ میں تجھ کو یاد کر لینا

اقبال کا فلسفہ تکرار لکھتا ہوں عشق رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور یہ ناممکن ہے کہ عشق تو ہو لیکن اشک نہ ہو اسی لئے تو انہوں نے یہ کہا۔

ع بے اشک سحر گاہی تقویم خودی مشکل

اقبال کی رائے میں کافر کی خودی تو خودی ہی نہیں ہاں اگر وہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تو اس کی خودی خود تربیت کے لائق ہو سکتی ہے۔

غرض عشقِ رسولؐ اختیار کرنے سے خودی مرتبۂ کمال کو پہنچے گی اور عشق

کا ثبوت۔ اشک اور آہ ہی کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے مسلمان کے لئے تو عاشقی شرط اسلام ہے جو شخص مسلمان ہونے کا مدعی ہو اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں بیخود نہ ہو۔ اقبال کی نظر میں وہ شخص مسلمان نہیں۔

طبع مسلم از محبت ظاہر است
مسلم از عاشق نباشد کافر است

اسی نکتہ کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

بس اتنی سی حقیقت ہے ہمارے دین و ایماں کی
کہ اس جانِ جہاں کا آدمی دیوانہ ہو جائے

اگر اس اشک سحر گاہی کی پوری وضاحت کروں تو ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے اس لئے اقبال ہی کے ایک شعر پر اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔

عطار ہو رومی ہو رازی ہو۔ غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

چوتھا شعر:۔ یہ دنیا یہ پرانا بت خانہ۔ جہاں رنگ و بو کے ہزاروں لاکھوں بت رکھے ہوئے ہیں اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ کافر تو اس طلسم میں پھنس جاتا ہے یعنی بتوں کے تیرِ مژگاں کا شکار ہو جاتا ہے لیکن مومن اس طلسم کو توڑ دیتا ہے بالفاظِ دیگر اس بت خانہ میں جتنے بت ہیں سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

اقبال نے دنیا کو ہر جگہ طلسم رنگ و بو سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ دنیا جو حواس خمسہ سے محسوس ہوتی ہے۔ طلسم اور بت خانہ کے الفاظ اس حقیقت کی

طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دنیا اور اس کی دلفریبی کی کوئی حقیقت نہیں ہے مومن کا فرض ان بتوں کو پاش پاش کرنا ہے نہ کہ ان سے دل لگانا۔

اقبال کا یہ تصور قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ اور دنیا کی زندگی کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ دھوکہ کی پونجی ہے۔ دیکھو تو ہے غور کرو تو کچھ بھی نہیں۔

پانچواں شعر:۔ بلاشبہ اقبال نے یہ شعر لکھ کر بڑی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ امیروں سے اشارہ زمینداروں۔ جاگیرداروں و دولت مندوں اور سرمایہ داروں کی طرف ہے جو

۱۔ غریب کاشتکاروں کا خون چوس چوس کر اپنی تجوریاں لبریز کرتے ہیں اور مال حرام سے حکام کو رشوت دے کر بڑے بڑے کارخانے الاٹ کراتے ہیں اس کے علاوہ بلیک مارکیٹ اور ذخیرہ اندوزی سے لاکھوں روپیہ سالانہ کماتے ہیں۔

۲۔ سال میں ایک دو مرتبہ عید یا بقر عید کی نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آتے ہیں تو خانۂ خدا میں بھی مختلف صورتوں سے اپنی فرعونیت کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کے قلوب انسانی ہمدردی کے جذبات سے بالکل معرّا ہوتے ہیں۔ اسلامی زاویۂ نگاہ سے ان میں اور بہائم میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور چونکہ ان کی نمازیں محض ریاکاری یا ووٹوں کے حصول کے لئے ہوتی ہیں اس لئے ان سے مسجد کو سخت روحانی تکلیف پہنچتی ہے بلکہ ان کے سجدے اس مقدس زمین کی بے حرمتی کا سبب ہوتے ہیں۔ اندریں حالات اقبال

کا احتجاج بالکل درست ہے کہ اے شیخ! ان زر پرستوں کو مسجد سے نکلوا دے یہ تو دولت کے پجاری ہیں ان کا اللہ کے گھر میں کیا کام؟ یہ تو سرمایہ دار ہیں ان کو اسلام سے کیا علاقہ؟

۱۳

مجھ کو تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگرگوں
معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا
ہر سینے میں اک صبحِ قیامت ہے نمودار
افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا
کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی
اے پیرِ حرم تیری مناجاتِ سحر کیا
ممکن نہیں تخلیق خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

۱۳

اس نظم میں اقبالؔ نے قوم سے خطاب کیا ہے اور ایک اہم بات کی

طرف توجہ دلائی ہے جو یہ ہے کہ یوں تو مسلمان مراقش سے لے کر چین تک موجود ہیں لیکن اس وقت دنیا کی طاقتور قوموں کی صف میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ وہ آزاد نہیں ہیں بلکہ کسی نہ کسی قسم کی غلامی میں مبتلا ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ :-

۱- ہندوستان اور پاکستان کے لوگ حزن و ملال کو زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں اور غلامی کو اپنا مقدر جانتے ہیں۔

۲- بعض ممالک بلکہ اکثر ممالک کے مسلمان اقتصادی غلامی میں مبتلا ہیں مثلاً پاکستان کے مسلمان!

۳- تمام ممالک کے مسلمان ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں مثلاً افغانستان کے مسلمان اور یہ یقینی بات ہے کہ جب تک وہ غلامی کی ان اقسام سہ گانہ میں گرفتار ہیں۔ آزاد قوموں کی صف میں ان کو ہرگز جگہ نہیں مل سکتی۔ علامہ اقبال کہتے ہیں۔

پہلا شعر:- اے مسلمان! مجھے یہ علم نہیں کہ تو حالات حاضرہ یعنی عصر حاضر کے تقاضوں سے باخبر ہے یا نہیں لیکن میں اپنی جگہ پر یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت ساری دنیا ایک انقلابی دور سے گذر رہی ہے اور ہر طرف ایک ہنگامہ بپا ہے۔

دوسرا شعر:- اس وقت ہر ملک قیامت کا نمونہ پیش کر رہا ہے اور ہر شخص مضطرب ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غور و فکر کے سانچے اور پرانے طور طریقے بالکل بدل رہے ہیں اور دنیا کے نوجوان پرانے نظام کی جگہ نیا نظام

قائم کرنا چاہتے ہیں

تیسرا شعر:۔ اندریں حالات جب میں اپنی قوم کی طرف نظر کرتا ہوں تو ہر ملک میں جمود و خمود کا نقشہ نظر آتا ہے مسلمان آنے والے انقلاب کے لئے کسی قسم کی تیاری میں مصروف نہیں ہیں۔

دنیا کی قومیں نت نئے ساز و سامانِ جنگ ایجاد کر رہی ہیں اور کامیابی کے لئے مادی وسائل جمع کر رہی ہیں لیکن مسلمان قوم صرف مناجات سحر پر اکتفا کئے بیٹھی ہے اس لئے اقبال پیرِ حرم سے دریافت کرتے ہیں کہ جنگ کی تیاری کے بغیر کیا صرف دعاؤں اور مناجاتوں سے کام چل سکتا ہے۔؟ زندگی کامیاب اور سربلند زندگی بسر کرنے کے لئے معرکہ آرائی شرط ہے چونکہ تنازع البقا قانون حیات ہے اس لئے جو قوم اپنی بقا کے لئے جدوجہد نہیں کرتی وہ کس طرح باقی رہ سکتی ہے؟ لہٰذا بے معرکہ زندگی یعنی بے عملی کی زندگی تلافی مناجاتِ سحر سے کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ بیشک مناجات بھی ضروری ہے لیکن اس سے پہلے میدان جنگ کی تیاری ضروری ہے۔

سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی تیئیس ۲۳ سالہ حیات طیبہ میرے دعوے پر شاہد عادل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس نے مناجات کی ہوگی لیکن آپ نے جہاد کی تیاری میں کبھی کوتاہی نہیں فرمائی۔

چوتھا شعر:۔ حالات کا تقاضا تو یہ ہے کہ مسلمان دن رات جہاد کی تیاری میں مصروف رہیں لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ابھی تک خانقاہی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اب جب ہم خانقاہی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت صاف واضح ہو جاتی ہے کہ اس زندگی سے خودی کی تربیت اور تکمیل نہیں ہو سکتی بیشک کسی زمانہ میں ہماری خانقاہیں مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ پیدا کیا کرتی تھیں یعنی ان میں خودی کی تخلیق ہوا کرتی تھی لیکن موجودہ زمانہ میں ہماری خانقاہیں محض بے عمل انسانوں کے اجتماعوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔

آج کل عموماً حالت یہ ہے کہ ان خانقاہوں کے شیوخ مسلمانوں کو کفار کے خلاف صف آرا کرنے کے بجائے ان کی غلامی کا درس دے رہے ہیں اور جہاد کا جذبہ پیدا کرنے کی جگہ ترک دنیا اور گوشہ نشینی کی تلقین کر رہے ہیں جس طرح شعلۂ نم خوردہ سے آگ نہیں نکل سکتی اسی طرح ان خانقاہوں سے مجاہد تیار ہو کر نہیں نکل سکتے۔

علاوہ بریں موجودہ زمانہ میں یہ خانقاہیں حریت کا درس دینے کے بجائے مسلمانوں کو ذہنی غلامی میں مبتلا کر رہی ہیں (موجودہ زمانہ میں اکثر شیوخ مسلمانوں کو اللہ کا بندہ بنانے کے بجائے اپنا بندہ بنا لیتے ہیں جو غلامی کی بدترین قسم ہے) اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اگر کوئی قوم ذہنی غلامی میں مبتلا ہو جائے تو وہ سیاسی آزادی کبھی حاصل نہیں کر سکتی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے موجود ہے آپ نے سب سے پہلے عربوں کو ذہنی غلامی سے نجات عطا فرمائی اس کے بعد انہیں خود بخود سیاسی آزادی حاصل ہو گئی۔

پس اگر مسلمان دنیا میں دوبارہ سربلند ہونا چاہتے ہیں تو انہیں خانقاہی

زندگی کو بالکل ترک کر کے مجاہدانہ زندگی اختیار کرنی چاہیئے یعنی مزاج خانقاہی کے بجائے اپنے اندر مزاج اسد اللّٰہی پیدا کرنا چاہیئے۔

(٭)

۱۴

بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق ید اللّٰہی
جو سختیٔ منزل کو سامانِ سفر سمجھے
اے وائے تن آسانی! نا پیدا ہے وہ راہی
وحشت نہ سمجھ اس کو اے مردِ میدانی
کہسار کی خلوت ہے تعلیمِ خود آگاہی
دنیا ہے روایاتی۔ عقبیٰ ہے مناجاتی
در بانہ دو عالم را این است شہنشاہی

(٭)

۱۴

اس دلپذیر غزل میں اقبالؔ نے بعض حقائق و معارف بیان کئے

ہیں۔ فرماتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ جس عشق میں جرأت رندانہ موجود نہ ہو وہ روباہ صفت یعنی عیّار و مکّار۔ خود غرض۔ نفس پرست لوگوں کا عشق ہے بالفاظ دگر وہ عشق نہیں بلکہ ہوس ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان اسلام کے اِدّعا کے باوجود میدان جنگ یا جہاد فی سبیل اللہ سے جی چراتا ہے تو وہ مسلمان یا عاشق نہیں بلکہ لومڑی کی طرح عیار و مکار ہے اگر سر کٹانے کی ہمت اور خون میں نہانے کا حوصلہ نہیں ہے تو ادعائے عشق خالص فریب نفس ہے اس کے برعکس اگر ایک مسلمان میدانِ جہاد میں سر و سینہ پر پے در پے زخم کھانے کے باوجود اپنی شمشیر کے جوہر دکھاتا رہے اور جب تک آخری سانس باقی رہے وار کرنے سے باز نہ آئے تو سمجھو کہ وہ سچا عاشق ہے اس کا عشق یداللٰہی ہے۔

اس کی مثال انقلاب ۱۸۵۷ء میں بہت سے مسلمانوں نے دنیا کے سامنے پیش کی۔ میں معرکۂ رائے بریلی سے ایک نوجوان سید احمد صاحب کی مثال پیش کرتا ہوں

۴ مئی ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کی فوجیں لکھنؤ فتح کرنے کے بعد رائے بریلی پہونچیں تو مسلمانوں نے شہر سے چار میل آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کیا اس فوج میں ایک سو تیئیس غازی اسلام بھی تھے جو بلا مبالغہ سر سے کفن باندھ کر نکلے تھے انگریزی فوج کے ایک سارجنٹ میجر نے اپنی کتاب ۱۸۵۷ء کے معرکوں کی یادداشت میں غازیوں کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

خان بہادر خان کی فوج میں غازیوں کی ایک جماعت بھی تھی یہ سب
سب شہادت کے نشہ میں چور تھے ان کی ڈاڑھیاں تقریباً بالکل سفید ہونے
کے قریب تھیں۔ انگلی میں چاندی کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھے جس کے نگینہ پر لفظ
اللہ کندہ تھا۔ ہر غازی کی کمر میں سبز رنگ کا پٹکا بندھا ہوا تھا اور ردی کی
صدری پہنے ہوئے تھے اور سر پر سفید پگڑیاں باندھے ہوئے تھے جن پر سرخی کے
چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اور پشت پر ڈھال۔ دین
کا نعرہ لگا کر ہمارے سامنے آئے اور حملہ آور ہونے سے پہلے ان کا سردار جو ایک
بیس سال کا بے ریش و بزدت نوجوان تھا جس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا
تھا۔ صف سے آگے بڑھ کر ہم سے یوں مخاطب ہوا۔

کیا تم کافروں میں کوئی شخص ایسا حوصلہ مند ہے جو میرا مقابلہ کر سکتا
ہے اگر ہے تو سامنے آئے۔ اس کی آواز سے ہماری صفوں میں سناٹا چھا گیا
کوئی نوجوان آگے نہیں بڑھا ایک منٹ انتظار کے بعد اس نے پھر چیلنج دیا اور
کہا میں پانچ آدمیوں سے تنہا مقابلہ کر سکتا ہوں لیکن پھر بھی کوئی حرکت نہ ہوئی
آخر جھنجھلا کر اس نے تلوار نیام سے باہر نکالی اور ہماری صفوں پر حملہ آور ہوا اس
نے اس شدت سے حملہ کیا کہ چشم زدن میں اٹھارہ سپاہیوں کو زخمی کر کے ڈال
دیا اس کی بے نظیر شجاعت سے کمانڈنگ افسر اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے
حکم دیا کہ اس نوجوان کو گرفتار کیا جائے لیکن اس نے کہا کہ تم شیر کو زندہ گرفتار
نہیں کر سکتے۔ چنانچہ زخمی ہو جانے کے باوجود جبکہ اس کے جسم کے ہر عضو سے
خون کے فوارے نکل رہے تھے اس نے دوبارہ اسی شدت کے ساتھ حملہ کیا

جب کمانڈنگ افسر نے یہ حال دیکھا کہ اگر اس کو قتل نہ کیا گیا تو شاید ساری کمپنی (سو آدمی کی ایک کمپنی) کا صفایا کر دے گا تو مجبوراً اس نے حکم دیا کہ سنگینوں سے خاتمہ کر دو (Edy Mat Ain) یہ حکم سن کر سپاہیوں نے اسے نرغہ میں لے کر اپنی سنگینیں بیک وقت اس کے سینہ میں پیوست کر دیں لیکن جب تک اس کی روح جسم میں باقی رہی وہ برابر اپنی تلوار کے جوہر دکھاتا رہا اس کا ہاتھ اس وقت ساکن ہوا جب اس کی روح پرواز کر گئی۔

نوٹ:۔ میں نے یہ کتاب ۱۹۴۵ء میں ریاست منگرول (کاٹھیاواڑ) کے سرکاری کتب خانہ میں دیکھی تھی اس کا مصنف گھاگھرا پلٹن کے صفحہ ۹۳ میں جو لکھنؤ اور بریلی ورائے بریلی کے معرکوں میں شریک ہوئی تھی سارجنٹ میجر تھا اور اس نے اپنی کتاب میں سارے واقعات چشم دید ہی قلمبند کئے ہیں (لکھنؤ اور بریلی ورائے بریلی کے معرکوں میں انگریزی فوج کی صرف دو پلٹنیں تھیں صفحہ ۸۳ اور صفحہ ۹۳ باقی تمام پلٹنیں سکھوں کی تھیں جن کو انگریزوں نے یہ کہہ کر آمادۂ جنگ کیا تھا کہ اورنگ زیب کے مظالم کا انتقام لینے کا بہترین موقع ہے) میں نے اس کتاب کا خلاصہ اردو میں قلمبند کر لیا ہے شاید کسی وقت کام آجائے۔

میرا مقصد اس واقعہ کے نقل کرنے سے داستان سرائی نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ۱۸۵۷ء تک یعنی آج سے سو سال پہلے تک مسلمان نوجوانوں کی حالت یہ تھی کہ ایک نوجوان تن تنہا ساری فوج کو چیلنج کر سکتا تھا لیکن آج یہ حالت ہے کہ پوری قوم ایک انگریز کو بھی چیلنج نہیں کر سکتی اور اس کی وجہ یہ

ہے کہ قوم کے سامنے کوئی نصب العین نہیں۔ اقبال یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان نوجوان پھر اپنے اندر یہی جذبۂ جہاد پیدا کریں اور اس حقیقت کو ذہن نشین کرلیں کہ بازو میں یہ طاقت صرف اس عشق سے آسکتی ہے جو یداللّٰہی قسم کا ہو۔

عشق کی دو قسمیں ہیں۔ روباہی۔ اور یداللّٰہی۔ روباہی ٹائپ کا عشق عاشق کو بزدل اور مکّار بناتا ہے بظاہر اس قسم کے عاشق کے طور طریقے بالکل سچے عاشقوں کے سے ہوتے ہیں لیکن اس میں جرأتِ رندانہ نہیں ہوتی اور جب جرأت نہیں تو کچھ بھی نہیں جو عشق عاشق کو سرفروشی پہ آمادہ نہیں کرسکتا وہ عشق نہیں ہوس ہے۔ اس کے برعکس یداللّٰہی قسم کا عشق عاشق کو جری بناتا ہے اور ایسا عاشق خاک اور خون میں تڑپنے کو مقصودِ حیات سمجھتا ہے اللہ کی راہ میں سر کٹانا تو مسلمان کی معراج ہے۔

سرِ کشتہ بر نیزہ می زد نفس
کہ معراجِ مرداں ہمیں است و بس

یہ وہ شعر ہے جو حافظ رحمت خاں شہید کے لوحِ مزار پہ ثبت ہے۔
(والی روہیلکھنڈ متوفی ۱۷۷۴ء)

یداللّٰہی کی ترکیب یداللہ سے ماخوذ ہے یداللہ کے معنی ہیں اللہ کا ہاتھ۔ یعنی عاشق صادق کا ہاتھ دراصل اللہ کا ہاتھ ہوجاتا ہے اسی لئے تو اس میں بے پناہ طاقت آجاتی ہے مثلاً جنگ موتہ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں پے در پے نو تلواریں ٹوٹ گئی تھیں لیکن بازو میں کسی قسم کا ضعف پیدا نہیں ہوا تھا۔

الغرض سچا عاشق جرأت رندانہ پیدا کر دیتا ہے اسی بات کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

امیری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

دوسرا شعر:۔ عاشق صادق یا مردِ مومن وہ ہے جو راستہ کی سختیوں کو سامان سفر سمجھے یعنی یہ یقین رکھے کہ عشق میں دشواریاں ضرور آئیں گی اس لئے ان کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرے لیکن افسوس کہ آج کل مسلمان اس قدر تن آسان اور عیش پسند ہو گئے ہیں کہ اس قسم کے مسافر بالکل ناپید ہو گئے ہیں کیا خوب کہا ہے اکبر الہ آبادی نے۔

خدا کی راہ میں دشواریاں سہتے تھے ہم پہلے
کلب میں بیٹھ کر اب عشق قومی میں تڑپتے ہیں

تیسرا شعر:۔ اے کالج کے نادان نوجوان! میں تجھ کو صحرا میں خلوت اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں تو اسے وحشت پر محمول مت کر۔ یاد رکھ! کہسار کی خلوت سے انسان اپنی خودی کی مخفی طاقتوں پر وقوف حاصل کرتا ہے اور یہ خلوت خودی کی تربیت کے سلسلہ میں پہلی اور لازمی منزل ہے۔

چنانچہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت بآسانی واضح ہو سکتی ہے کہ دنیا کی اصلاح کا کام شروع کرنے سے پہلے آپ نے کہسار میں جسے (غارِ حرا) کہتے ہیں خلوت اختیار فرمائی تھی اور اسی لئے جس قدر نامور بزرگانِ دین گزرے ہیں سب نے خلوت کو اپنی پاکیزہ زندگی

کے پروگرام میں نمایاں جگہ عطا کی تھی۔

الحق۔ کہسار میں خلوت گزینی خود آگاہی کے لئے اشد ضروری ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کل ہماری قوم خود آگاہی کی نعمت اور لذت سے یکسر محروم ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تو ہے کہ زندگی میں خلوت مفقود ہے نوجوانوں کی زندگی سرتاپا (لڑکے ہوں یا لڑکیاں) کالج۔ بورڈنگ۔ اسٹیج۔ ادبی انجمنیں محافل رقص و سرود۔ فینسی ڈریس۔ اجتماع۔ کاک ٹیل پارٹی۔ ساحل بحر۔ ہوٹل سینما۔ ٹیلیویژن۔ ریڈیو کے جھگڑوں سے عبارت ہے اور ہر عقلمند آدمی جانتا ہے کہ ان اجتماعات کا نتیجہ خود فراموشی ہے نہ کہ خود آگاہی۔ لیکن میں اس حقیقت کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا کہ اس خرابی کے ذمہ دار ہمارے نوجوان نہیں ہیں بلکہ ان کے والدین ہیں جو ان کو تعلیم دنیاوی کے تیزاب میں ڈال کر اللہ اور رسول دونوں سے بیگانہ بنا دیتے ہیں۔

چوتھا شعر۔ اس شعر میں اقبال نے اسلامی تصوف کا بڑا باریک نکتہ بیان کیا ہے یعنی مومن کی زندگی کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے وہ مومن جو خاص کر اللہ کی خوشنودی کا طالب ہو یعنی اس کا مقصود حیات استرضاء باری تعالیٰ کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔

واضح ہو کہ تسلیم و رضا مومنانہ زندگی کی معراج ہے اس سے اونچا اور کوئی مقام نہیں ہے یہ وہ مقام ہے جہاں اللہ خود مومن سے راضی ہو جاتا ہے اور جس سے اللہ راضی ہو جائے تو ساری کائنات اس کی غلام ہو جاتی ہے یہ مقام رضا سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع سے حاصل ہوتا ہے

اور اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی اسلامی تصوف ہے۔

واضح ہو کہ عشق کی طرح تصوف کی بھی دو قسمیں ہیں ایک تعقلی یا غیر اسلامی تصوف جو انسان کو عمل صالح سے بیگانہ بنا دیتا ہے اصطلاح کل ہماری خانقاہوں میں اس قسم کا تصوف رائج ہے۔ دوسرا اصلی یا اسلامی تصوف جو انسان کو مجاہد بنا دیتا ہے اور اس اعتبار سے سارے صحابہ کرامؓ تصوف میں رنگے ہوئے تھے میں پھر کہتا ہوں کہ اسلامی تصوف مسلمان کو مجاہد بنا دیتا ہے اسی لئے سارے صحابہ کرامؓ مجاہد بن گئے تھے افسوس کہ یہ تصوف آج کل تقریباً ناپید ہو چکا ہے اقبال خود کہتے ہیں۔

ع خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

واضح ہو کہ قرآن مجید کی تعلیمات کی رو سے انسان کا مقصد حیات یہ ہے کہ وہ ایسی زندگی بسر کرے کہ اللہ اس سے راضی ہو جائے اور جب اللہ اپنے بندے سے راضی ہو جاتا ہے تو وہ اس پر اس قدر الطاف کی بارش کرتا ہے کہ بندہ اللہ سے راضی ہو جاتا ہے اور جب دونوں ایک دوسرے سے راضی ہو جاتے ہیں تو اسلامی تصوف کی اصطلاح میں اسے مقام رضا یا مرتبہ اتحاد کہتے ہیں یہ اتحاد غیر اسلامی نہیں یعنی اس اتحاد سے یہ مراد نہیں (جیسا کہ غیر اسلامی تصوف میں ہے) کہ اللہ اور بندہ دونوں متحد الوجود ہو جاتے ہیں یا بندہ اپنی انفرادیت اللہ کی ذات میں غرق کر دیتا ہے یا قطرہ سمندر میں مل کر اپنی ہستی کھو دیتا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں بندہ بندہ ہی رہتا ہے خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے اور اللہ اللہ

ہی رہتا ہے خواہ کتنا ہی تنزل کیوں نہ کرے یعنی ان کی ماہیت بدل سکتی ہے نہ دونوں متحد الوجود ہو سکتے ہیں۔ اللہ خالق ہے۔ بندہ مخلوق ہے یہ امتیاز بہرحال باقی رہتا ہے اتحاد تو ہے مگر جسمانی نہیں۔ وصال تو ہے مگر مادی نہیں۔ اب ایک آیت کلام پاک سے نقل کرتا ہوں۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔

یعنی تو نہ پائے گا کسی قوم کو جو یقین رکھتے ہوں اللہ پر اور آخرت پر کہ دوستی کریں ایسوں سے جو مخالف ہوئے اللہ کے اور اس کے رسول کے خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے یعنی پتھر پہ لکیر کی طرح نقش کر دیا (مٹائے نہیں مٹ سکتا) اور ان کی مدد کی اپنے روحانی فیض سے اور بعد وفات اللہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں یہ لوگ ہمیشہ ان باغوں میں رہیں گے اور سب سے بڑی نعمت یہ کہ) اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔

میں اگر اس آیت کی تفسیر لکھنے کی کوشش کروں تو شاید ایک رسالہ مرتب ہو جائے اس لئے اس جگہ صرف چند اشارات پہ اکتفا کروں گا۔

۱۔ مومن اپنے محبوب حقیقی (اللہ) کو خوش کرنے کے لئے ساری دنیا سے دشمنی مول لے لیتا ہے بلکہ بوقتِ ضرورت جب کفر اسلام کے مقابلہ میں آجائے اپنے باپ بیٹے۔ بھائی سب کو اللہ کے لئے قربان کرسکتا ہے چنانچہ جنگ اُحُد میں حضرت صدیق اکبرؓ۔ عبدالرحمٰن کے مقابلہ میں میدان میں آئے اور اگر وہ ان کی تلوار کی زد میں آجاتے تو صدیق اکبرؓ فرماتے ہیں کہ میں کبھی زندہ نہ چھوڑتا حضرت مصعب بن عمیرؓ نے اپنے حقیقی بھائی عبید بن عمیر کو۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو۔ حضرت علیؓ نے عتبہ کو حضرت سید الشہداء امیر حمزہؓ نے شیبہ کو اور حضرت ابو عبیدہؓ نے ولید کو قتل کیا۔

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے وطن یا نسل یا زن یا رنگ پر نہیں ہے لہٰذا جو لوگ کافروں اور مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

۲۔ چونکہ مومن اللہ کے لئے ساری دنیا سے جنگ مول لے لیتا ہے اور سب سے ناراض ہوجاتا ہے اس لئے اللہ اس کا یہ صلہ دیتا ہے کہ مومن سے راضی ہوجاتا ہے اور جب اللہ کسی سے راضی ہوجائے تو اس بندہ کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

تعلیم مذہبی کا خلاصہ یہی تو ہے
سب مل گیا اسے جسے اللہ مل گیا

۳۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ اصلی چیز رضائے الٰہی ہے تو اقبالؔ کا یہ مصرع بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ۔

ع دنیا ہے روایاتی عقبیٰ سے خدا جانی

یعنی اگر دنیا مقصود ہے تو دنیا والوں کی تقلید کرو اور ان کے طریقوں کو اختیار کرو اگر عقبیٰ مطلوب ہے تو نمازوں کے بعد جنت کی دعائیں مانگو۔ اور جہنم سے پناہ چاہو۔

لیکن عقلمند وہ ہے جو دنیا اور عقبیٰ دونوں کے خالق اور مالک کو کسی طرح راضی کرلے یا اپنا بنالے تو ساری کائنات خود بخود قبضہ میں آجائے گی اور اسے راضی کرنے کی صورت یہ ہے کہ پہلے اس کی تقاضے راضی ہو جائے (جسے اصطلاح میں شیوۂ تسلیم و رضا کہتے ہیں) پھر وہ راضی ہو جائے گا۔

اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ اگر کائنات پر حکومت کرنا چاہتے ہو تو دنیا اور عقبیٰ دونوں سے بلند تر ہو جاؤ۔ اصلی بادشاہت یہ ہے کہ ان دونوں سے بے نیاز ہو کر اللہ کو مقصودِ حیات بنالو۔

(:)

۱۵

آدم کا ضمیر اس کی حقیقت پہ ہے شاہد
مشکل نہیں اے سالکِ رہ علمِ فقیری
فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق
پیدا ہو اگر اس کی طبیعت میں حریری
خود دار نہ ہو فقر تو ہے قہرِ الٰہی
ہو صاحبِ غیرت تو ہے تجریدِ امیری
افرنگ زِ خود بے خبر و کرد و گرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری! تو نذیری

(۵)

۱۵

اس نظم میں اقبال نے فقر کا فلسفہ بڑے دلکش انداز سے بیان کیا ہے اور آخر میں مسلمان کو اعتماد علی النفس کا پیغام دیا ہے جو ان کا محبوب موضوع ہے۔ کہتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ اے مسلمان! تو یہ سمجھتا ہے کہ فقیری کا علم بہت مشکل ہے لیکن تو اس غلط فہمی میں اس لئے مبتلا ہو گیا ہے تو نے کبھی اپنی فطرت

کے اقتضا پر غور نہیں کیا اگر تو غور و فکر سے کام لے تو تجھے معلوم ہو سکتا ہے کہ خود تیرا ضمیر اس کی حقیقت پر گواہی دے رہا ہے یعنی فقر کی حقیقت کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

اس قول کی تشریح یہ ہے کہ فقیری یا فقر کی اصل و بنیاد محبت ہے اور محبت وہ جذبہ ہے جو ہر آدمی کی فطرت میں داخل ہے اگر تو دولتِ فقر سے بہرہ ور ہونا چاہتا ہے تو اس کی صورت بہت آسان ہے تو کسی مرشد کی صحبت اختیار کر لے وہ تیری محبت کو صحیح راستہ پر ڈال دے گا یعنی محبوب حقیقی سے تیرا رابطہ استوار کر دے گا۔

اگر آپ اپنے کمرے کے بلب (Bulb) کو منوّر کرنا چاہتے تو کسی مستری کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں وہ آپ کے بلب کو بجلی کے تاروں سے مربوط (connect ...) کر دیتا ہے فوراً بلب منوّر ہو جاتا ہے اسی طرح مرشد قلبِ انسانی کو جو محبت کا مرکز ہے اللہ سے مربوط کر دیتا ہے اور قلب مذکور منوّر ہو جاتا ہے۔

اگر علم فقیری کا مفہوم وصول الی اللہ قرار دیا جائے تو اس شعر کا مطلب یہ ہو گا کہ شانِ فقر پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ اللہ فرماتا ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اللہ کسی نفس (آدمی) کو اس کی استطاعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا یعنی ایسی ذمہ داری اس پر عاید نہیں کرتا جس سے عہدہ برآ ہونا اس کے لئے ممکن نہ ہو۔

اس اصل کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ جس طرح

فقر کی حقیقت کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے اسی طرح خود اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرنا بھی مشکل نہیں ہے کیونکہ اللہ کسی ایسے کام کا حکم نہیں دیتا جس کا کرنا طاقت بشری سے باہر ہو۔

لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ فقیری یعنی شانِ فقر پیدا کرنا جسے تصوّف کی اصطلاح میں وصول الی اللہ کہتے ہیں بہت مشکل ہے حالانکہ یہ بات مشکل نہیں ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ محبت کی دو قسمیں ہیں ایک محبتِ نفسانی جو غیر اختیاری ہے اور شریعت میں نہ اس کی کوئی قدر و قیمت ہے نہ اس سے بحث کی جاتی ہے کیونکہ شریعت امورِ غیر اختیاری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اس کی مثال یہ ہے کہ فرض کیجئے زید کے چار بیٹے ہیں وہ سب سے چھوٹے بیٹے سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے تو یہ حُبِّ نفسانی ہے شریعت میں اس کا کوئی اعتبار نہیں اور نہ اس پر کوئی ثواب مرتب ہوتا ہے اور نہ اس کے ترک پر کوئی مواخذہ ہوگا۔ غالب نے اس شعر میں اسی حبِّ نفسانی غیر اختیاری کا نقشہ کھینچا ہے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

دوسری محبت حُبِّ عقلی یا حبِّ ایمانی ہے اور یہ اختیاری ہے صفت عقلی کی قید ہی اس کے اختیاری ہونے پر شہادت دے رہی ہے اس کی بنیاد اس آیت پر ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ یعنی مومنوں کی شناخت یہ ہے کہ انہیں اللہ سے اشد درجہ کی محبت ہوتی ہے جس کے سامنے کسی قسم کی

محبت کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔

چونکہ یہ وہ محبت ہے جو مومن کو اللہ کے ساتھ ہوتی ہے اس لئے تصوف کی اصطلاح میں اُسے حبِ ایمانی کہتے ہیں یعنی وہ محبت جو ایمان کی بدولت پیدا ہوتی ہے اور چونکہ یہ محبت سب محبوبوں کی خوبیاں پرکھنے اور جانچنے کے بعد اختیار کی جاتی ہے اس لئے اسے حبِ عقلی بھی کہتے ہیں اور چونکہ یہ محبت غور و فکر کے بعد اختیار کی جاتی ہے اس لئے اختیاری ہے۔

مومن پہلے اپنی عقل سے کام لیتا ہے اور اس فیصلہ پر پہنچتا ہے کہ میری محبت کا مرجع ذاتِ خداوندی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ باقی محبوب تو سب فانی ہیں اور فانی سے دل لگانا حماقت ہے۔

اس حبِ ایمانی میں کامیابی کا راستہ اللہ نے خود بتا دیا ہے کہ میرے رسول برحق تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو۔

الغرض وہ محبت جو نفسانی یعنی غیر اختیاری ہے مطلوب نہیں اور جو محبت مطلوب ہے وہ اختیاری ہے اور اس کے حصول کی ترکیب بھی اختیاری ہے اور جو ترکیب اختیاری ہوتی ہے وہ مشکل نہیں ہو سکتی مشکل تو وہ ہے جو اختیاری نہ ہو مثلاً زید سے کہا جائے کہ بندہ سے محبت کرو تو یہ محبت مشکل ہے کیونکہ بندہ سے محبت زید کے اختیار میں نہیں ہے مثل مشہور ہے کوئی شخص کسی سے زبردستی محبت نہیں کر سکتا۔

اب اس اختیاری محبت کی ترکیب کے تین اجزائے ہیں اور تینوں اجزا بھی اختیاری ہیں۔

۱۔ اعمال صالحہ اس نیت سے کہ محبت استوار ہو جائے۔
۲۔ ذکر یا یادِ محبوب ہر حال میں اور ہر وقت اور ہر جگہ۔ عارف جامی نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

سررشتہ دولت اے برادر یکف آر
دیں عمر گرامی بخارت مگذار
دائم ہمہ جا۔ یا ہمہ کس در ہمہ کار
میدار نہفتہ چشم دل جانب یار

۳۔ ان لوگوں سے تعلق پیدا کرنا جو اللہ سے محبت پیدا کرتے ہیں۔

پہلی بات کا مطلب ہے اللہ کے محبوب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع بلا چون وچرا۔ نہ کہ کسی امام کی تقلید کرنا۔

دوسری بات کا مطلب ہے دنیا میں رہ کر سارے دنیاوی امور انجام دینا لیکن اس طرح کہ دھیان ہر حال میں اسی کا رہے غیر کی محبت پیدا ہی نہ ہونے پائے۔

تیسری بات کا مطلب ہے۔ کسی باعمل مرشد کی صحبت میں بیٹھنا جو اس محبت کو پختہ کر دے یعنی ایسا پختہ رنگ چڑھا دے کہ کبھی اتر نہ سکے۔

دوسرا شعر:۔ دوسرے شعر میں اقبال حقیقت فقر کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر فولاد کی طبیعت میں نرمی اور نزاکت پیدا ہو جائے تو پھر اس سے شمشیر نہیں بن سکتی یعنی وہ بیکار ہو جائے گا۔ فولاد کو واضح نے اس لئے وضع کیا ہے کہ اس سے تلوار بنائی جاتی ہے لیکن اگر وہ

اپنے اندر صلابت کی جگہ نزاکت پیدا کرے تو پھر اس کی تخلیق کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا اسی طرح اللہ نے بنی آدم کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اپنی خودی کو اتباعِ نبویؐ سے مضبوط اور مستحکم کریں تاکہ خلافت کے مرتبہ پر پہنچ سکیں لیکن اگر کوئی شخص ترکِ اتباعِ رسولؐ سے اپنی خودی کو ضعیف اور ناتواں کرے تو پھر وہ خلافت کے منصب پہ فائز نہیں ہو سکتا بالفاظِ دگر اس نے اپنی تخلیق کے مقصد ہی کو نہیں سمجھا۔ لہٰذا وہ مرتبۂ انسانیت سے گر ہی جائے گا اور اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ[1] کا مصداق ہو جائے گا۔

غرض اگر مسلمان اپنے اندر شانِ فقر پیدا نہ کرے تو وہ اپنی تخلق کے منشا کو کبھی ہرگز پورا نہ کر سکے گا یہ ہے علم فقیری کی حقیقت۔

تیسرا شعر:۔ اگر فقر میں خودداری یعنی دین کے لئے غیرت نہ ہو تو وہ فقر نہیں ہے بلکہ قہرِ الٰہی ہے لیکن اگر اس میں یہ جوہر موجود ہو تو بلاشبہ وہ فقیر دنیا میں مومن کے لئے سربلندی اور امیری کی بنیاد بن جاتا ہے۔

اقبال نے یہ صراحت اس لئے کی کہ مسلمانوں میں فقر کا ایک غلط مفہوم بھی تو مروج ہے یعنی اکثر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ فقر ترکِ دنیا اور مسکینی یا عاجزی اور مفلسی کا نام ہے یہ غلط خیال ہندو جوگیوں کے اثر سے پیدا ہوا ہے اسلام جس فقر کا داعی ہے وہ خانقاہی نہیں بلکہ یداللّٰہی ہے۔

---

[1] ایسے لوگ حیوانات کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ تر۔

اس نکتہ کی وضاحت کے لئے اس جگہ صرف ایک شعر لکھتا ہوں

فقر کافر خلوتِ دست و دراست

فقر مومن لرزۂ بحر و بر است

اقبالؔ نے مثنوی۔ پس چہ باید کرد" میں اس مبحث پر تفصیلی گفتگو کی ہے اس جگہ صرف اسی قدر وضاحت کافی ہے۔

چوتھا شعر:۔ آخری شعر میں اقبالؔ نے ایک عظیم الشان حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! یہ جو تو مسکینی اور ذلت کی زندگی بسر کر رہا ہے یعنی غلامی کی زندگی اس کا باعث صرف یہ ہے کہ تجھے انگریزوں نے اس عداوت کی بناء پر جو انہیں اسلام سے ہے تیرے مقام سے بیگانہ کر دیا ہے اور تجھے تیری خودی کی مخفی طاقتوں سے غافل بنا دیا ہے انہوں نے تیرے لئے ایسا نصاب تعلیم مدوّن کیا ہے کہ تو اپنی حقیقت سے بالکل بے خبر ہو گیا میں انگریزوں کے قائم کردہ اس طلسم کو توڑنا چاہتا ہوں۔

علامہ مرحوم نے اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر اپنی ایک رباعی میں خود اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ میری شاعری کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں انگریزوں کے قائم کردہ اس طلسم کو باطل کر دوں چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

طلسمِ عصرِ حاضر را شکستم

ربودم دانہ و دانش گسستم

خداوندا! کہ مانند براہیم

بنارِ او چہ بے پروا نشستم

(ارمغان حجاز)

سن! تو اس لئے نہیں پیدا کیا گیا کہ انگریزوں کی یا کسی قوم کی غلامی کرے۔ اے مسلمان! تو "برطانیہ کا یار وفادار[1]" نہیں ہے بلکہ تو "بشیر اور نذیر" ہے یعنی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے لئے بشیر اور نذیر ہیں اور تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہے اس لئے اگر تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کر کے اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگین کرے تو قدرتی طور سے تیرے اندر بھی بشیری اور نذیری کی شان پیدا ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آج جو تیرے آقا ہیں وہ تیرے غلام بن جائیں گے۔

بشیر کے معنیٰ ہیں مومنوں کو خوش خبری سنانے والا۔

نذیر کے معنیٰ ہیں کافروں کو عذاب سے ڈرانے والا۔

یہ ہمارے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی صفات ہیں اور چونکہ ان صفات کے اظہار کے لئے طاقت کا ہونا لازمی ہے اس لئے مسلمان پر فرض ہے کہ وہ طاقت پیدا کرے تاکہ تبشیر اور انذار کا فرض انجام دے سکے بالفاظ دگر لوگوں کو نیکی کا حکم دے سکے اور برائی سے روک سکے اس اصول کی تفہیم کے لئے اس آیت پر غور کیجئے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ اے مسلمانو! تم تمام اقوام عالم کے سردار ہو تم کو

---

[1] اس جملہ سے میری مراد وہ یار وفادار ہے جو آج کل "راج پرکھ" کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہے۔

بنی آدم کی اصلاح کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور تمہارا فرض منصبی یہ ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم کروگے اور برائی سے باز رکھوگے۔

اب ناظرین اس آیت کی روشنی میں اقبال کی تعلیم کی صداقت بھی معلوم کرسکتے ہیں۔ اور یہ بھی ہے کہ کیا ہم اس آیت کے مصداق ہوسکتے ہیں۔

۱۶

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی
جو فقر ہوا تلخیٔ دوراں کا گلہ مند
اس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی
اس دور میں بھی مردِ خدا کو ہے میسّر
جو معجزہ پربت کو بنا سکتا ہے رائی
در معرکہ بے سوزِ تو ذوقے نتواں یافت
اے بندۂ مومن تو کجائی؟ تو کجائی
خورشید! سرا پردۂ مشرق سے نکل کر
پہنا مرے کہسار کو ملبوسِ حنائی

۱۶

اس غزل میں اقبالؔ نے فقر کے بعض گوشوں کو بے نقاب کیا ہے پہلا شعر قوم کی خاص توجہ کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں کہ

پہلا شعر:۔ جو قوم مرکز سے جدا ہو جاتی ہے وہ بحیثیت قوم یقیناً فنا ہو جاتی ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس کے افراد دیگر حیوانات عالم بقر۔ گائے فرس۔ گھوڑا۔ حمار۔ گدھا کی طرح علم الحیوٰۃ کے زاویۂ نگاہ ۔۔۔۔۔۔ (Biological Point of view) سے زندوں میں شمار کئے جا سکیں۔

مرکز سے وابستگی قوم کے حق میں ایسی ہے جیسے اوراق کتاب کے لئے شیرازہ ٹوٹ جائے تو اوراق منتشر ہو جاتے ہیں اور چند روز کے بعد کتاب معدوم ہو جاتی ہے اسی طرح افراد قوم مرکز سے جدا ہو جائیں تو بلا مبالغہ قوم منتشر ہو جاتے ہیں اور دنیا میں ان کی کوئی وقعت یا قدر و قیمت باقی نہیں رہتی وہ بآسانی دوسری قوم کے غلام بن جاتے ہیں۔

اور اگر اس قوم کے ہر فرد کی خودی کسی مرکز معین سے خواہ وہ محسوس ہو یا غیر محسوس ہو اور وہ وابستہ ہو جائے بالفاظ دگر اس قوم کی زندگی میں اجتماعی خودی کا رنگ پیدا ہو جائے اور وہ اجتماعی خودی کسی مرکز سے مربوط ہو جائے (اجتماعی خودی سے میری مراد یہ ہے کہ پوری قوم میں وحدت افکار و کردار پیدا ہو جائے) تو اس خودی میں خدائی صفات کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے یعنی وہ قوم دنیا میں حکمراں۔ فرمانروا۔ سربلند اور معزز ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ خودی (EGO) کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ انفرادی خودی (INDIVIDUAL EGO) مثلاً زید کی خودی یا ہندہ کی خودی۔

۲۔ اجتماعی خودی (COLLECTIVE EGO) کسی قوم کے افراد کا تصوّرات و افکار کے اعتبار سے ایسا ہم آہنگ ہو جانا کہ سب افراد ایک ہو جائیں ہر فرد کا مقصد وہی ہو جو دوسروں کا ہے یعنی پوری قوم کی صرف ایک ہی خودی نظر آنے لگے۔ مثلاً روس کی خودی۔

چیست ملّت؟ اے کہ گوئی لَآ اِلٰہ
با ہزاراں چشم بودن یک نگہ

نوٹ:۔ آج تمام دنیا کے اشتراکیوں کی خودی خواہ وہ روس میں رہتے ہوں یا ہندوستان میں ایک ہو گئی ہے یعنی ان کے اندر اجتماعی خودی پیدا ہو گئی ہے۔

۳۔ کائناتی خودی (UNIVERSAL EGO) یعنی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات جس کے بغیر اس کائنات کی یا اس کی کسی سے کی کوئی قدر و قیمت ہی معین نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خودی کائنات اور مافیہا کی قدر و قیمت کا معیار ہے۔

اسی حقیقت کو اقبالؔ نے اپنے رنگ میں یوں بیان کیا ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نور مصطفٰے او را بہا است
یا ہنوز اندر تلاش مصطفٰے است (جاوید نامہ)

قرآن مجید نے اسی اجتماعی خودی کی اہمیت کو اس آیت سے واضح فرمایا ہے۔
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ اے مسلمانو! تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو اور آپس میں تفریق مت پیدا کرو (کیونکہ تفریق توحید کی ضد ہے) یعنی پھوٹ مت ڈالو۔ (آل عمران آیت ۱۰۳)

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے کہ تم سب مل کر قرآن کو مضبوط تھامے رہو جو خدا کی مضبوط رسی ہے یہ رسی ٹوٹ تو نہیں سکتی۔ ہاں چھوٹ سکتی ہے اگر تم سب مل کر اس کو پوری قوت سے پکڑے رہو گے تو کوئی شیطان (مثلاً انگریز) اپنی شر انگیزی میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اور انفرادی زندگی کی طرح مسلم قوم کی اجتماعی زندگی یا قوت بھی غیر متزلزل اور ناقابل اختلال ہو جائے گی۔ قرآن کریم سے تمسک کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے بکھری ہوئی قوتیں جمع ہوتی ہیں اور ایک مردہ قوم حیات تازہ حاصل کرتی ہے لیکن تمسک بالقرآن کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن حکیم کو اپنی آرا کا تختۂ مشق بنا لیا جائے بلکہ قرآن کریم کا وہی مطلب بہتر ہو گا جو احادیث صحیحہ اور سلف صالحین کی متفقہ تصریحات کے خلاف نہ ہو۔

نوٹ:۔ آج ہندوستان و پاکستان بلکہ سارے عالم میں مسلمانوں کی ذلت اور رسوائی۔ غلامی اور محکومی کا باعث یہی فقدان مرکز تو ہے کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جس قوم کو اللہ نے ایک چھوڑ تین مرکز عطا فرمائے ہوں

وہ قوم آج دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل و خوار ہے۔ سب سے زیادہ جاہل ہے اور سب سے زیادہ بدکاریوں میں مبتلا ہے۔

۱۔ مسلمانوں کا پہلا مرکز مادی اور محسوس ہے جس کا نام خانہ کعبہ ہے اس میں یہ نکتہ ہے کہ قوم میں ہر شخص ذہنی اعتبار سے بلند نہیں ہوتا اس لئے اللہ نے عامۃ الناس کی رعایت ملحوظ فرما کر ایک مرکز ایسا عطا کیا جو آنکھوں سے بھی نظر آسکتا ہے اور اسے چھو بھی سکتے ہیں۔

۲۔ دوسرا مرکز غیر مادی ہے مگر محسوس ہے جس کا نام قرآن حکیم ہے یہ کلام پاک اس لحاظ سے کہ اللہ کا کلام ہے غیر مادی ہے لیکن اس لحاظ سے کہ کاغذ پر مرقوم ہے۔ محسوس ہے تاکہ عامی اور عالم دونوں اس مرکز سے وابستہ ہو سکیں۔

۳۔ تیسرا مرکز وہ ہے جو غیر مادی ہے اور غیر محسوس ہے اور چونکہ مسلمان کی زندگی اس پر موقوف ہے اس لئے وہ اس سے جدا نہیں ہے بلکہ اس کے دل میں موجود ہے۔ کما قال اقبالؔ ؎

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما زنامِ مصطفیٰ است

اَللّٰھُمَّ صَلِّ علیٰ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا

اگر مرکزِ اصلی سے وابستگی نہ ہو تو نہ تلاوتِ قرآن حکیم سے کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے نہ طواف خانہ کعبہ سے اسی لئے تو اقبالؔ نے ارمغان حجاز میں یہ کہا تھا۔

مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

یہ بے مرکزی ہی کا تو نتیجہ ہے کہ ہم اگرچہ تعداد میں پچاس کروڑ سے زیادہ ہیں لیکن "اینگلو امریکن بلاک" کے گھوڑے کی دم سے بندھے ہوئے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ اگر کوئی شخص فقر کا مدعی ہو اور اس کے باوجود دنیا کی مصیبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت نہ کر سکے تو یقین جانو کہ وہ شخص اپنے دعویٰ میں کاذب اور جھوٹا ہے یعنی اس کے اندر شانِ فقر پیدا نہیں ہوتی ہے۔

اقبالؔ نے گدائی کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ بظاہر صاحب فقر اور گدا دونوں یکساں ہیں یعنی صاحب فقر بھی فقیر ہوتا ہے اور گدا بھی فقیر ہوتا ہے دونوں کے پاس دولت ثروت اور ظاہری شان و شوکت نہیں ہوتی مثلاً گدا یعنی عرف عام میں فقیر کے کرتے میں بھی پیوند لگے ہوئے ہوتے ہیں اور فاروق اعظم رضؓ کے کرتے میں پیوند لگے ہوتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ گدا دولت کا متمنی ہوتا ہے اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے اگر صاحبِ فقر یعنی اصطلاحی فقیر دولت کو پائے استغنا سے ٹھکرا دیتا ہے وہ اس کے سامنے دست بستہ حاضر ہوتی ہے لیکن وہ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ گدا محتاج ہوتا ہے صاحب فقر محتاج نہیں ہوتا پس جو فقیر تلخیٔ دوراں کی شکایت کرے وہ صاحب فقر نہیں ہے۔ بلکہ

گدا ہے۔

تیسرا شعر:۔ اے مخاطب! یہ مت سمجھ کہ اب اللہ کے قانون میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے یا اب فقر کے معجزات ختم ہو گئے ہیں اس دور میں بھی اگر کوئی شخص سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کرے تو اس میں یہ طاقت پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ پربت کو رائی بنا سکتا ہے یعنی اپنے زمانہ کے فرعونوں کو زیر کر سکتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ حقیقت یہ ہے کہ حق و باطل کے معرکوں میں جب تک مرد مومن اپنے سوز دروں سے مجاہدوں کے قلوب کو نہ گرمائے اس وقت تک اس معرکہ میں وہ ذوق و شوق پیدا نہیں ہو سکتا جو مجاہدوں کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے اس لئے محراب گل اللہ سے دعا کرتا ہے کہ وہ اس زمانہ میں بھی مسلمانوں کی سربلندی کے لئے کسی مومن کو پیدا کر دے۔

نوٹ:۔ ذوقے۔ میں یائے تخصیصی ہے یعنی ایک خاص قسم کا ذوق (ی) کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً یائے تخصیصی۔ یائے تنکری۔ یائے توصیفی یائے نسبتی وغیرہ۔

پانچواں شعر:۔ اس شعر میں محراب گل عالم تصور میں اسی مرد مومن سے جس کے ظہور کی اس نے گذشتہ شعر میں تمنا کی ہے خطاب کرتا ہے کہ اے بندۂ مومن کسی مشرقی ملک سے ظہور کر اور میرے کوہستانی علاقہ کو سرخ رنگ کا لباس پہنا دے! یعنی معرکۂ کارزار گرم کر دے۔

نوٹ:۔ سرخ رنگ سے آفتاب کی روشنی بھی مراد ہو سکتی ہے

اور خونِ شہید بھی مراد ہو سکتا ہے۔

(٭)

۱۷

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو
لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحبِ یقین
ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی
وہ مرد جس کا فقر خزف کو کرے نگیں
تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں
یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں
بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں
زیرِ پر آگیا تو یہی آسماں زمیں

(٭)

۱۷

اس نظم میں محراب گل نے (فقر) کی صفات بیان کی ہیں۔

پہلا شعر:۔ لاکھوں انسانوں میں اگر ایک شخص بھی صاحب یقین یعنی صاحبِ فقر ہو تو وہ تن تنہا اس پوری جماعت میں جہاد کا ولولہ پیدا کر دیتا ہے جوان اور بوڑھے سب اللہ تعالیٰ کی راہ میں سر کٹانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ لیکن اس خوبی کا انسان کہیں صدیوں میں جاکر پیدا ہوتا ہے جو اپنی صحبت سے خزف یا ٹھیکری (دنیا پرست) کو نگیں (خدا پرست) بنا دے۔

تیسرا شعر:۔ اے مخاطب! تو یہ سمجھتا ہے کہ خدا نے تیری تقدیر اپنے قلم سے تیری پیشانی میں لکھ دی ہے لیکن اگر تو اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرے تو یہ ممکن ہے کہ تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ سکے یعنی اللہ نے تجھے مجبور محض بنا کر دنیا میں نہیں بھیجا ہے بلکہ تجھے ترقی کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے اگر تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے تو کامیابی تیرے قدم چوم سکتی ہے۔

نوٹ:۔ راقم الحروف کی والدہ صاحبہ مرحومہ اللہ انہیں جنت عطا

فرمائے کلام اقبال کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ فرمایا کرتی تھیں اقبال کی کوئی نہ کوئی کتاب ہمیشہ ان کے سرہانے رکھی رہا کرتی تھی۔ اکثر اس خام کار اور کم سواد سے فرمایا کرتی تھیں کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کے کلام میں سب سے بڑی خوبی یہی نظر آتی ہے کہ وہ مسلمانوں کو عمل کی تلقین کرتے ہیں، انسان کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ تقدیر کا بہانہ صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو درحقیقت عمل سے نفور ہیں۔ انسان اگر کوشش کرے تو کامیابی یقینی ہے اللہ کسی محنتی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا۔

چوتھا شعر:۔ آسمان تک پہنچنا بظاہر ناممکن نظر آتا ہے لیکن اگر انسان ہمت سے کام لے تو آسمان تک پہونچ سکتا ہے یعنی ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔

اس شعر کا لفظی مطلب مراد نہیں ہے بلکہ اقبال کا مقصد اس سے یہ ہے کہ ہمت کی قدر و قیمت مسلمانوں کے ذہن نشین ہو جائے۔ واضح ہو کہ ہمت اتنی بڑی چیز ہے کہ تصوّف میں سالک کی روحانی ترقی کا سارا دارومدار اسی ہمت پر ہے اور شیخ کی صحبت میں رہنے سے یہی تو فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ مرید میں ہمت سے کام لینے کی صلاحیت بیدار ہو جاتی ہے۔ شیخ کی توجہ اس نکتہ پر مرکوز ہوتی ہے کہ سالک اپنی ہمت سے کام لے کر روحانی مدارج طے کر سکے۔

پانچواں شعر:۔ جب تک آدمی ہمت سے کام نہیں لیتا مقام فقر اُسے بہت اونچا نظر آتا ہے یعنی وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس مقام کا حصول بہت دشوار ہے لیکن جب وہ ہمت سے کام لیتا ہے تو وصول اللہ آسان ہو جاتا ہے

یہ نکتہ اس آیت سے ماخوذ ہے۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔ اور جو لوگ ہم تک پہنچنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں (اور جدوجہد ہمت کے بغیر ممکن نہیں) تو البتہ ضرور بالضرور ہم ان کو اپنے پاس پہونچنے کی راہیں دکھاتے ہیں۔ (سورہ عنکبوت آیت ۶۹)

یعنی جو لوگ مجاہدات میں سرگرم رہتے ہیں اللہ ان کو ایک خاص نور بصیرت عطا فرماتا ہے اور اپنے قرب کی راہیں سمجھاتا ہے۔



یہ نکتہ خوب کہا شیر شاہ سوری نے
کہ امتیازِ قبائل تمام تر خواری
عزیز ہے انہیں نامِ وزیری و محمود
ابھی یہ خلعتِ افغانیت سے ہیں عاری
ہزار پارہ ہے کہسار کی مسلمانی
کہ ہر قبیلہ ہے اپنے بتوں کا زُنّاری
وہی حرم ہے وہی اعتبارِ لات و منات
خدا نصیب کرے تجھ کو ضربتِ کاری



۱۸

اس نظم میں محراب گل نے قبائلی امتیاز کی برائیاں بیان کی ہیں۔ واضح ہو کہ اسلام نے ہر قسم کے باطل امتیازات (قومی۔ وطنی۔ نسلی۔ لسانی۔ لونی اور قبائلی) کو مٹا کر صرف ایک امتیاز قائم کیا ہے۔ یعنی اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ۔ اے مسلمانو! بزرگی یا فضیلت کا صرف ایک معیار ہے اور وہ نہ قومی ہے نہ نسلی۔ نہ لسانی۔ نہ قبائلی۔ بلکہ وہ یہ ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ مکرم اور معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

محراب گل نے شیر شاہ سوری کا نام اس لئے لیا کہ اس دیندار درویش صفت علم دوست اور سچے مسلمان نے جس کے کارناموں سے آج کل کے تعلیم یافتہ مسلمان بہت کم واقف ہیں ہمیشہ مسلمانوں کو وحدتِ ملی کا درس دیا مجھے افسوس ہے کہ میں اس کتاب میں اس عادل بادشاہ کے کارناموں کو مفصل طور پر بیان نہیں کر سکتا صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اگر اس نامور فرمانروا کے جانشین بھی اسی کی طرح قابل اور حوصلہ مند ہوتے تو ہمایوں۔ اکبر۔ اور جہانگیر کو ہندوستان میں شعائر اسلامی کی تحقیر کا موقع ہرگز نہ ملتا۔

نوٹ:۔ اگر اللہ نے مجھے توفیق دی تو میں طلبہ کے لئے ہندوستان

کی تاریخ اپنے نادیدہ نگاہ سے لکھوں گا جس میں بادشاہوں کے ساتھ ساتھ بزرگانِ دین اور علمائے حق کے کارنامے بھی قلمبند کروں گا اور ان تمام غلط بیانیوں کی تردید کروں گا جو انگریز اور ہندو مورخین نے تاریخ ہند خصوصاً مسلمانوں کے دورِ حکومت میں روا رکھی ہیں اور جن کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے نفرت پیدا ہو جائے اور مسلمان حق و صداقت سے آشنا نہ ہو سکیں۔ وَمَا تَوْفِیقِی اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم۔

پہلا شعر:۔ سلطان شیر شاہ سوری ۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء نے اپنی قوم کے افراد کو کیا اچھا نکتہ سمجھایا کہ اگر تم قبائلی امتیاز روا رکھو گے تو دنیا میں ہرگز ترقی نہ کر سکو گے۔

دوسرا شعر:۔ لیکن افسوس کہ افغانوں نے اس نکتہ کو ذہن نشین نہ کیا چنانچہ وہ ابھی تک افغان کے بجائے وزیری اور آفریدی محسود اور مہمندی کے لقب کو محبوب رکھتے ہیں اور ہر قبیلہ اپنے سامنے دوسرے قبائل کو کمتر سمجھتا ہے جس کا نتیجہ باہمی رقابت کے سوا کچھ نہیں ہے اور اسی لئے یہ مختلف قبائل رات و دن آپس میں برابر برسرِ پیکار رہتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ ہر قبیلہ اپنے آپ کو اور اپنے مورثِ اعلیٰ کے نام کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہے گویا قبیلہ کا نام ان لوگوں کی نظر میں بت کا مرتبہ رکھتا ہے جس کی پرستش میں یہ لوگ سرگرم ہیں۔

چوتھا شعر:۔ اندریں حالات ان لوگوں کی معاشرتی زندگی اسی نوعیت کی ہے جیسی کہ جاہلیت کے زمانہ میں عربوں کی تھی ظہورِ اسلام سے پہلے عربوں کے ہر قبیلہ کا بت جداگانہ اور الگ الگ تھا۔ اسی طرح آج سرحد کے قبائل بھی اپنے بتوں کی پرستش کر رہے ہیں۔

اس لئے محراب گل دعا کرتا ہے کہ خدا کرے کوئی مردِ مومن ایسا پیدا ہو جائے جو سرحدی علاقہ کے لات و منات کو توڑ کر افغانوں کو ازسرِ نو مسلمان بنا سکے۔

(:)

۱۹

نگاہ وہ نہیں جو سرخ و زرد پہچانے
نگاہ وہ ہے کہ محتاجِ مہر و ماہ نہیں
فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اٹھا! یہ مقام انتہائے راہ نہیں
کھلے ہیں سب کے لئے غربیوں کے میخانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں
اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوزِ لَا اِلٰہ نہیں
سنیں گے میری صدا خانزادگانِ کبیر
گلیم پوش ہوں میں صاحبِ کلاہ نہیں

۱۹

اس غزل میں محراب گل یعنی اقبالؔ نے بعض حقائق و معارف بیان کئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:۔

پہلا شعر:۔ نگاہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نگاہ تو وہ ہے جس کی مدد سے ہم مختلف رنگوں میں امتیاز کرتے ہیں یعنی ظاہری نگاہ جو عامی اور عالم دونوں کے پاس ہے یہ نگاہ بھی ضروری ہے کیونکہ مادی ترقی تمام تر اسی نگاہ پر موقوف ہے لیکن انسان صرف مادی نہیں ہے وہ اس سے بالاتر ایک حقیقتِ روحانی بھی تو ہے اس لئے اسے وہ نگاہ بھی پیدا کرنی لازم ہے جو دیکھنے کے لئے محتاج مہر و ماہ نہ ہو۔ اور اقبال کی رائے میں حقیقی نگاہ وہی ہے جو مادی وسائل مذکورہ بالا کی محتاج نہ ہو یعنی اسلام ایسا پاکیزہ صالح نظامِ حیات ہے کہ انسان کے اندر ظاہری نگاہ کے علاوہ باطنی نگاہ بھی پیدا کر دیتا ہے اور اقبالؔ اپنی قوم سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ نگاہ پیدا کرو جو روشنی یا وسائل خارجی کی محتاج نہ ہو یعنی دل کی نگاہ جو فقر کی بدولت پیدا ہو سکتی ہے۔ تاریخ اسلام میں اس کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں چنانچہ فاروق اعظمؓ نے اسی نگاہ کی بدولت مدینہ منورہ کی مسجد میں بیٹھے بیٹھے اپنی ان فوجوں کو دیکھ

دیکھ لیا تھا جو ملک شام میں کافروں سے برسرِ پیکار تھیں۔

واضح ہو کہ یہ نگاہ صرف مرشد کی صحبت سے پیدا ہو سکتی ہے اور کوئی صورت نہیں ہے قانون قدرت یہی ہے کہ چراغ صرف چراغ سے جل سکتا ہے اسی لئے اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں ہر جگہ صحبتِ مرشد کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

نوٹ:۔ میری رائے میں یہ ہماری قومی ٹریجڈی ہے وہ سانحہ جس کا شکار پوری قوم ہو چکی ہے کہ آج ہماری قوم کے مصلحین وہ بزرگ ہیں۔ جو مسند اصلاح پر وہ لوگ جلوہ فرما ہیں جو خود محتاجِ اصلاح ہیں کیا ستم ظریفی ہے کہ جنہوں نے خود کسی مصلح کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی وہ دوسروں سے بیعت لے کر انہیں صالحیت کا سرٹیفکٹ عطا کر رہے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ اے مسلمان تیری منزل کفار فرنگ خصوصاً انگریزوں سے بہت آگے ہے ان کی معراج تو بس یہی مادی ترقی ہے۔ ریڈیو لاسلکی۔ سینما۔ ٹیلویژن وغیرہ وغیرہ لیکن تو خلیفۃ اللہ علی الارض ہے اس لئے قدم اٹھا اور تسخیر کائنات کے بعد اس روحانی مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کر۔

تیسرا شعر:۔ آج پاکستان اور دیگر اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کے اندر مغربی علوم و فنون عام طور سے مروج ہیں اور ان کا حاصل کرنا بھی گناہ نہیں ہے۔

چوتھا شعر:۔ لیکن اگر مسلمانوں کے دلوں میں توحید کا عقیدہ

راسخ نہیں ہے تو پھر اس میں شک نہیں کہ یہ علوم و فنون ان کی گمراہی کا سبب بن جائیں گے پس مسلمانوں کو لازم ہے کہ پہلے اپنے عقیدۂ توحید کو درست کریں اور قبروں اور پیروں کی پرستش چھوڑیں پھر مغربی علوم کو شوق سے پڑھیں

پانچواں شعر:۔ چونکہ میں دنیاوی اعتبار سے بڑا آدمی نہیں ہوں۔ نہ وزیر ہوں۔ نہ سفیر ہوں یعنی صاحب کلاہ نہیں ہوں بلکہ محض گلیم پوش درویش ہوں اس لئے مجھے یقین نہیں کہ سرحد کے خوانین اور خوانین زادے میری باتوں پر توجہ کریں گے۔

بات بھی ٹھیک ہے آج مسلمانوں کی ظاہر پرستی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی بڑا آدمی خواہ وہ بذات خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دور کی نسبت بھی نہ رکھتا ہو کسی پرفضا پارک میں میلاد النبی کے جلسہ میں حضور پاکؐ کے اسوۂ حسنہ پر تقریر کرنے آجائے۔ اس اسوۂ حسنہ پر جس کو وہ خود کبھی اپنے سامنے نہیں رکھتا ہو تو ہزاروں مسلمان اس کی تقریر دلپذیر سننے کے لئے جمع ہو جائیں گے لیکن وہی بات اور وہی مضمون اگر کوئی گلیم پوش ملّا محلہ کی مسجد میں بیان کرے تو کوئی صاحب اسے سننے کے لئے اپنے ڈرائنگ روم سے نکل کر اس مسجد تک نہیں آئیں گے یعنی آج کل بات کو نہیں دیکھتے بلکہ بات کہنے والے کو دیکھتے ہیں۔

۲۰

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی!
دنیا میں محاسب ہے تہذیب فسوں گر کا
ہے اس کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی!
یہ حسن و لطافت کیوں؟ وہ قوت و شوکت کیوں؟
بلبل چمنستانی شہباز بیابانی!
اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی
صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا
تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی

۳۰

اس آخری نظم میں محراب گل نے شہری زندگی کے مقابلہ میں بدوی یا صحراوی زندگی کی فضیلت ثابت کی ہے۔

اس تفوق سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ شہری زندگی بیکار یا گری پڑی ہے۔ نہیں یہ زندگی بھی اپنے اندر بعض خوبیاں رکھتی ہیں لیکن اس کی برائیاں خوبیوں سے زیادہ ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ حکومت کرنے اور غالب آنے کے لئے شہری زندگی سے بدوی زندگی زیادہ موزوں ہے کیونکہ شہری زندگی میں تمدن اور معاشرت کے اندر ایسے عناصر لازمی طور سے داخل ہو جاتے ہیں جو انسان کی سیرت کو تباہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً ریڈیو۔ ٹیلویژن۔ سینما رقص خانے۔ کلب۔ ہوٹل اور گھوڑ دوڑ جو بالواسطہ یا بلا واسطہ فحاشی کے مرکز ہیں لیکن بدوی زندگی ان جراثیم سے پاک ہوتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ شہری زندگی میں جد و جہد کم ہو جاتی ہے۔ ہزاروں آدمی سرمایہ دار ہزاروں آدمی زمیندار اور ہزاروں آدمی ملوں فیکٹریوں اور کارخانوں کے مالک بن جاتے ہیں اور بلا ہاتھ پاؤں ہلائے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لہٰذا ان میں کاہلی اور تن آسانی پیدا ہو جاتی ہے اور

انجام کار یہی طبقہ پوری قوم کو اپنی بداعمالیوں کی بدولت غرق اور فنا کر دیتا ہے۔

انبیائے کرام علیہم السّلام اور اولیائے عظام کی زندگیوں کا مطالعہ کیجئے آپ کے سامنے اس قول کی صداقت واضح ہو جائے گی۔

بدوی زندگی سے مراد صرف یہی نہیں کہ ساری زندگی جنگل میں گذار دی جائے بلکہ اس سے دراصل سادہ زندگی مراد ہے جو شہر میں بھی ممکن ہے بشرطیکہ انسان نے کچھ دنوں صحرا میں رہ کر خلوت کی بدولت اپنی سیرت کو پختہ کر لیا ہو۔

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے شہروں میں بھی زندگی کا بڑا حصہ بسر کیا لیکن انہوں نے اپنے اندر صحرائی زندگی کا رنگ ضرور پختہ کر لیا تھا حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

۱۔ شیر خوارگی کا زمانہ صحرا میں بسر کیا۔

۲۔ قبل بلوغ شبانی کا مقدس فریضہ انجام دیا یعنی بکریاں چرائیں اور یہ وہ پیشہ ہے جس کا تصور بھی حکمرانوں کے دماغ میں نہیں آ سکتا

۳۔ قبل نبوت ۲½ سال کامل مکہ معظمہ سے ۳ میل دور ایک پہاڑی کی چوٹی پر غار حرا میں خلوت اختیار فرمائی۔ آج مسلمان سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا مدعی اور اسلامی نظام کا داعی ۳½ دن کے لئے بھی شہر کی دلچسپیوں کو ترک کر کے کسی غار میں خلوت اختیار نہیں کر سکتا غالباً اس تصویر ہی سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔

انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کے بعد قوموں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے یہی اصول وہاں بھی کارفرما نظر آئے گا۔

بدوی قومیں جنہوں نے اپنے آپ کو جفاکشی کا عادی بنا لیا تھا۔ وہ کوہستانی علاقوں سے نکلیں اور چشم زدن میں انہوں نے متمدن اور مہذب اور مہذب اقوام کو غلام بنا لیا۔ غزنوی اور غوری کے کارناموں سے کون واقف نہیں ہے لیکن برسر حکومت ہو کر وہی قومیں عیش و عشرت میں غرق ہو گئیں اور بدویت سے محروم ہو گئیں۔ محمد شاہ رنگیلے اور واجد علی شاہ کے نام سے کون ناآشنا ہے؟

وہ مغل سردار جن کے آباؤ اجداد نے ۱۵۲۷ء میں رانا سانگا والی چتوڑ کو شکست دی تھی۔ جب ۱۷۲۷ء میں سکھوں کے مقابلے کے لئے نکلے تھے تو گھوڑوں کی پشت پر مسافت طے کرنے کے بجائے پالکیوں میں شاہانہ انداز سے سفر کرتے تھے بایں طور کہ بائیں جانب حقہ بردار اور دائیں جانب خاصدان بردار دوڑتے جاتے تھے۔ چنانچہ اس عیاشی کا نتیجہ جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے یہ نکلا کہ جس سرہند میں عالمگیرؒ کے عہدِ حکومت میں یعنی ۱۷۰۷ء تک پانچ لاکھ سے زائد مسلمان رہتے تھے اسی شہر میں بیس پچیس سال کے بعد پانچ ہزار بھی باقی نہیں رہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

پہلا شعر:۔ محراب گل کہتا ہے کہ فطرت کے مقاصد کی نگہبانی بلکہ تکمیل یا بندۂ صحرائی کر سکتا ہے یا مردِ کوہستانی۔

فطرت کے مقاصد" یہ بہت بلیغ ترکیب ہے جو اقبالؔ نے اپنے مفہوم

کے اظہار کے لئے استعمال کی ہے۔ فطرت کے مقاصد اس قدر متنوع اور گوناگوں ہیں کہ اگر ان کی تفصیل کی جائے تو ایک رسالہ مرتب ہو سکتا ہے میں چند اشارات پر اکتفا کروں گا اور پہلے لفظ فطرت کی تشریح کروں گا۔

واضح ہو کہ لفظ فطرت تین معنوں میں مستعمل ہے۔

۱۔ فطرت بمعنی خلقت یا نیچر (Nature) اس اعتبار سے لفظ فطرت کائنات کا مرادف ہے اور اقبال نے اس لفظ کو اس مصرع میں اسی مفہوم کے اظہار کے لئے استعمال کیا ہے۔

۲۔ فطرت بمعنی انسان کی جبلّت یا وہ باتیں جو تمام انسانوں کی سرشت میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہر اپنے کام جلد باز ہے۔

۳۔ فطرت بمعنی اللہ کا انداز یا طریق تخلیق۔ قرآن مجید میں فطرت کا لفظ سورۃ الروم آیت ۳۰ میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا پس تو دین پر اپنا منہ سیدھا رکھ ایک طرف ہو کر (اور وہ دین کیا ہے؟) وہی اللہ کی تراش جس پر اس نے لوگوں کو تراشا یعنی پیدا کیا۔

اقبال نے یہاں فطرت سے کائنات مراد لی ہے اس کے بعد یہ بات وضاحت طلب ہے کہ فطرت (نیچر) کے مقاصد کیا ہیں؟ اس کا جواب بھی بہت تفصیل طلب ہے صرف اشارہ کافی ہے کہ فطرت کے مقاصد اقبال کے زاویۂ نگاہ سے حسب ذیل ہیں۔

۱ - بنی آدم کی فطرت (جبلی) صلاحیتوں (Potentialities) کے بروئے کار آنے کے لئے مناسب ماحول پیدا کرنا اللہ نے انسان میں بہت سی خوبیاں بالقوہ (یعنی Potential) ودیعت فرمادی ہیں۔ اب یہ انسان کا فرض ہے کہ وہ ان خوبیوں کو قوت سے فعل میں لائے یعنی بالفعل (یعنی Actual) موجود کردے پس جو شخص اس کام کے لئے مناسب ماحول پیدا کرتا ہے وہ دراصل فطرت کے مقاصد میں سے ایک بڑے مقصد کی نگہبانی کرتا ہے بلکہ میری رائے میں بنی آدم کے حق میں احسان عظیم کرتا ہے۔

چونکہ یہ کام بدرجۂ کمال صرف حکومت کرسکتی ہے اس لئے اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ تم جب حکمراں ہوجاؤ تو حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا کیونکہ اسی حکومت کی بدولت فطرت کے تمام مقاصد کی نگہبانی اور تکمیل ہوسکتی ہے۔

۲ - بنی آدم کو نیکی کی طرف مائل کرنا اور ایسی تعلیم پھیلانا جس کی روشنی میں، فطرت کے اقتضا کو سمجھ سکیں اور وہ اقتضا یہ ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اور بفحوائے نص قرآنی یہی اقرارِ توحید الٰہی دین حق یا دینِ فطرت یا دین قیّم ہے۔

۳ - ایسا نظام قائم کرنا جس میں کوئی شخص کسی شخص پر ظلم نہ کرسکے اس جگہ میں نے لفظ ظلم کو اس کے وسیع ترین معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یعنی کائنات میں اگر کوئی شئے اپنے طبعی یا فطری محل کے علاوہ کسی

اور جگہ پائی جائے تو یہ ظلم ہے۔

ظلم صرف یہی نہیں کہ ایک طاقتور آدمی کسی کمزور عورت کے کانوں سے بالیاں نوچ کر بھاگ جائے اور وہ عورت کچھ نہ کر سکے۔

بلکہ یہ بھی ظلم ہی ہے کہ ایک متقی اور دیندار آدمی تو نانِ شبینہ کو محتاج ہو اور ایک بدکار آدمی موٹر میں سوار ہو کر نکلے یا ایک عالم آدمی تو گوشۂ گمنامی میں پڑا رہے اور جہلا برسرِ اقتدار ہوں ان دو مثالوں سے ناظرین ظلم کا مفہوم بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

واضح ہو کہ اگر اسلامی نظام دنیا کے کسی خطہ میں قائم ہو جائے تو اسی قسم کا نہیں بلکہ کسی قسم کا ظلم بھی وقوع پذیر نہیں ہو سکتا اسلامی نظام کے کارکنوں کو ہر وقت یہ آیت کریمہ عدل و انصاف کا سبق ہمیشہ پڑھاتی رہے گی۔

اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی —

بیشک اللہ حکم دیتا ہے انصاف کا اور احسان کا اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا۔

الغرض اس میں کوئی شک نہیں کہ بندۂ مومن ہی فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کر سکتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اور یہ بندۂ مومن مقاصدِ فطرت ہی کا نگہبان نہیں ہوتا۔ بلکہ فسوں گر مغربی تہذیب کا محاسب بھی ہوتا ہے وہ

مغربی تہذیب جو لادینی اور انکارِ خدا پر مبنی ہے جس کے اصول اور مبادی اسلامی نظام تصوّرات یعنی (ISLAMIC IDEOLOGY) کی ضد ہیں بندۂ مومن ہی اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو غیر قرآنی نظام کی خرابیوں سے آگاہ کرتا رہے وہ بظاہر فقیرانہ زندگی بسر کرتا ہے وہ اکثر اوقات نانِ جویں پر قناعت کرتا ہے۔ پیوند لگا ہوا کرتا پہنتا ہے کبھی کبھی فرشِ زمین پر سو جاتا ہے لیکن شاہانِ عالم اس کے نام سے لرزہ براندام رہتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ وہ عناصرِ کائنات پر حکومت کرتا ہے۔

ہستیِ او بے جہات اندر جہات
او حریم و دور طوافش کائنات

تیسرا شعر:۔ بلبل بھی ایک پرندہ ہے اور شہباز بھی ایک پرندہ ہی ہے لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے بلبل میں حسن اور نزاکت (ضعف) ہے لیکن شہباز میں قوت اور شوکت ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بلبل چمن میں رہتی ہے۔ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ موسیقی اس کا شیوہ ہے عاشقی اس کا پیشہ ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ باز کا ایک ناخن اس کو فنا کرنے کے لئے کافی ہے۔

اس کے مقابلہ میں باز کو دیکھو وہ بیابان میں رہتا ہے گلوں سے تعلق تو بڑی بات ہے وہ علائقِ دنیوی سے اس قدر بے نیاز ہے کہ آشیانہ تک نہیں بناتا کسی کا دستِ نگر نہیں اپنی روزی اپنے زورِ بازو سے حاصل کرتا ہے۔ نتیجہ واضح ہے کہ تمام پرندوں کا بادشاہ ہے جو حالت شیر کو دیکھ کر

حیوانات کی ہو جاتی ہے وہی حالت باز کو دیکھ کر تمام طائروں کی ہو جاتی ہے۔

اسی طرح جو قومیں بلبل کی طرح عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتی ہیں وہ ضعیف ہو جاتی ہیں اور دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اور جو قومیں جفاکش اور سادہ زندگی بسر کرتی ہیں یعنی بدوی زندگی شہری زندگی سے وہ طاقتور ہو جاتی ہے۔

چوتھا شعر:۔ اے شیخ! مکتب کی فضا بھی اگرچہ بہت اچھی ہے۔ منطق اور فلسفہ کے مطالعہ سے دماغ ضرور منور ہو جاتا ہے لیکن مسلمان میں شانِ فاروقی رضؓ یا شانِ سلمانی رضؓ بیابانی زندگی ہی سے پیدا ہو سکتی ہے یعنی ایسی زندگی سے جس میں مسلمان اپنی خودی کی تربیت کر سکے جس میں سادگی ہو تاکہ نفس امّارہ قابو میں آسکے اور انسان عیش و عشرت کا خوگر نہ ہو سکے شانِ فاروقی سے اشارہ ہے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی زندگی کی طرف اور شانِ سلمانی سے اشارہ ہے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی زندگی کی طرف۔ اقبالؔ کا منشا ان دو ناموں کے تذکرہ سے یہ ہے کہ مسلمان ان بزرگوں کی زندگیوں سے سبق حاصل کریں اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

اس جگہ حضرت فاروق اعظم رضؓ کی زندگی پر تبصرہ مقصود نہیں ہے صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ آج تک دنیا نے حضرت فاروقؓ کا جواب پیدا نہیں کیا خسروی اور درویشی کا ایسا کامل اجتماع آج تک کسی شخص واحد کی ذات میں نظر

نہیں آیا۔ بات یہ ہے کہ انہوں نے مرکز کائنات محور موجودات سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی نگاہ کیمیا سازسے فیض حاصل کیا تھا اس لئے فقر اور شاہی دونوں خوبیاں ان میں بدرجۂ اتم موجود ہوگئی تھیں بلکہ وہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دونوں خوبیوں کے مظہر کامل تھے۔

فقر اور شاہی یہ دو موتی ہیں جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کے سمندر سے حاصل کئے تھے۔ فقر کا موتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ بن گیا اور شاہی کا موتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں شمشیر بن گیا اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

خسروی شمشیر درویشی نگہ
ہر دو گوہر از نہ محیط لَآ اِلٰہ

اس کے بعد ان دونوں صفات یعنی ضروری اور درویشی کی تجلی صحابہ کرامؓ کے قلوب پر عکس فگن ہوئی اور ہر صحابی نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس نعمت خداداد سے اپنا اپنا دامن بھرا۔

فقر و شاہی وارداتِ مصطفٰے است
ایں تجلیہائے ذاتِ مصطفٰے است

خوشا نصیب فاروق اعظمؓ کے کہ وہ ان صفات کے مظہر اتم ہو کر تاریخ عالم میں زندہ جاوید ہو گئے نہ اب یہ تجلی دوبارہ ممکن ہے نہ فاروق اعظمؓ کا جواب پیدا ہو سکتا ہے۔

اسی لئے جب ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کانگریسی وزارتیں پہلی مرتبہ

قائم ہوئیں تو ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر مسٹر گاندھی نے کانگریسی وزیروں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ تم کو حکمرانی کے لئے کسی انسان کا نمونہ درکار ہو تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے بہتر نمونہ دنیا میں نہیں مل سکتا۔ والفضل ماشہدت بہ الاعداء ۔

پانچواں شعر:۔ اسلام کی شراب تیزی میں تلوار سے بھی بڑھ کر ہے یعنی اسلامی تعلیمات سے مومن میں شمشیر بّراں کی صفت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے اس کا حریف مدّ مقابل ایسا شخص جو مومن کا مقابلہ کر سکے کہیں صدیوں میں جا کر پیدا ہوتا ہے۔

نوٹ:۔ محراب گل کی زبان سے اقبالؔ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ میری ناقص رائے میں ان کی پوری کتاب کا خلاصہ ہے اسی لئے میں نے بھی ان کی تشریح میں قدرے وضاحت سے کام لیا ہے۔

تمت بالخیر

ضربِ کلیم

کے

بنیادی تصوّرات پر اک طائرانہ نگاہ

وہ بنیادی تصورات جن پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں مختلف طریقوں سے اظہارِ خیالات کیا ہے میری رائے میں حسب ذیل ہے۔
توحیدِ الٰہی[1]۔ خودی[2]۔ عشق[3]۔ فقر[4]۔ تسلیم و رضا[5]۔ جہاد[6]۔ واضح ہو کہ یہ جملہ تصورات براہ راست قرآن حکیم سے ماخوذ و مقتبس ہے۔

۱۔ تصورِ توحید سے تو کلامِ پاک از اوّل تا آخر معمور ہے صرف ایک آیت درج کرتا ہوں۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝ (سورہ حشر)

اللہ وہی ذات پاک ہے جس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے وہ جانتا ہے ہر چیز کو جو پوشیدہ ہے اور ظاہر ہے اور بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

۲۔ خودی کا تصوّر (جیسا کہ اقبال نے خود مجھے بتایا تھا) اس آیت سے ماخوذ ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ۔ اے لوگو! جو

ایمان لائے ہو اپنی خودی کی حفاظت کرو۔

واضح ہو کہ حضرت مجدّد دہلوی شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

"محافظت کنید خویشتن راہ" اور اس فارسی عبارت کا صحیح لفظی ترجمہ یہی ہوگا۔ کہ اپنی خودی کی حفاظت کرو۔ اور شیخ الہندؒ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کی" اس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ تم اپنی خودی کی حفاظت کرو۔

۳۔ عشق کا لفظ اگرچہ کلام پاک میں مذکور نہیں لیکن اقبال کی مراد اس لفظ سے محبت ہے اور حُبّ کا لفظ اس آیت میں موجود ہے یعنی عشق و محبت کا تصور اس آیت سے مقتبس ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔ اور جو لوگ مومن ہیں۔ ان کی شناخت یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت میں سب سے زیادہ شدید ہوتے ہیں۔

نوٹ:۔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا حبّ رسولؐ جو حب الٰہی سے مربوط ہے اور جو اقبال کی مذہبی فکر کا محور ہے جو ان کا سرمایۂ حیات ہے اس حدیث سے ماخوذ ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَ وَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کی نظر میں

اس کے والدین اور اولاد اور سب انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جائیں

۴۔ فقر مرکب ہے ذکر اور فکر سے اور یہ دونوں لفظ اس آیت میں موجود ہے۔ اقبالؔ نے دونوں کے مجموعے کو فقر سے تعبیر کیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا۔ (اٰل عمران)

اللہ کی نظر میں عقلمند لوگ وہ ہیں جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حالت میں) اور فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور غور و فکر کے بعد پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے رب تو نے یہ کارخانۂ عالم عبث پیدا نہیں کیا ہے۔

۵۔ تسلیم و رضا کا تصوّر۔ اس آیت سے مستنبط ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (سورۂ انعام)

آپ فرما دیجئے کہ میری نماز اور مراسم مذہبی (قربانی) اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کے لئے ہے جو پروردگار ہے ساری کائنات کا۔

۶۔ جہاد کا تصور حسب ذیل آیت سے ماخوذ ہے اور توحید کی طرح جہاد کی تعلیم بھی قرآن پاک میں بکثرت مذکور ہے اور میری رائے میں تو جہاد فی سبیل اللہ غایت دنیوی ہے صرف آیت درج کرتا ہوں۔

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ

وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا
وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنَ تَرْضَوْنَهَا
اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ
فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ۔

آپ فرما دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری (تجارت) جس کے مندا ہو جانے سے تم ڈرتے ہو اور تمہاری حویلیاں جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم نازل فرمائے۔

میں نے مذکورہ بالا تصوراتِ ستہ کو قرآنِ حکیم کے نصوص واضحہ سے اس لئے ثابت کیا ہے کہ ناظرین پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ علامہ اقبالؒ کی ساری تعلیمات بلا واسطہ قرآن مجید سے ماخوذ ہیں۔

اقبالؔ کے اکثر ناقدین ان کے فلسفۂ افکار و تصورات کے مآخذ تلاش کرنے میں تکلیف مالا یطاق برداشت کرتے ہیں اور عجیب و غریب نکات بیان کرتے ہیں امید ہے کہ ان سطور سے ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اقبال کے فلسفہ کا مآخذ کیا ہے۔

اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اقبالؔ کے ان بنیادی تصورات میں ایک کیف آفریں لیکن منطقی ربط پایا جاتا ہے۔

۱۔ سب سے پہلے توحید الٰہی کے تصورات کو لیجئے یہ تصور اقبال کے فلسفہ

کا سنگِ بنیاد ہے یعنی خودی کا فلسفہ اسی عقیدۂ توحید پر مبنی ہے۔ اقبال کا مذہب یہ ہے کہ اگر اللہ موجود نہ ہوتا تو خودی بھی موجود نہ ہوتی کیونکہ خودی کا وجود مستقل یا خانہ زاد نہیں ہے۔ منطقی اصطلاح میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ واجب الوجود ہے خودی ممکن الوجود ہے اور ممکن کا وجود واجب کے وجود کے بغیر مستحق نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں توحید الٰہی کے عقیدہ کو بڑی شد و مد کے ساتھ پیش کیا ہے خصوصاً مثنوی اسرار خودی رموز بیخودی اور پس چہ باید کرد۔ میں تو انہوں نے اس عقیدہ کی وضاحت میں اپنا سارا زور قلم صرف کر دیا ہے اور وہ ایسا کیوں نہ کرتے؟ وہ جس کتاب کے خوشہ چین ہیں! کیا اس سے بڑھ کر دنیا میں کسی کتاب نے توحید الٰہی کے مضمون کو بیان کیا ہے؟ راجہ رام موہن رائے بانی برہمو سماج اپنی دلکش تالیف "رسالۃ التوحید" میں لکھتے ہیں کہ "دنیا میں قرآن مجید سے بڑھ کر کسی کتاب نے توحید کی حقیقت کو واضح نہیں کیا اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ مسلمانوں نے اپنا کلمہ ہی "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" مقرر کر دیا ہے۔

۲۔ خدا ہے اور وہ خالق ہے۔ یہ ساری کائنات اس کی مخلوق ہے اس لئے خودی موجود بھی ہے اور مخلوق بھی ہے۔

اللہ کا تصور اقبال کے فلسفیانہ فکر کا نقطۂ آغاز ہے اور خودی کا تصور اس کی لازمی فرع ہے خودی کا وجود خالق خودی کے وجود پر شاہد ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی۔

مری ہستی ہے خود شاہد وجودِ ذاتِ باری پر
دلیل ایسی ہے یہ جو عمر بھر رد ہو نہیں سکتی

الغرض خدا کو خالق تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہم خودی کے وجود کو بھی تسلیم کریں خدا موجود ہے اس لئے خودی بھی موجود ہے اگرچہ اس کا وجود خدا کے وجود پر موقوف ہے۔

خدا نے خودی کو پیدا کیا اور یہ خودی اگر اس کی صحیح تربیت کی جائے تو انسان کو خدا تک پہنچا دیتی ہے اسی لئے اقبال کہتے ہیں۔

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب آہ
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

اگر خدا ہے تو خودی بھی ضرور ہو گی کیونکہ اگر خدا تخلیق پہ قادر نہیں تو پھر وہ خدا کیسا؟ پھر اس میں اور جناب مارکس کے خدا (مادہ) میں کیا فرق ہے؟ پس عقل کا تقاضا ہے کہ وہ خالق ہو اور اگر وہ خالق ہے تو اس کی صفت تخلیق کا شاہکار کہاں ہے؟

اس سوال کا جواب ناظرین کے ذوق سلیم پہ چھوڑتا ہوں اگر خودی ہے تو خدا بھی ضرور ہے کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ خودی قائم بالذات نہیں ہے محتاج الی الغیر ہے اگر وہ محتاج نہ ہوتی تو ناقص نہ ہوتی۔ ضعیف نہ ہوتی ضعف اور نقصان دلیل ہے احتیاج کی اور احتیاج دلیل ہے بندگی کی

بقول اکبر الہ آبادی۔

درد تو موجود ہے دل میں دوا ہو یا نہ ہو
بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

۳ ۔ خدا اور خودی میں ربط واضح کر دینے کے بعد اب تیسرے تصور پر غور کیجئے۔ خودی اور عشق میں یہ ربط ہے اگرچہ خودی موجود ہے لیکن ناقص اور ضعیف ہے تو اب عقل کا تقاضہ ہے کہ خدا اس کی اصلاح کا سامان بھی مہیا کرے۔ درد دیا ہے تو دوا بھی دے۔ اسی دوا یا اصلاحی پروگرام کا نام عشق ہے بقول مرشد رومیؒ۔

شاد باش اے عشق خود سودائے ما
دے طبیب جملہ علتہائے ما

قرآن حکیم نے صاف لفظوں میں اعلان فرما دیا ہے کہ اتباع رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کیونکہ نفسیات (Psychology) ہیں یہ اصول مسلّم ہے کہ جب تک آپ کو کسی کے ساتھ رابطۂ قلبی (Heart Tech Nabt) نہ ہو آپ اس کی پیروی یا اتباع نہیں کر سکتے اور یہ وابستگی جس قدر شدید ہوگی اتباع اسی قدر کامل ہوگی۔

ع عاشقی ؟ محکم شو از اتباع یار

الغرض خودی اور عشق میں یہ منطقی ربط ہے کہ خود عشق اور صرف عشق ہی سے مستحکم ہو سکتی ہے اور مومن اسے اسی لئے مستحکم کرتا ہے کہ فرمان الٰہی علیکم انفسکم پر عمل پیرا ہو سکے جو شخص اپنی خودی کو مستحکم نہیں کرتا وہ اس فرمان الٰہی کی تعمیل نہیں کر سکتا اور جو اس فرمان کی تعمیل نہیں کرتا وہ آقا کی نافرمانی کے علاوہ اپنے مقصد حیات کی تکمیل نہیں کر سکتا۔

۴ ۔ فقر اس پروگرام کا نام ہے جو حضرتِ عشق خودی کی تکمیل کے لئے

مرتب فرماتے ہیں۔ آسان لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ شریعت تو وہ پروگرام ہے جس پر عمل کرنے سے خودی کمال کو پہنچی ہے لیکن شریعت پر عمل تو وہی کرتا ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہوتی ہے اور جس قدر شدید محبت ہوگی اسی قدر شدید عمل ہوگا۔ یہ فقر اماموں کی تقلید میں نہیں حاصل ہو سکتا کیونکہ اماموں کی تقلید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت ہوگی ہی نہیں بلکہ اماموں سے ہوگی تو وہ درجہ حاصل ہی نہیں ہوگا۔

الغرض :۔ فقر کی تعلیم۔ گوائی۔ کوچہ گردی۔ صحرانوردی۔ عزلت گزینی۔ گوشہ گیری۔ احتیاج الی الناس۔ تارک دنیا۔ یا ترک زن کا نام نہیں بلکہ خودی کی تلوار کو سان پر چڑھانے کا نام۔ بالفاظ دگر فقر اس طریق زندگی کا نام ہے جس پر چلنے سے خودی کی تلوار قیامت بن جاتی ہے یعنی اس کی دھار میں قیامت کی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ موج نفس کیا ہے؟ تلوار ہے! خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے۔

جنگ خیبر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار میں یہ حدّت اور شدّت پیدا ہو گئی تھی یہ سب اسی شان فقر کا کرشمہ تھا۔ میں اپنی قوم کے فیشن ایبل نوجوانوں کو کیسے سمجھاؤں کہ کاٹنے کی قوت بازو میں ہوتی ہے نہ کہ تلوار میں اور بازو میں قوت خودی سے پیدا ہوتی ہے۔ نہ کہ گوشت یا چربی کی افراط اور زیادتی سے ہوتی ہے۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پہ ہے مدارِ قوّتِ حیدری

۵ ۔ فقر اور شیوۂ تسلیم و رضا میں یہ ربط ہے کہ جب مومن میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے تو یہ حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے کہ بندۂ مومن کی آئینی حیثیت اس دنیا میں یہ ہے کہ وہ اپنے خالق سے ایک معاہدہ کرتا ہے جسے اصطلاح میں کنٹریکٹ (Contract) کہتے ہیں یعنی اللہ بندہ سے ارشاد فرماتا ہے کہ "تم اگر اپنی عزیز ترین متاع (جان و مال) مجھے دید و تو میں خریدار کی دولت تمہیں دیدوں گا۔

مومن اس معاہدہ پر راضی ہو جاتا ہے اگرچہ شیوۂ تسلیم و رضا کا مفہوم اس بات سے واضح ہو سکتا ہے۔ لیکن مزید وضاحت کرتا ہوں یعنی جب یہ معاہدہ طے پا جاتا ہے تو مومن اس وقت سے اپنی جان اور اپنے مال کو اپنی ملک نہیں سمجھتا بلکہ ان دونوں کو اللہ کی امانت سمجھتا ہے اور ہر وقت ان دونوں کو اس راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ بالفاظ دگر جان اور مال کے متعلق اپنی کوئی رائے یا مرضی باقی نہیں رہتی کیونکہ اپنی مرضی تو اپنے ملک میں نافذ ہو سکتی ہے اور جب اپنی جان اپنی نہیں بلکہ کسی دوسرے کی ہے تو پھر اس میں اپنی مرضی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ ہر معاملہ میں ایک ایماندار معاہدہ کا شیوہ یہی ہو گا کہ میری نہیں جیسی اس کی مرضی! اسی کو تصوف (شریعت) کی اصطلاح میں شیوۂ تسلیم و رضا کہتے ہیں اور جناب حسین رضی اللہ عنہ نے میدانِ کربلا میں اسی کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا جو ہماری بدبختی سے مرثیہ اور سوز خوانی کے غبار میں مومنوں کی نگاہوں سے بالکل پوشیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔

نوٹ: جس معاہدہ کا میں نے ذکر کیا ہے وہ قرآن مجید کی اس آیت میں مذکور ہے جو آج کل متروک التلاوت ہو گئی ہے یعنی مسلمانوں نے اس تلاوت کو متفقہ طور پر (Unanimously) ترک کر دی ہے اگر کسی آیت کا قرآن مجید سے خارج کرنا ممکن نہیں تو اس کی تلاوت ترک کر دینا تو ممکن ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ۔

بیشک اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔

شاید ناظرین کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ قرآن مجید تو جان کے معاوضہ میں جنت پیش کرتا ہے۔ میں نے یہ دیدار کا مسئلہ کہاں سے نکال لیا؟ یا جنت کی جگہ دیدار کا لفظ کیوں استعمال کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ

اصلی چیز دیدار ہی تو ہے جنت اور اس کی تمام دل کشی اور ساری نعمتیں اسی نعمتِ کبریٰ اور موہبت عظمیٰ کے لئے بمنزل تمہید ہیں جیسے حجلۂ عروسی میں خوشبو بھی ہوتی ہے۔ ہار پھول بھی ہوتے ہیں۔ عود اور عنبر کی بتیاں بھی ہوتی ہیں۔ عطر کی لپٹیں بھی ہوتی ہیں۔ چھپر کھٹ بھی ہوتا ہے۔ قالین بھی ہوتے ہیں غرضکہ عیش و عشرت کے جملہ لوازم مہیّا ہوتے ہیں لیکن اگر چھپر کھٹ خالی ہو تو پھر دولھا کی نظروں میں اس سامان کی قدر و قیمت ہو سکتی۔ اسی طرح اگر

جنت میں دیدار نہ ہو تو جنت کی حیثیت اس حجلۂ عروسی سے زیادہ نہیں ہو سکتی جس میں عروس نہ ہو اسی لئے میں نے دیدار یعنی جنت روح کا ذکر کر دیا۔ دیدار کے بغیر جنت جسد بے روح سے زیادہ نہیں۔

اس پر شاید ناظرین یہ سوال کریں کہ جب یہ بات ہے تو اللہ نے اس آیت میں جنت کا لفظ کیوں استعمال کیا؟ دیدار کا لفظ کیوں نہیں استعمال کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہاں لفظ دیدار آجاتا تو قرآن مجید انسانی کلام ہو جاتا اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن حکیم ساری دنیا کے لئے ہے نہ کہ ایک مخصوص طبقہ کے لئے جو ذہنی اعتبار سے بلند ہو اگر یہاں لفظ دیدار ہوتا تو عرب ہی نہیں ساری دنیا کے وہ لوگ جو دولت علم اور قوت غور و فکر سے عاری ہیں یا جو مجردات (Abstract) کا تصور نہیں کر سکتے وہ معاہدہ کے لئے کیسے تیار ہوتے۔؟

معاہدہ کی تکمیل کے لئے اشد ضروری ہے کہ جس سے آپ معاہدہ کریں وہ معاہدہ کی شرائط کو سمجھ سکے اب آپ خود فیصلہ کریں کہ عرب یا ہندوستان کا ایک جاہل و نادان بدوی جنت کو بآسانی سمجھ سکتا ہے یا دیدار کو؟

۶۔ شیوۂ تسلیم و رضا اور جہاد میں یہ ربط ہے کہ جہاد موقوف ہے اس کو جہاد فی سبیل اللہ سے باز نہیں رکھ سکتی بلکہ جہاد فی سبیل اللہ ہی مشغلۂ حیات بن جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے کیسے بلیغ مگر دلکش انداز میں مومن کی "نارمل لائف" کا نقشہ دو لفظوں میں کھینچ دیا ہے۔ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ۔ یعنی مومن حضرات معاہدہ کے

بعد بے دریغ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اب حرف "ف" پر غور کیجیے اللہ فرماتا ہے جب یہ مومن حضرات جہاد کو شیوۂ زندگی اور مشغلۂ حیات بنا لیتے ہیں تو دو ہی صورتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ تیسری صورت تو ممکن ہی نہیں ہے یعنی مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔

واضح ہو کہ اس جملہ کی ترکیب یہ بتا رہی ہے کہ مقصود بالذات خود مرنا نہیں ہے بلکہ کفار کو مارنا ہے۔ مومن جب میدان جنگ میں جاتا ہے تو اس کی غرض قتل ہونا نہیں ہوتی بلکہ قتل کرنا ہے تاکہ دین اسلام کو غلبہ حاصل ہو یعنی میدان جنگ میں شہادت مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ قتل کفار مقصود بالذات ہے شہادت جس کا رتبہ اتنا بڑا ہے کہ انبیاء کو بھی اس کی آرزو رہی۔ یہ تو وہ درجہ ہے جو اس وقت جائز ہے جب مومن قتل کرنے کے قابل نہ رہے ورنہ وہ تو تب تک زندہ رہتا ہے۔ قتل کرتا رہتا ہے۔

ان تصورات ستّہ میں جو منطقی ربط پایا جاتا ہے اس کو اس طرح بھی واضح کیا جا سکتا ہے کہ:۔

۱۔ جہاد موقوف ہے۔ شیوۂ تسلیم و رضا پر۔
۲۔ شیوۂ تسلیم و رضا موقوف ہے۔ شان فقر پر۔
۳۔ شان فقر کا وجود منحصر ہے۔ عشق پر۔
۴۔ عشق واحد ذریعہ ہے خودی کی ترکیب کا۔
۵۔ خودی کا وجود خدا کے وجود پر موقوف ہے۔

آخر میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میری اس ناچیز کوشش کو قبول

فرمائے اور مجھے اقبال کی تمام کتابوں کی شرح لکھنے کی لیاقت عطا فرمائے تاکہ میں اپنی قوم کی کچھ خدمت کر سکوں۔

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ
وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ (ط)

اے میرے رب! کشادہ کر دے میرا سینہ (کھول دے مجھ پر حقائق و معارف اور آسان کر دے میرا کام (یعنی مشغلۂ تصنیف و تالیف) اور کھول دے گرہ میرے زبان کی (مجھے اظہار ما فی الضمیر پر قدرت عطا کر) تاکہ لوگ میری بات کو بآسانی سمجھ سکیں۔

نیز جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی تھی کہ میرے بھائی کو میرا رفیق اور شریک کار بنا دے اسی طرح میں بھی بڑے خلوص کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ اللہ میرے بھائی ہارون علیہ السلام کو میرا وزیر اور شریک کار بنا دے۔ آمین یارب العالمین۔

وَصَلَّی اللّٰهُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

استدراک

ذیل میں دو مصرعوں کی مزید تشریح ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔

ع نہ ہے زماں نہ مکاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

اس مصرع میں علامہ نے ایک عظیم الشان صداقت کا اعلان کیا ہے زمان و مکان کے تصورات انسانی عقل کی پیداوار ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ آثار ہیں اور یہ آثار نتائج ہیں افعال کے اور یہ افعال صادر ہوئے ہیں اسمائے صفات الٰہیہ سے اور صفات کا قیام منحصر اور موقوف ہے ذات پر۔ اسی حقیقت کو مرشدی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ نے یوں بیان فرمایا ہے وہ شعر یہ ہے۔

دو عالم میں نہیں موجود مشہود
بجز ذات و صفات افعال و آثار

آثار۔ افعال اور صفات یہ تینوں قائم بالذات نہیں ہیں بلکہ ذات کے سہارے قائم ہیں یعنی قائم بالغیر ہیں۔ بالفاظ دگر صرف ذاتِ باری قیوم ہے اس کے علاوہ کسی شئے کا مستقل وجود نہیں ہے پس زمان و مکان

جو محض آثار ہیں اور اپنے وجود میں افعال کے محتاج ہیں۔ دراصل کوئی مستقل وجود نہیں رکھتے اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔

اب اس بات کی مختصر تشریح اور کروں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ سے زمان و مکان کس طرح فنا ہو جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ زمان و مکان دونوں کے لئے ضروری ہے کہ ان سے پہلے کسی قائم بالذات شے کا وجود تسلیم کیا جائے تاکہ ان دونوں کا تصور ہو سکے زمان قائم بالذات نہیں ہو سکتا کیونکہ زمان تو مقدار حرکت کا نام ہے اور حرکت کے لئے محرک کا وجود ضروری ہے۔

خدا محرک ہے۔

انسان متحرک ہے

زمان مقدار حرکت ہے۔

الغرض۔ زمان تو انسان کی حرکت پر موقوف ہے اور حرکت محرکِ اول پر موقوف ہے پس زمان کا کوئی ذاتی یا مستقل وجود نہیں ہے بالفاظ دگر زمان انسان کے دل پر منحصر ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ سے تمام ماسوی اللہ کی قیّومیت (مستقل وجود) کی نفی ہو جاتی ہے۔ پس جب اس کے سوا کسی کا مستقل وجود ہی ثابت نہیں کوئی دراصل موجود ہی نہیں تو زمان و مکان کا وجود خارج از بحث ہے اسی لئے اقبالؔ نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا۔

ع نہ ہے زماں نہ مکاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

تو ہے تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے

یہ مصرع دراصل ابطال مادہ کے مشہور نظریہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ احساس کرنے والے ذہن یا نفس مدرک سے باہر محسوسات کا کہیں وجود نہیں ہے۔ موجودہ دور میں مشہور فلسفی بارکلے (BERKELEY) اس نظریہ کا سب سے بڑا شارح اور وکیل گذرا ہے اقبال بھی نظریہ تصوریت (IDEALISM) کے حامی ہیں چنانچہ اپنی محبوب تصنیف زبور عجم میں انہوں نے اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔

ایں جہاں چیست ؟ صنم خانۂ پندار من است
جلوۂ او گرد دیدۂ بیدار من است
ہستی و نیستی از دید و نادیدن من
چہ زمان و چہ مکان شوخیٔ انکار من است

یعنی اس کائنات کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ ہستی کیا ہے ؟ میرا دیکھنا۔ نیستی کیا ہے ؟ میرا نہ دیکھنا۔ کائنات کا وجود میرے مشاہدے پر موقوف ہے۔ اسی طرح زمان اور مکان کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ تصورات بھی میرے فکر کی پیداوار ہیں۔ زماں میری شوخیٔ فکر کا نام ہے اور مکان یہ میرے انداز بیان کا نام ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ کائنات دو چیزوں کا نام ہے مافی الانفس اور ما فی الآفاق۔ ان میں مافی الانفس یعنی نفس مدرک تو موجود ہے مافی الآفاق

یعنی عالم محسوس احساس کرنے والے سے باہر کہیں موجود نہیں ہے صرف اَنَاحَقّ ہے کائنات کا کوئی مستقل وجود نہیں اور انا اس لئے حق ہے کہ وہ انائے مطلق کا مظہر ہے۔ اس کا وجود بھی ظلّی۔ لیکن ایسا ظلّی ہے جو مظہر صفات ہونے کی وجہ سے مستقل وجود رکھتا ہے۔

ہندو فلسفہ میں اس نظریہ کو "مایا" کے نظریہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور شنکر اچاریہ اس کا سب سے بڑا شارح ہے۔

"مایا" کے معنی دھوکہ یا فریب نظر کئے جاتے ہیں۔ لیکن دراصل کو نہیں کہتے۔ شنکر اچاریہ نے بھگوت گیتا کی شرح میں مایا کو مول پرکرتی کا مترادف قرار دیا ہے یعنی برہما کی ایک مخفی طاقت جس کی بدولت انسان اپنی اصلیت اور حقیقت سے غافل ہو کر اپنے آپ کو مستقل بالذات اور موجود سمجھنے لگتا ہے۔ ہندو فلسفہ کی رو سے یہ ساری کائنات "مایا" ہی کا کرشمہ ہے یعنی اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ محض فریب نظر ہے۔

"ختم شد"

(۵)

